جون 2012

شعاع

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 6000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2012

جلد 26 شمارہ 10

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی، ای، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com,

رضیہ جمیل

پہلی شعاع

شعاع کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

بدترین حالات کے باوجود بہتری کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے بشرطیکہ حالات بدلنے کی خواہش اور امید زندہ رہے۔ شاید اسی لیے زوال پذیر معاشروں میں سب سے پہلے حالات کی بدترین تصویر دکھا کر مایوسی اور خود ساختہ مظلومیت اور محرومی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے ہاں یہی منظرنامہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ نہایت منظم طریقے سے افراتفری پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ محبتوں اور روشنیوں کا شہر کراچی جو پاکستان کا معاشی حب ہے، لہولہان ہے۔ پچھلے دو عشروں سے جاری قتل و غارت گری کا سلسلہ اسی کی ایک کڑی ہے۔ پچھلے دنوں شہر کے ایک حصہ کی بڑی آبادی کو محصور کر کے مہم جوئی کا شوق پورا کیا گیا جس کا مقصد اور نتیجہ دونوں ہی نامعلوم ہیں۔ آدھا حصہ گنوا لینے کے بعد جو باقی بچا ہے، اس کو سنبھالنے کے بجائے مزید تقسیم کیا جا رہا ہے۔ تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟

اس سوال کا جواب آپ کو سوچنا ہے۔

سالگرہ نمبر،

شعاع کا سفر کامیابی سے جاری ہے۔

آپ کی پُرخلوص رفاقتوں میں ایک اور سال کا اضافہ ہونے جا رہا ہے۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں جگہ پاسکیں۔ سالگرہ نمبر میں نئی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوں گی۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ”جنت کے پتے“،
- مہوش افتخار کا مکمل ناول ”مجھے ملتا ہے خواب کوئی“،
- رباب سحر کا مکمل ناول ”زندگی، موسم اور خوشبو“،
- آسیہ رزاقی اور فائزہ افتخار کے ناولٹ،
- شاہدہ ملک، عظمیٰ محمود، ایلیا یقین اور فوزیہ احسان رانا کے افسانے،
- عمران اسلم اور ثنا عمران کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دستک“،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع ترتیب دیتے ہوئے ہمارے پیش نظر سب سے اہم آپ کی رائے ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی رائے سے ضرور مطلع کیجیے گا کہ ہم اپنی محنتوں میں کس حد تک کامیاب ٹھہرے۔ خط ضرور لکھیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیاں جو ہیں، مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اُس کی یاد آتی ہے
ستارے، چاند، سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خوابِ ہستی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرارِ جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے، وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوفِ باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رُتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پُرانی داستانوں میں

منیر نیازی

نعت رسول مقبول

مرا جذبِ دل میرے کام آگیا ہے
مدینے سے آخر پیام آگیا ہے

جہاں ذکرِ خیرُالانام آگیا ہے
لبوں پہ درود و سلام آگیا ہے

چمن میں جو وہ خوش خرام آگیا ہے
بہاروں کا گویا پیام آگیا ہے

کہا جس کی آمد پہ انسانیت نے
کہ خیرالبشر لاکلام آگیا ہے

ستاروں کو تابندگی بخشنے کو
اُفق پہ وہ ماہِ تمام آگیا ہے

ازل سے زمانہ تھا مشتاق جس کا
وہ محبوب بالائے بام آگیا ہے

خدا کے کرم کی کرامت تو دیکھو
کرم بن کے راس الکلام آگیا ہے

کوئی کاش آکر عنایت سے کہہ دے
غلاموں میں تیرا بھی نام آگیا ہے

پروفیسر عنایت علی خان

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

توبہ

عبداللہ بن کعب بن مالکؓ سے روایت ہے' یہ (عبداللہ) حضرت کعب کے بیٹوں میں سے ان کا رہبر تھے۔جب وہ نابینا ہو گئے تھے۔یہ کہتے ہیں میں نے (اپنے باپ) کعب بن مالکؓ کو وہ واقعہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔جب وہ غزوہ تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ گئے تھے۔

حضرت کعبؓ نے فرمایا۔

"جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی غزوہ (جہاد) کیا' میں آپؐ سے پیچھے نہیں رہا' سوائے غزوہ تبوک کے' البتہ غزوہ بدر میں بھی میں پیچھے رہا تھا' لیکن غزوہ بدر میں پیچھے رہنے والوں پر ناراضی کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔اس غزوے میں تو دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان قافلہ قریش کے تعاقب میں نکلے تھے۔(یعنی ابتدا جہاد کی نیت نہیں تھی۔) یہاں تک کہ اللہ نے ان کو اور ان کے دشمنوں کو بغیر وعدے (بغیر ارادہ و اعلان قتال) کے ایک دوسرے کے مقابل جمع (صف آرا) کر دیا۔اور عقبہ کی رات (منی میں) میں حاضر تھا۔جب ہم نے اسلام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد وفا باندھا تھا۔اگرچہ واقعہ بدر کا چرچا لوگوں میں عقبہ کی رات سے زیادہ ہے' لیکن مجھے بدر کی حاضری سے اس رات کی حاضری زیادہ محبوب ہے۔(کیونکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔)

اور میرے غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہنے کا واقعہ اس طرح ہے کہ میں اتنا زیادہ قوی اور اتنا زیادہ خوش حال کبھی نہیں تھا جتنا اس وقت تھا' جب میں غزوہ تبوک میں آپ سے پیچھے رہا۔

اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی اکٹھی دو سواریاں نہیں ہوئی تھیں' جبکہ اس موقع پر مجھے بیک وقت دو سواریاں میسر تھیں۔(مطلب یہ ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے میرے پیچھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو آپؐ اس کے غیر کے ساتھ توریہ فرماتے۔(یعنی سفر کی اصل سمت چھوڑ کر عام طور پر دوسری سمت کا ذکر فرماتے' تاکہ دشمن سے اصل حقیقت مخفی رہے۔) حتیٰ کہ یہ غزوہ تبوک ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت گرمی کے موسم میں یہ غزوہ فرمایا۔سفر دور کا اور جنگل بیابانوں کا تھا اور مدمقابل دشمن بھی بہت بڑی تعداد میں تھا' اس لیے آپؐ نے (توریے کی بجائے) مسلمانوں کے معاملے (یعنی اس محاذ جنگ) کو مسلمانوں کے سامنے کھول کر بیان فرما دیا' تاکہ وہ اس کے مطابق بھرپور تیاری کر لیں۔چنانچہ آپؐ نے انہیں وہ سمت بھی بتلا دی' جس کا آپؐ ارادہ فرما رہے تھے۔

مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی تعداد میں تھے اور کوئی یادداشت کی کتاب ایسی نہیں تھی جس میں ان کے نام درج ہوتے۔اس سے ان کی مراد رجسٹر تھا۔حضرت کعبؓ فرماتے ہیں۔اس لیے اگر کوئی شخص جنگ سے غیر حاضر رہتا تو وہ یہی گمان کرتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی رہے گا اور وحی الٰہی کے بغیر اس کی غیر حاضری آپ کے علم میں نہیں آئے گی۔اور یہ غزوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا جب پھل پک چکے تھے اور ان کا سایہ عمدہ اور خوشگوار تھا اور میں ان ہی (پھلوں اور سایوں) کی طرف میلان رکھتا تھا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے تیاری کی۔اور میرا حال یہ تھا کہ صبح کو آتا' تاکہ آپؐ کے ساتھ تیاری کروں' لیکن بغیر کوئی فیصلہ کیے لوٹ جاتا اور اپنے دل میں کہتا کہ میں جب چاہوں گا۔(چلا جاؤں گا' کیونکہ.....) میں پوری طرح اس پر قادر (وسائل سے بہرہ ور) ہوں۔

میری یہی (گومگو کی) حالت رہی اور لوگ جہاد کی تیاری میں لگے رہے' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ مسلمان ایک صبح کو جہاد پر روانہ ہو گئے اور میں اپنی تیاری کے سلسلے میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر پایا۔

میری کیفیت یہی رہی' حتیٰ کہ مجاہدین تیزی سے آگے چلے گئے اور جہاد کا معاملہ بھی آگے بڑھ گیا۔میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی سفر پر روانہ ہو جاؤں اور ان سے جا ملوں' اے کاش! کہ میں ایسا کر لیتا۔لیکن یہ میرے مقدر میں نہ ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے چلے جانے کے بعد جب میں لوگوں میں نکلتا تو یہ بات میرے لیے حزن و ملال کا باعث بنتی کہ میرے سامنے اب کوئی نمونہ ہے تو صرف ایسے شخص کا جو نفاق سے مطعون ہے۔(یا نفاق کی وجہ سے لوگوں میں حقیر ہے۔) یا ایسے کمزور لوگوں کا جنہیں اللہ نے معذور قرار دیا۔

(سارے راستے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے مجھے یاد نہیں فرمایا' یہاں تک کہ آپؐ تبوک پہنچ گئے۔تبوک میں جب آپؐ لوگوں میں تشریف فرما تھے تو آپؐ نے پوچھا۔

"کعب بن مالک نے کیا کیا؟"

"بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا۔"اسے اس کی دو چادروں اور اپنے دونوں پہلوؤں کو دیکھنے نے روک لیا ہے۔" (یعنی دولت اور اس کے عجب اور کبر نے اسے نہیں آنے دیا۔)

معاذ بن جبلؓ نے اس سے کہا۔"تو نے ٹھیک نہیں کہا۔اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے اس (کعب) کے اندر خیر کے علاوہ کچھ نہیں جانا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آپؐ نے ایک سفید پوش آدمی کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابو خیثمہ ہوگا۔"

اور واقعی وہ ابو خیثمہ انصاری تھے۔اور یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے (ایک مرتبہ) ایک صاع (تقریباً" ڈھائی کلو) کھجور کا صدقہ کیا تو منافقین نے انہیں (اس کے تھوڑا ہونے کا) طعنہ دیا تھا۔

حضرت کعبؓ نے کہا۔جب مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپسی کا سفر شروع فرما دیا ہے تو مجھ پر غم کی کیفیت چھا گئی اور جھوٹے بہانے گھڑنے کا سوچنے لگا اور (دل میں) کہتا کہ کل (جب آپؐ واپس تشریف لائیں گے تو) آپؐ کی ناراضی سے میں کیسے بچوں گا۔اور اس معاملے میں' میں اپنے گھر کے ہر سمجھ دار آدمی سے بھی مدد طلب کرتا رہا۔

جب مجھے بتلایا گیا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنے ہی والے ہیں تو (جھوٹے بہانے گھڑنے کا) باطل خیال میرے دل سے دور ہو گیا اور میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ بلاشبہ میں جھوٹ سے کبھی بھی بچاؤ حاصل نہیں کر سکوں گا' چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔اور آپؐ کا معمول تھا کہ جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے' پھر لوگوں کے سامنے بیٹھ جاتے۔

(اس سفر سے واپسی پر بھی) جب آپؐ نے ایسا ہی کیا تو منافقین نے آکر عذر پیش کرنے اور حلف اٹھانے شروع کر دیے۔اور یہ تقریباً" 80 آدمی

تھے۔ آپؐ نے ان کے ظاہری عذر کو قبول فرمالیا' ان سے بیعت لی' ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کی باطنی کیفیت کو اللہ کے سپرد کردیا۔

میں بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ جب میں نے سلام کیا تو آپؐ نے ناراض آدمی والا تبسم فرمایا' پھر فرمایا۔

"آگے آجاؤ!"

میں آگے آکر آپؐ کے ساتھ سامنے بیٹھ گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہیں کس چیز نے (جہاد سے) پیچھے رکھا؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی؟"

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں آپؐ کے علاوہ کسی اور کے پاس بیٹھا ہوتا تو یقیناً" میں کوئی (جھوٹ موٹ) عذر کرکے اس کی ناراضی سے بچ جاتا' مجھے بحث و تکرار کا بڑا ملکہ حاصل ہے۔ لیکن اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ اگر آج میں آپؐ کے سامنے جھوٹ بول کر سرخ رو ہوجاؤں اور آپؐ مجھ سے راضی ہوجائیں تو عنقریب اللہ تعالیٰ (وحی کے ذریعے سے مطلع فرماکر) آپؐ کو مجھ سے ناراض کردے گا۔ اور اگر میں آپؐ سے سچی بات عرض کردوں تو اس کی وجہ سے آپؐ مجھ پر ناراض ہوں گے' لیکن اس میں مجھے اللہ سے اچھے انجام کی امید ہے۔ (اس لیے سچ سچ عرض کرتا ہوں) اللہ کی قسم! (آپؐ کے ساتھ جانے میں) مجھے کوئی عذر نہیں تھا' اللہ کی قسم! میں اتنا طاقت ور اور خوش حال کبھی نہیں رہا جتنا میں اس وقت تھا جب آپؐ سے پیچھے رہا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس شخص نے یقیناً" سچ کہا ہے۔ چنانچہ تم (یہاں سے) کھڑے ہوجاؤ' یہاں تک کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔"

"میرے پیچھے بنو سلمہ کے کچھ لوگ آئے اور مجھ سے کہا۔"

"اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ اس سے قبل تم نے کوئی گناہ کیا ہے' تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی ایسا عذر پیش کرنے سے کیوں قاصر رہے جیسا دوسرے پیچھے رہنے والوں نے پیش کیا۔ تمہارے گناہ (کی معافی) کے لیے یہی کافی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے مغفرت کی دعا فرماتے۔"

حضرت کعبؓ نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم! مجھے وہ (میری سچائی پر) ملامت کرتے اور ڈانٹتے رہے' یہاں تک کہ میرے جی میں آیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوکر اپنی پہلی بات کی تکذیب کردوں (اور کوئی جھوٹا عذر پیش کردوں) لیکن پھر میں نے ان سے پوچھا۔

"کہ میرے ساتھ والا معاملہ کسی اور کو بھی پیش آیا ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں' تمہارے جیسا معاملہ دو اور آدمیوں کو بھی پیش آیا ہے اور انہوں نے بھی وہی بات کہی ہے جو تم نے کہی ہے اور انہیں بھی (بارگاہ رسالت سے) وہی کچھ کہا گیا ہے جو تمہیں کہا گیا ہے۔"

میں نے ان سے پوچھا۔ "وہ شخص کون ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "مرارہ بن ربیع عمری اور ہلال بن امیہ واقفی۔"

یہ دونوں آدمی جن کا انہوں نے میرے سامنے ذکر کیا' نیک تھے اور جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے اور ان میں میرے لیے نمونہ تھا۔ جس وقت انہوں نے ان دونوں آدمیوں کا میرے سامنے ذکر کیا تو میں اپنے سابقہ موقف پر جم گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہم تینوں سے 'لوگوں کو گفتگو کرنے سے روک دیا۔

حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگ ہم سے کنارہ کش ہوگئے' یا یہ کہا کہ لوگ ہمارے لیے بدل گئے' حتیٰ

کہ زمین بھی میرے لیے اوپری بن گئی۔ یہ زمین میرے لیے وہ نہ رہی جو میری جانی پہچانی تھی۔

اس طرح پچاس راتیں ہم نے گزاریں۔ میرے دوسرے دو ساتھی تو عاجز آگئے اور گھروں میں بیٹھے روتے رہے۔ لیکن میں بالکل جوان اور نہایت قوی و توانا تھا' چنانچہ میں گھر سے باہر نکلتا' مسلمانوں کے ساتھ نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ لیکن مجھ سے کلام کوئی نہ کرتا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور آپؐ جب نماز کے بعد تشریف فرما ہوتے تو آپؐ کو سلام بھی عرض کرتا اور اپنے دل میں کہتا کہ سلام کے جواب میں آپؐ اپنے مبارک لبوں کو جنبش دیتے بھی ہیں یا نہیں؟

پھر آپؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور دزدیدہ نظروں سے آپؐ کو دیکھتا' (تو میں نے دیکھا کہ) جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو آپؐ میری طرف نظر فرماتے اور جب میں آپؐ کی طرف رخ کرتا آپؐ مجھ سے اعراض فرمالیتے۔

یہاں تک کہ جب مسلمانوں کی (میرے ساتھ) سختی اور بے رخی زیادہ دراز ہوگئی تو ایک روز میں ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ اور وہ میرا چچازاد بھائی اور لوگوں میں مجھے محبوب ترین تھا۔ میں نے اسے سلام کیا' لیکن اللہ کی قسم! اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"ابو قتادہ! میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا تو میرے متعلق جانتا ہے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں؟"

وہ خاموش رہا۔ میں نے دوبارہ قسم دے کر پوچھا تو بھی وہ خاموش رہا' حتیٰ کہ تیسری مرتبہ قسم دے کر سوال دوہرایا تو اس نے یہ کہا۔

"کہ اللہ اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔"

جس پر میری آنکھوں سے (بے اختیار) آنسو جاری ہوگئے۔ اور میں (جیسے گیا تھا ویسے ہی) دیوار پھاند کر واپس آگیا۔

اسی اثنا میں (ایک روز) میں مدینے کے بازار میں جارہا تھا کہ اچانک اہل شام کے نبطیوں میں سے ایک نبطی جو مدینے میں غلہ بیچنے کے لیے آیا تھا' کہہ رہا تھا۔ "کہ کون ہے جو کعب بن مالک کی طرف میری رہنمائی کرے؟"

لوگ اس کے لیے میری طرف اشارہ کرنے لگے' یہاں تک کہ وہ میرے پاس آگیا اور اس نے مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا۔ میں پڑھا لکھا تو تھا ہی' میں نے اسے پڑھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا۔

"امابعد! ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم پر ظلم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت کے گھر میں رہنے یا ضائع کرنے کے لیے نہیں بنایا ہے۔ ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ' ہم تم سے پوری ہمدردی کریں گے۔"

جس وقت میں نے یہ پڑھا تو میں نے کہا۔ "یہ بھی ایک آزمائش ہے۔"

میں نے اس (خط کو) تنور میں ڈال کر جلا ڈالا۔ حتیٰ کہ جب پچاس دنوں میں سے چالیس دن گزر گئے اور (میرے بارے میں) وحی کا سلسلہ بھی (ابھی تک) موقوف ہی تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قاصد کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے آکر کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے (بھی) علیحدگی اختیار کرلو!"

میں نے پوچھا۔ "کیا میں اسے طلاق دے دوں یا کیا کروں؟"

اس نے کہا۔ "(طلاق) نہیں' اس سے علیحدگی اختیار کرو' اس کے قریب مت جاؤ۔"

اور میرے دوسرے دو ساتھیوں کو بھی آپؐ نے یہی پیغام بھجوایا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ اور ان ہی کے پاس رہو! یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا فیصلہ فرمادے۔"

(میرے ایک ساتھی) ہلال بن امیہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "کہ ہلال بہت بوڑھے ہیں اور ان کے لیے کوئی خادم بھی نہیں ہے' کیا اگر میں ان کی خدمت کروں (تو آپ کو ناپسند ہے؟)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا۔ "نہیں' لیکن وہ تم سے قربت (صحبت) نہ کریں۔"

بیوی نے کہا۔ "اللہ کی قسم! اب ان میں کسی چیز کی طرف حرکت کی طاقت ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں' اللہ کی قسم! جب سے یہ معاملہ ہوا ہے' اس وقت سے اب تک' ان کا سارا وقت روتے ہوئے گزرتا ہے۔"

(حضرت کعب فرماتے ہیں۔) مجھ سے (بھی) میرے بعض گھر والوں نے کہا۔

"اگر تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت طلب کرلو (تو اچھا ہے) آپؐ نے (اجازت طلب کرنے پر) ہلال بن امیہ کی بیوی کو بھی تو ان کی خدمت کرنے کی اجازت عطا فرما دی ہے۔ میں نے کہا۔ میں اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں مانگوں گا۔ مجھے نہیں معلوم جب میں آپؐ سے اجازت مانگوں گا تو آپؐ کیا جواب دیں گے' کیونکہ میں تو نوجوان آدمی ہوں (جبکہ ہلال بالکل بوڑھے ہیں۔)"

چنانچہ اس طرح دس راتیں (مزید) گزر گئیں۔ اور جب سے لوگوں کو ہم سے بات چیت کرنے سے روکا گیا تھا' اب تک ہماری پچاس راتیں مکمل ہو گئی تھیں۔

میں نے پچاسویں رات کی صبح کو اپنے گھروں میں سے ایک گھر کی چھت پر فجر کی نماز پڑھی۔ چنانچہ میں (نماز پڑھ کر) ابھی اسی (افسردگی کی) حالت میں بیٹھا تھا جس کا ذکر اللہ نے ہمارے بارے میں فرمایا ہے کہ میرا دل مجھ پر تنگ ہوگیا اور زمین باوجود فراخی کے مجھ پر تنگ ہو گئی کہ میں نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو سلع پہاڑی پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ با آواز بلند کہہ رہا تھا۔

"اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ!"

میں اسی وقت (فرط خوشی میں) سجدے میں گر پڑا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ (اللہ کی طرف سے) کشادگی (معافی) آگئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت فجر کی نماز پڑھ لی' لوگوں کو بتلایا کہ "اللہ عزوجل نے ہماری (تینوں کی) توبہ قبول فرمالی ہے۔ چنانچہ لوگ ہمیں خوش خبری دینے کے لیے آنے شروع ہو گئے۔ میرے دونوں ساتھیوں کی طرف بھی خوش خبری دینے والے گئے۔"

ایک شخص نے نہایت تیزی سے میری طرف گھوڑا دوڑایا اور اسلم قبیلے کا ایک آدمی میری طرف دوڑا آیا اور پہاڑ پر چڑھ گیا' اس کی آواز گھوڑے سے بھی تیز رفتار تھی۔ چنانچہ جب میرے پاس وہ شخص آیا جس کی خوش خبری کی آواز میں نے سنی تھی تو میں نے اس کی خوش خبری کے بدلے میں اپنے جسم کے دونوں کپڑے اتار کر اسے پہنا دیے۔ اللہ کی قسم! اس روز ان کے علاوہ میں کسی اور چیز کا مالک بھی نہیں تھا۔ اور میں نے خود دو کپڑے عاریتاً لے کر پہنے۔

(پھر) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا قصد کرکے چلا' (راستے میں) لوگ مجھے گروہ کے گروہ ملتے اور قبول توبہ کی مبارک باد دیتے اور مجھ سے کہتے۔

"تمہیں مبارک ہو کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔" حتی کہ میں مسجد نبوی میں داخل ہو گیا۔

(میں نے دیکھا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد لوگ ہیں۔ طلحہؓ بن عبید اللہ لپکتے ہوئے کھڑے ہوئے' حتی کہ مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد پیش کی۔

اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے ان کے علاوہ کوئی اور کھڑا نہ ہوا۔

حضرت کعبؓ طلحہؓ کی اس بات کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں۔ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں سلام عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جبکہ آپؐ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔

"تمہیں یہ دن مبارک ہو جو تمہاری زندگی کا' جب سے تمہیں تمہاری ماں نے جنا ہے' سب سے بہترین دن ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ خوش خبری آپؐ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میری طرف سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اس طرح گلنار ہوتا گویا کہ وہ چاند کا ایک ٹکڑا ہے اور اس سے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کی خوشی) کو پہچان لیتے۔ جب میں آپؐ کے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری توبہ کا یہ جزہے کہ میں اپنا (سارا) مال اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں صدقہ کرتا ہوں۔"

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنا کچھ مال اپنے لیے رکھ لو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا' میں اپنا وہ حصہ رکھ لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔" اور میں نے (یہ بھی) کہا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نجات سچائی کی بدولت عطا فرمائی ہے' اس لیے یہ بھی میری توبہ کا ایک حصہ ہے کہ (میں عہد کرتا ہوں کہ۔) جب تک میری زندگی ہے' میں ہمیشہ سچ ہی بولوں گا۔"

اللہ کی قسم! جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس عہد صدق کا) ذکر کیا میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں میں سے کسی پر اللہ تعالیٰ نے سچ بولنے کے صلے میں وہ بہتر انعام فرمایا ہو جس سے اللہ نے مجھے نوازا۔ اللہ کی قسم! جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا ہے' آج تک میں نے جھوٹ نہیں بولا اور مجھے امید ہے کہ باقی زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ مجھے اس سے محفوظ رکھے گا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں۔ "ہمارے بارے میں جو آیات نازل ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں۔ ترجمہ

"یقیناً" اللہ تعالیٰ نے پیغمبر پر اور ان مہاجرین و انصار پر رجوع فرمایا جنہوں نے تنگی کے وقت میں اس پیغمبر کی پیروی کی' بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل پھر جائیں' پھر رجوع کیا اللہ نے ان پر' بے شک وہ بہت شفیق اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور ان تین شخصوں پر بھی (رجوع فرمایا) جنہیں (حکم الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا' یہاں تک کہ جب ان پر زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی اور خود ان کے اپنے نفس بھی ان پر تنگ ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں اللہ سے بچانے والا' اللہ کے سوا کوئی نہیں' پھر اللہ نے ان پر رجوع فرمایا تاکہ وہ توبہ کریں' یقیناً" اللہ تعالیٰ بہت رجوع کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں۔ "اللہ کی قسم! جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی ہدایت سے نوازا' اس کے بعد اللہ نے مجھ پر جو انعامات فرمائے' ان میں سب سے بڑا انعام میرے نزدیک یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولا اور جھوٹ بولنے سے گریز کیا۔ اگر میں بھی جھوٹ بول دیتا تو اسی طرح ہلاک ہو جاتا' جس طرح جھوٹ بولنے والے ہلاک ہوئے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے' جب وحی نازل فرمائی تو جھوٹ بولنے والوں کو جس طرح برا بھلا کہا' اس طرح کسی کو بھی نہیں کہا۔

☆

جنت کی تلاش

مصنف: رحیم گل
تبصرہ: آمنہ زریں

نئے مرحلے طے کرنے کا مرحلہ پچھلی منزلوں کو پیچھے چھوڑ دینے کا نام ہے 'لیکن اس جاری سفر میں 'جس کا نام زندگی ہے 'بعض اوقات ظاہری مرحلے طے ہونے لگتے ہیں 'باطنی سفر رک جاتا ہے۔ اس کی وجہ کسی بھی خوش گوار یا تلخ واقعے سے جڑے رہنا ہوتا ہے۔ ہماری روحانی ترقی کا سفر رک جانے کے ذمہ دار خود ہم ہی ہوتے ہیں۔

"جنت کی تلاش" کے نہیں ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہ جنت ہماری ذہنی اختراع کے نتیجے میں 'خواہشوں کے منبع سے جنم لے 'یا الہامی سطح پر اس کا ظہور ہمیں تڑپائے ۔۔۔ یہ آسانی سے ملنے والی شے ہرگز نہیں ہے

باتوں ہی باتوں میں خوب صورت پہاڑی علاقوں کی سیر 'سفر کے دوران پیش آنے والے دلچسپ واقعات 'ہر گام پر ملنے والے نئے نئے کردار اور ذہن کو جھنجھوڑنے والی دلچسپ فکری بحث 'اگر آپ ان سب کا مزہ ایک ہی نشست میں لینا چاہتے ہیں۔ تو "جنت کی تلاش" آپ کی منتظر ہے!

امتل کہانی کا مرکزی کردار تو ہے ہی ۔۔۔ مگر باقی کرداروں کی توجہ کا مرکز بھی امتل ہی ہے۔ امتل ۔۔۔ مضطرب روح ۔۔۔ زندگی سے بے پروا ۔۔۔ موت سے بے نیاز 'اپنے موقف پر قائم 'جان وارو لیلوں سے ہر وقت لیس کردار ہے۔ امنگ کے خاتمے پر موجود زندگی کے خالی پن سے آگاہی اسے کیسے حاصل ہوئی ۔۔۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے 'جس کا جواب آخر کار قاری کو مل ہی جاتا ہے۔

عاطف 'امتل پر جان نثار کر دینے کے جذبے سے سرشار بھائی ہے ۔۔۔ دنیا میں امتل کے سوا اس کا اپنا کوئی نہیں ۔۔۔ وسیم 'سیاحت پر نکلا ہوا بے فکرا نوجوان ۔۔۔ جو ان دونوں سے مانسہرہ میں متعارف ہوا 'جہاں سے کہانی آغاز کرتی ہے۔ مانسہرہ سے کراچی 'کوئٹہ اور کوئٹہ سے شمالی علاقہ جات کا سفر اور سیاحت 'ترغیب اور طلب 'دریافت اور نا آسودگی 'مثبت اور منفی 'امنگ اور مایوسی 'کردار اور واقعات 'تاریخ اور ثقافت کا احاطہ کرتی ہوئی یہ کہانی اس بے ساختگی اور فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے کہ موضوع ایک ہونے کے باوجود دلائل کی خوب صورتی ماند نہیں پڑتی۔

خود غرضی 'مفاد پرستی اور حیوانیت انسانی فطرت میں موجود شر کے نمائندے ہیں۔ تہذیب نفس کے ذریعے ان پر غالب آنا شرف انسانیت ہے 'مگر فطرت میں موجود غالب عنصر کا تناسب جاننے کی جستجو کسے ہے؟

امتل کے فکری رجحان کا ماخذ انسانی فطرت کے منفی پہلو ہیں 'جو تمام عمر انسان کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں ۔ مگر زندگی کا ایک ہی رخ دیکھے جانا 'ایک طرح سے انتہا پسند نظریات کو جنم دیتا ہے۔ وہ بے تحاشا رجعت پسندی ہو یا یاسیت بھری منفی تحریک ۔۔۔ ایک ہی راستے کا مسافر ہو جانا 'توازن اور اعتدال سے دوری کا باعث بنتا ہے۔

امتل بھی اسی لیے سماج کے بہتے دھارے سے الگ اور منفرد کردار ہے 'کیونکہ وہ ایک ہی رخ پر سوچتے سوچتے انتہا تک پہنچی ہوئی ہے!

تو چلیے 'چلتے ہیں مختلف منظروں اور بحث کے کچھ ٹکڑوں کی طرف ۔۔۔ کہ کرداروں سے شناسائی سے پہلے آپ ان کی جھلک دیکھ لیں ۔۔۔!

"امتل کی چال ڈھال 'اٹھنے بیٹھنے میں جو رکھ رکھاؤ اور وقار تھا 'وہی انداز اس کی باتوں میں بھی تھا۔ بس اس کے نچلے ہونٹ اور خوب صورت گردن میں ایک مخصوص قسم کی ترغیب تھی ورنہ تو آدمی اسے دیوی ہی سمجھتا۔"

یہ وسیم صاحب ہیں 'جو دراصل کہانی کے راوی بھی ہیں 'امتل کے ظاہر اور پھر کردار سے متاثر ہونے والے 'اور جن پر امتل اور عاطف اعتماد کرتے ہیں اور یہی اعتماد سفر میں شراکت اور کہانی کے توازن کا باعث ہے کہ امتل کے رد کر دینے والے انداز فکر کی مدافعت یہی وسیم صاحب کرتے ہیں۔

"سب کام کیجیے ۔۔۔ مگر ایک بات یاد رکھیے 'مجھ پر رحم نہ کھائیے 'مجھے مظلوم بننا ہرگز پسند نہیں۔"

"خوب خوب ۔۔۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اگر آدمی مظلوم بننے سے انکار کر دے ۔۔۔ تو ظالم پنپ ہی نہیں سکتا۔"

تو یہ امتل ہے! بات کے پیچھے چھپے معنی اخذ کرنے والی ۔۔۔!

"خوشی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے۔ بلکہ میں کہتی ہوں۔ غم بھی مختصر ہوتا ہے۔ کوئی بھی جذبہ مستقل طاری نہیں رہتا 'محبت اور خلوص سے زیادہ عمر تو نفرت کی ہوتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں؟ اس کا علاج کیوں نہیں کیا جاتا؟"

"اس کا علاج نہیں ہے۔ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ کوئی ازم 'کوئی طاقت ہمارے جسم میں خون کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ یہ علت ہمارے خون میں ہے۔ فطرت انسانی میں شر کا جزو نسبتاً "زیادہ ہے۔"

"جذباتی سچائیوں کو آپ حماقت کہتی ہیں؟"

"کون سی جذباتی سچائیاں؟" اس کی مجسس آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ "اپنے خون کے ابال کو آپ سچائی کہتے ہیں۔ خوب صورت آنکھیں اور خوب صورت جسم کی کشش کو آپ جذباتی سچائی سمجھتے ہیں۔ نہیں وسیم صاحب نہیں 'یہ اپنا ہی رد عمل ہوتا ہے۔ جب خوب صورت آنکھوں کے سرخ ڈورے اور حسین جسم کا تناسب ختم ہو جاتا ہے تو جذباتی سچائیاں بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔"

"آپ دیکھتے ہیں نا یہ شاندار بنگلے 'ایک سے بڑھ کر ایک کوٹھیاں ۔۔۔ میں دعوے سے کہتی ہوں 'ناجائز آمدنی سے بنی ہیں۔ ہل چلا کر کوئی کوٹھی نہیں بنا سکتا۔ سبزی اگا کر بھی کوٹھی نہیں بنائی جا سکتی۔ زندگی کے جائز اور اصل ذرائع تو یہ ہیں تاکہ زمین کھودی جائے اور اس سے پیٹ بھرا جائے اور تن ڈھانپا جائے۔ ملازمت اور تجارت تو مصنوعی اور غیر قدرتی ذرائع ہیں ۔ یہ ذرائع رشوت اور اسمگلنگ کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح وافر پیسہ آتا ہے اور یوں عالی شان بنگلے تعمیر ہوتے ہیں۔"

"امتل کے سامنے عذر اور فرار کا ہر راستہ بند ہو جاتا تھا۔ زندگی کی منفی باتیں اس کی زبان سے آدرش اور قدریں بن کر نکلتی تھیں اور جو اصل قدریں اور آدرش ہوتی تھیں 'ان کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا تھا۔"

کراچی سے ہوائی سفر طے کر کے یہ لوگ کوئٹہ پہنچے ۔۔۔ جہاں ہم بلوچ ثقافت 'صنوبر کے جنگل 'سیب کے باغ 'خشک پہاڑی علاقوں کو سیراب کرنے کے مشکل ذریعے "کاریز" سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گوشت کی مزے دار ڈش 'جو دنبے کی اپنی چربی اور صرف نمک سے تیار کی جاتی ہے 'جس کا نام "روز" ہے کی تعریفیں سنتے ہیں!

یہ کتاب ستر کی دہائی میں لکھی جا رہی تھی۔ اس کی تکمیل میں چھ برس لگے۔ ان برسوں میں مصنف نے سفر ہی سفر کیا ۔۔۔ پاکستان کو خدا تا قیامت سلامت

رکھے۔۔۔ یہ تب بھی خوب صورت تھا، آج بھی۔۔۔ مگر آج۔۔۔ امن، بے فکری۔۔۔ محبت کے مناظر خوف، بد اعتمادی اور پریشانیوں کے غبار سے دھندلائے ہوئے ہیں!

خدا اسے پاکیزگی عطا کردے!

دیکھیے۔۔۔ خود امتل اپنے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے!

"میرا جینا کیا جینا ہے۔ میں تو بالکل بے مقصد جی رہی ہوں۔ آپ کے پاس تو کوئی آس کوئی آرزو ہے بھی۔۔۔ دوبار خودکشی کی کوشش کی۔۔۔ ناکام رہی۔ پھر سوچا، مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ جب من نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تو سوچا۔ چلنے دو۔۔۔ نہ موت کا انتظار کرو اور نہ موت کے پیچھے بھاگو۔۔۔ اور نہ موت سے خوف کھاؤ۔ آگئی تو گلے لگالو۔۔۔ نہ آئی تو پرواہ نہ کرو۔۔۔ انسان سے نفرت نہیں کرتی۔ لیکن سینے میں والہانہ محبت بھی نہیں پاتی۔ کسی پر ظلم ہوتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ میں انسان سے مایوس ہوں اور خود کو ہمیشہ تنہا پاتی ہوں۔ بلکہ ہر انسان کو تنہا پاتی ہوں۔۔۔!"

دیکھیے۔۔۔ وسیم صاحب انہیں کس طرح اپنے ڈھب پر لانے کے جتن کرتے ہیں۔

"آپ کو اجازت ہے ہنسنے کی بھی اور رونے کی بھی، مگر میں آپ کو قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو خوش ہو کر ہنسے، غمگین ہو کر روئے اور غصے میں آکر روٹھ جائے۔ دکھ اور سکھ دونوں کو دبانے سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ بے شک میں انسانی رشتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ آپ نے انسانی رشتوں کی نفی میں جو دلائل دیے، ان کی تردید کی مجھ میں اہلیت نہیں ہے۔ لیکن ایک وجدانی قوت مجھے مدافعت کے لیے ابھار رہی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس صداقت کے قریب ہوتا جا رہا ہوں کہ زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان سدھرے، نہ سدھرے، آدمی کا فرض ہوتا ہے کہ اسے راستی کی ترغیب دے، جب تک زمین پر ایک آدمی بھی رہتا ہے، یہ سوچ زندہ رہنی چاہیے۔"

کوئٹہ سے ہوائی سفر طے کرکے لاہور، اسلام آباد اور وہاں سے ایبٹ آباد پہنچ کر کاغان کے سفر کے لیے ضروری معلومات کے حصول کے بعد مہم جوئی والے سفر کا آغاز ہوا۔ شمالی علاقے کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونے کے بعد سرمائے کے علاوہ جان جوکھم میں ڈالنے کا حوصلہ بھی چاہیے۔

بالاکوٹ سے ناران جاتے ہوئے۔

"آٹھ دس میل اوپر جانے کے بعد عاطف نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ دراصل وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اور ڈرائیور کی ذرا سی بھول چوک گویا ہمیں جیپ سمیت سیدھی دریا میں پہنچاتی۔"

جھیل سیف الملوک کا تذکرہ ان سے ملنے والے غیر ملکی سیاحوں نے خوب خوب کیا تھا۔ مگر نقشہ کشی کرنے کے بجائے خود دیکھنے کی ترغیب دلائی تھی۔ کسی نے اسے خدا کا روپ اور کسی نے دوسری دنیا کا منظر بتایا تھا۔

"یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے ہیں اور یہ وادی۔۔۔ یہ چاندی کی وادی، دونوں پہاڑوں کے دامن میں بڑے بڑے گلیشیر اور اس میں چاندی کی وادی، دونوں پہاڑوں کے دامن میں بڑے بڑے گلیشیر اور اس میں چاندی کی طرح مچلتا ہوا اور آنکھ مچولی کھیلتا ہوا آب رواں۔۔۔!

"چاروں طرف دودھ کی طرح سفید برف میں لپٹے ہوئے سربفلک پہاڑ، اور ان کے درمیان ڈیڑھ میل سبز و شفاف پانی کی جھیل یوں لگ رہی تھی، جیسے سفید چاندی کی انگوٹھی میں سیال زمرد کا نگینہ۔۔۔!"

"جھیل میں سفید اور سبز برف کے بڑے بڑے تودے تیر رہے تھے۔ سفید تودے پکی برف کے تھے جن میں پانی جذب نہیں ہو سکتا تھا اور سبز تودے کچی برف کے تھے جن میں جھیل کا سبز پانی جذب ہو جاتا تھا اور ان تودوں کا رنگ دور سے سبز نظر آتا تھا۔"

کاغان سے واپسی پر ان کی ملاقات ایک اطالوی سیاح سے ہوئی۔۔۔ جس سے طویل گفتگو میں اس کی زندگی کے تجربے، مشاہدے اور حیران کن موڑ سامنے آئے۔ اس سے گفتگو کے دوران امتل کہنے لگی۔

"یہ خلا نوردی اور ماہ نوردی کو ترقی سمجھتے ہیں اور میں اسے رد کرتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ اگر انسان ایٹم کی طاقت کا مالک بنا ہے تو اسے خلا میں کیوں ضائع کرتا ہے۔ وہ صحرائے اعظم کو سرسبز کیوں نہیں بناتا۔ وہ افریقہ کے دلدل خشک کیوں نہیں کرتا۔ وہ ایشیا کی پس ماندگی کو ختم کیوں نہیں کرتا اور وہ دنیا بھر کے مچھر ضائع کیوں نہیں کرتا۔ وہ لسے انسان پر استعمال کرتا ہے۔ مچھر اور مکھیاں نظرانداز کردیتا ہے۔ ترقی یافتہ انسان چاند اور زہرہ کا دور دراز کا سفر کرتا ہے۔ مگر اپنے سینے میں اترنا پسند نہیں کرتا۔"

"میں کہتی ہوں ہم حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے، ہم مان کیوں نہیں لیتے کہ انسان انسان کا دوست نہیں ہے اور روئے زمین کا مہذب سے مہذب ترین انسان بھی محض غرض کا بندہ ہے۔"

"یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہ بھوک، افلاس اور قحط کو ختم کرنے کے لیے لاکھوں ٹن اناج کی پیش کش کرتی ہے۔ ہزاروں روپے کی امداد دے کر انسان دوستی کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ لیکن جب پانسہ پلٹتا ہے تو پلک جھپکتے میں انسان دوستی انسان کشی میں بدل جاتی ہے۔ نیکی اور ہمدردی بے معنی ہو جاتی ہے۔ لاکھوں انسان آرزوؤں اور تمناؤں کے انبار اٹھائے صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں لیکن مہذب انسان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکتا۔ پھر بھی ہم منتظر ہیں، اس سحر کے لیے، جو انسان کے سینے سے کبھی طلوع نہیں ہوگی!

وہ کون سا موضوع ہے، جو امتل کی دسترس سے باہر ہے!

"اس کی فکر آپ نہ کریں۔" امتل بولی۔ "قیامت آئی کہ آئی۔ ایک دن آئے گا، دنیا کی بڑی طاقتیں اس نتیجے پر پہنچ جائیں گی کہ ایشیا میں دو چار ہائیڈروجن بم گرانے ضروری ہیں۔ چالیس پچاس کروڑ آدمی مریں گے تو سو سال تک بنگ کا امڈونل جائے گا اور قحط کا اندیشہ بھی کم ہو جائے گا۔ کم از کم ہم لوگوں کو قیامت کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ایشیا اس بارے میں بہت خوش قسمت ثابت ہوگا۔"

ناران سے بالاکوٹ، نوشہرہ، مردان، مالاکنڈ، سوات۔۔۔ خوب صورت سفر، دلکش نظارے۔۔۔ سادہ مزاج پہاڑی لوگوں کی بے لوث مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد۔۔۔ یہ لوگ گلگت پہنچ گئے۔۔۔ ہوائی جہاز سے نانگا پربت کی چاندی جیسی برف کا نظارہ روح پرور۔۔۔ نظارہ تھا!

گلگت میں ہر سفر پر دریا ہم سفر تھا۔ عاطف بری طرح خائف ہو چکا تھا۔ لہٰذا آگے کا سفر وسیم صاحب اور امتل نے طے کیا۔۔۔ اور اسکردو کے لیے عازم سفر ہوئے۔

"ندی کے اس پار خوشبودار درختوں کے جھنڈ سے خوشبوؤں کی لپٹیں آرہی تھیں۔ شہر کے آدمیوں کے لیے قدرت کا یہ عطیہ ایک انوکھا مشاہدہ تھا۔ شاید ہم زندگی میں پہلی بار چاندرات کے جادو سے آشنا ہوئے تھے۔ نور اور نکہتوں کی ایسی وسیع اور طوفانی چادر بھی پہلی بار دیکھ رہے تھے۔"

"میں سوچ رہا تھا، فطرت کی رعنائیاں باقی رہ جاتی ہیں، انسان مٹی ہو جاتا ہے۔ وہ جو خود کو ان سب رعنائیوں کا مالک کہلوانا چاہتا ہے۔ مالک بننے کے باوجود زیر زمین چلا جاتا ہے اور اس کا احساس ملکیت ان فطرتی رعنائیوں کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچاتا۔ پھر نئی نسل آتی ہے، تگ و دو کرتی ہے۔ ان چیزوں کے لیے جو ٹھوس ہیں، جو موجود رہتی ہیں، جو کروڑوں سال سے موجود ہیں۔ عجیب ہے کہ مالک ختم ہو جاتے ہیں مگر ملکیت کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن انسان ہے کہ دعویٰ ملکیت سے باز نہیں آتا اور نہ یہ مسئلہ اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی اتنی مختصر ہے کہ دعویٰ ملکیت ثابت کرنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے!"

اسکردو میں آنکھوں کے ڈاکٹر سے ملاقات نے امتل کے دل پر گہرا اثر کیا۔ ڈاکٹر واقعی مسیحا تھا!

ڈاکٹر نے انہیں دیوسائی جانے کی ترغیب دی.....
اور پھر وہی۔ سفر بھی دلکش..... اور منزل بھی.....

"ہم دیو سائی پہنچ گئے تھے۔ بخدا یہ کیسا نظارا تھا! سطح سمندر سے تیرہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہتھیلی کی طرح طویل و عریض میدان..... تاحد نظر رنگ برنگ پھولوں کا لہراتا ہوا گلزار' ہم دم بخود رہ گئے۔ حیران ہی نہیں خوف زدہ بھی ہوئے۔ جنوں اور پریوں کا دیس ایسا نہ ہو گا تو پھر کیسا ہو گا؟ اریوں اور کھربوں' بلکہ اس سے بھی زیادہ مسکراتے ہوئے تروتازہ شگفتہ پھول ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے یہی کیا کم تھا کہ چودہ ہزار فٹ کی سطح مرتفع میں اتنا لمبا چوڑا میدان پایا جائے اور اس پر طرہ یہ کہ نظر کی حد ختم ہو جائے مگر پھولوں کی سرحد ختم نہ ہو۔ گویا پاؤں میں بھی پھول اور تا بہ افق پھول ہی پھول

سکردو سے واپسی پر امتل کی ملاقات' عاطف کی وساطت سے' فوجی افسروں سے ہوئی اور حسب معمول اپنی فطری سادگی اور برجستگی سے امتل نے انہیں بھی اسیر کر لیا!

"برا نہ مانیے گا میجر صاحب اور کرنل صاحب! ہمارے ملک میں دو طبقے بہت خوش نصیب ہیں۔ ایک فوجی افسر' دوسرا سی ایس پی طبقہ' ان کو بیویاں ہمیشہ خوب صورت مل جاتی ہیں۔

اچھی تنخواہ' اچھا کھانا' اچھی رہائش' آپ اپنے قلعے میں محفوظ بیٹھے ہیں' ہاں یہ دنیا آپ لوگوں کے لیے ٹھیک ہے۔ دراصل یہ زندگی آپ کے لیے نہیں ان کے لیے عذاب ہے' جو سوچتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو ویسا کیوں نہیں۔ مگر جہاں بشر' بشریت کے واسطے سے نہیں رزق کے واسطے سے زندہ ہو تو دکھ اور سوا ہو جاتا ہے۔ پھر آدمی کی پہچان نہیں رہتی اور وہ ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔ کرنل کو جیسے سکتہ ہو گیا ہو....."

"کرنل صاحب! ایسی ترقی کا فائدہ؟ کہ ہمارے دل گھر کے فریج اور ہمارے ولولے کولڈ اسٹوریج میں محفوظ ہو جائیں! نہیں' مجھے ایسے شعور کی ضرورت نہیں۔ جو ہمارے سینے حرارت سے خالی کر دے! زمین کو اب بھی ایسے آدم کی ضرورت ہے..... جو حوا کے بہکاوے میں آجائے.....!"

"جب تک ایشیا کے ہاتھوں میں کشکول رہے گا' زمین کا ضمیر بے چین رہے گا۔ جب تک یورپ مصلحتوں کا شکار رہے گا' دنیا سے دھاندلی ختم نہیں ہو گی۔ جب تک امریکہ کی احساس برتری کا جنازہ نہیں اٹھے گا' دنیا میں امن قائم نہیں ہو گا۔"

ہے نا غیر معمولی کردار' ٹھیک ہے کہ امید سے منہ موڑے اس کا رویہ مایوسانہ ہے لیکن مکمل مایوس نہیں! خیال کی پختگی اور دلیل کی طاقت قابل رشک ہے! انسو سے شروع ہونے والی یہ خوب صورت کہانی نلتر کی دل موہ لینے والی وادی میں اپنے فطری انجام کو پہنچ گئی۔

فطرت کی جلوہ گری کو قریب سے دیکھنے کے بعد امتل میں مثبت تبدیلی جنم لے چکی تھی۔

یہیں..... کہانی کے اختتام سے کچھ ہی پہلے امتل کا اعتماد اٹھ جانے کی وجہ بھی معلوم ہوئی جو قاری کو بھی اتنا ہی حیران کرتی ہے جتنا کہ وسیم صاحب کو۔

ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کی بیوی تکلیف میں مبتلا ہوئی۔ ناگہانی امتل اس کی مدد کے لیے گئی اور ایک بچے کی پیدائش کے عمل نے امتل کو فطرت سے اور بھی قریب کر دیا۔ ایک نئے انسان کی پیدائش' اس کے لیے امید کا پیغام ثابت ہوئی..... اور امتل زندگی کے مثبت اور صحت مند رویے کی طرف پلٹ جانے پر آمادہ

ہمارے شمالی علاقوں کے حسن کی ایک دنیا اسیر ہے! کچھ سالوں سے یہ حسن گہنایا ہوا سا ہے..... بارود..... دشمنی' دھواں! سوات کی خوبانیاں اور آڑو..... گلگت کا سکون' امن اور محبت کو نظر لگی ہوئی ہے!

ایسے میں یہ کتاب اچھے دنوں کی یادوں پر مشتمل' حقیقت سے بے حد قریب' ہمارے پیارے وطن کا حسن اور پاکیزگی سمیٹے ہوئے' کچھ اور بھی خاص لگتی ہے۔ امتل کی سادگی' بے نیازی' فکری پختگی..... کم از کم ہمیں یہ سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم سوچنے' غور کرنے کی باتوں کو کیوں چھوڑتے چلے جا رہے ہیں

بندھن

عمران اسلم ہمراہ ثنا اسلم

شاہین رشید

معروف آرٹسٹ عمران اسلم نے چند ماہ قبل ایک سیریل "دریچہ" میں کام کیا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک نہایت ظالم سنگدل چھینک شوہر کا کردار ادا کیا تھا۔ ڈرامے میں نظر آنے والا یہ کردار حقیقی زندگی میں نہایت محبت کرنے والے اور دوسروں کا خیال رکھنے والا ثابت ہوا اور یہ بات ہمیں ان کے ہم سفر سے معلوم ہوئی۔

بندھن کے سلسلے میں آپ کی ملاقات نئے جوڑے عمران اسلام اور مسز ثنا عمران سے کروا رہے ہیں۔

عمران اسلم

"ہاں جی زندگی کیسی گزر رہی ہے شادی کے بعد؟"

"شادی کے بعد کافی اچھا محسوس ہو رہا ہے۔ ذمہ داری کا احساس ہو رہا ہے اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ والدین کی وفات کے بعد میں اکیلا ہی رہتا تھا۔"

"اور لڑکوں کو بے فکری اور آزادی کی زندگی زیادہ پسند ہوتی ہے؟"

"ایسا تو اب بھی ہے۔ بے فکری بھی ہے آزادی بھی ہے۔ وہ میرے سانچے میں ڈھل گئی ہیں۔ میں رات کو تین چار بجے گھر آتا ہوں تو وہ جاگ رہی ہوتی ہیں۔ پھر ہم دونوں ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ حالانکہ میں ان کو کہتا بھی ہوں کہ کھانا کھا لیا کرو۔ مگر وہ میرا انتظار کرتی ہیں تو پھر میں بھی کچھ کھا کے نہیں آتا۔"

"آپ چاہیں گے کہ بیگم بھی اس فیلڈ میں آجائے۔"

"میں نے تو انہیں کھلی اجازت دی ہے کہ انہوں نے جو کام کرنا ہو کریں۔ اداکاری کا انہیں شوق نہیں ہے لیکن اگر میں نے پروڈکشن دوبارہ شروع کی تو پھر یقیناً" یہ میرا ساتھ دیں گی۔۔۔ انہیں لکھنے کا بھی شوق ہے مگر لکھنے کا طریقہ کار نہیں پتا۔ بڑی اچھی تنقید نگار بھی ہیں۔ کوئی کام اچھا نہ لگے تو اگلے کو سنا بھی دیتی ہیں اور میرے لیے حساب ہے گھر کی مرغی دال برابر۔۔۔ کبھی تعریف تو کبھی تنقید۔"

"آج کل کی مہنگائی کے دور میں بیوی کو بھی کمانا چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"اگر پرانی سوچ کے حساب سے دیکھا جائے تو بیوی کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گھر سنبھالے اور مرد کمائے۔ جبکہ آج کل کی سوچ کچھ مختلف ہے اور میں پرانی سوچ کے ساتھ نئی سوچ بھی رکھتا ہوں۔ اس لیے میں نے انہیں کھلی چھٹی دی ہے کہ یہ کام کرنا چاہتی ہیں تو بے شک کریں۔۔۔ کیونکہ شادی سے پہلے یہ کام کرتی تھیں تو اب ان کا خیال ہے کہ بہت کام کر لیا ہے۔۔۔ اب آپ ہیں نا کمانے والے تو مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟"

"شادی کے فائدے ہیں اور اس وقت زیادہ ہوتے ہیں جب میاں بیوی میں دوستی کا رشتہ زیادہ ہو۔ لڑکی صرف بیوی ہو تو انڈر اسٹینڈنگ میں فرق آجاتا ہے کیونکہ انڈر اسٹینڈنگ کا لیول بیوی کا کچھ اور ہوتا ہے اور دوستی کا کچھ اور ہوتا ہے اور ہم میاں بیوی کم اور دوست زیادہ ہیں۔"

"رول کے حساب سے آپ کے رومانٹک سین یا ڈائیلاگ پر اعتراض کرتی ہیں؟"

"میری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ مجھے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دو مرتبہ ثنا کو بھی برا لگا اور انہوں نے مجھے کہا کہ آپ پردے کیا چارج کرتے ہیں تو میں نے بتایا کہ اتنا تو کہنے لگیں اتنا میں بھی آپ کو دیتی ہوں۔ آپ مجھے پروپوز کر کے دکھائیں۔" قہقہہ

"ارے! یہ کیا بات ہوئی؟"

قہقہہ "مطلب یہ کہ میں نے انہیں پروپوز بڑے عجیب انداز میں کیا تھا اور وہ اس طرح کہ بات چیت جب طے ہو گئی تو میں نے ان سے ایک ملاقات کی اور کہا کہ بس آپ نے زندگی میں جو کرنا تھا کر لیا تو کہنے لگیں کہ ہاں جی میں نے جو کرنا تھا کر لیا تو پھر میں نے کہا کہ آپ فارغ ہیں، کہنے لگیں ہاں جی فارغ ہوں تو میں نے کہا کہ چلیں پھر ٹھیک ہے شادی کر لیتے ہیں۔۔۔ تو اس طرح میں نے انہیں پرپوز کیا تھا۔"

"تو اس کا کیا مطلب لیا جائے کہ یہ آپ کی پہلی اور آخری محبت ہے۔"

"جی بالکل۔۔۔ یہ میری پہلی اور آخری محبت ہیں کیونکہ میں اب عمر کے اس حصے میں جا رہا ہوں کہ اگر کچھ کیا تو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"ثنا کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں۔"

"بری عادت تو کوئی نہیں ہے۔ سب ہی اچھی عادتیں ہیں کیونکہ ان کی ساری ایکٹویٹی اب میرے لیے ہی ہے۔۔۔ میں دیر تک سوؤں تو یہ مجھے کچھ نہیں کہتیں۔ احساس کرتی ہیں کہ میں تھکا ہوا ہوں۔"

"سگھڑ ہیں اور شاپنگ کرواتے ہیں؟"

"ماشاء اللہ بہت۔۔۔ اور بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں اور شادی کے بعد میرا وزن بھی اس لیے بڑھا ہے کہ یہ

بہت اچھے کھانے پکاتی ہیں۔ میرے کپڑے بھی مجھے تنگ ہوگئے ہیں اور شاپنگ ان کو گن پوائنٹ پہ کروانی پڑتی ہے اور اس پر بھی ان کی شرط یہ ہوتی ہے کہ چیزیں آپ پسند کریں گے اور دیکھ میں لوں گی۔ ان کو بازار میں چھوڑدیں تو کنفیوز ہو جاتی ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی میں کما کس کے لیے رہا ہوں تو کہتی ہیں کہ میرے پاس سب کچھ تو ہے پھر کیوں خرچ کروں۔ جبکہ میں نے دیکھا ہے کہ شاپنگ کے دوران مرد چیخ رہے ہوتے ہیں کہ خدا کے لیے بس کرو اور میری بیگم کہتی ہیں کہ ہے تو سہی پھر کیا کرنا ہے۔ میں انہیں زبردستی شاپنگ کرواتا ہوں۔"

"چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

"جس دن چھٹی ہو یا جس دن میں فارغ ہوں' اس دن پھر میں گھر پر نہیں ہوتا' ہم لوگ روڈ پر ہوتے ہیں یا پھر گاڑی میں لونگ ڈرائیو پہ نکل جاتے ہیں۔ کھا پی رہے ہوتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے انجوائے کر رہے ہوتے ہیں اور کراچی کے حالات میں تو بس یہی عیاشی ہے کہ آپ جائیں اور اچھا کھانا کھالیں۔ کراچی میں مجھے پورٹ گرانڈ بہت اچھی جگہ لگتی ہے۔ گھومنے پھرنے کے حساب سے اور ماحول کے حساب سے بہت ہی اچھی جگہ ہے اور خاص طور پر فیملی کے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔"

"گھر کو بنانے سنوارنے کا شوق کس کو ہے اور جہیز کیا ملا تھا۔"

"ہم دونوں کو ہے..... اور جہاں تک جہیز کی بات ہے تو آپ یقین کریں کہ میں نے سسرال والوں سے سوائے ان کے اور کچھ نہیں لیا اور جب رشتے کی بات ہو رہی تھی تو میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے صرف آپ کی بیٹی چاہیے۔ میری طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے' جو آپ نے دینا ہے اپنی خوشی سے دینا ہے۔ ان کی تین چھوٹی بہنیں ہیں۔ میں نے کہا آپ ان کے لیے ساری چیزیں رکھ دیں' مجھے صرف آپ کی بیٹی چاہیے..... اور یقین کریں کہ میں صرف بیگم کو لاہور سے کراچی لے کر آیا ہوں یہاں پر آکر ہم نے اپنے گھر کو بنایا سنوارا ہے..... ابھی ڈرائنگ روم سنوارا ہے۔ ان شاء اللہ مزید کر کے بھی سجائیں گے۔"

"آخر میں بیگم کو کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"میں یہی کہوں گا کہ I / Love U Bagum اور جیسی ہو ویسی ہی رہنا ساری زندگی۔"

"مطلب دبلی پتلی رہنا؟"

قہقہہ "نہیں نہیں جیسی سویٹ ہو ویسی ہی رہنا۔ مجھے دبلی پتلی سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"آپ نے کہا کہ میں نے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی سسرال والوں سے تو آپ جس برادری سے تعلق رکھتے ہیں (چنیوٹ شیخ برادری) وہاں تو بہت سخت رسم و رواج ہیں جہیز کے معاملے میں لین دین کے معاملے میں۔"

"میں اپنی برادری کے ان رسم و رواج کے بہت خلاف ہوں اور میں بڑے فخر سے یہ بات کہوں گا کہ میں ان میں سیٹ ہی نہیں ہوتا۔ میں اس برادری کا فرد کہلوانا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بنائی ہوئی ہے۔ اس میں میرا قصور نہیں ہے کہ میں اس برادری میں پیدا ہو گیا۔ ہماری چنیوٹ برادری جس سے آپ کا بھی تعلق ہے۔ یہاں شو آف بہت ہے۔ اب دلہن نے سات لاکھ کا ثنا سفینہ کا جوڑا پہنا ہے تو لوگ دلہن کو نہیں جوڑے کو دیکھ رہے ہوں گے گویا دلہن کی اوقات ہی کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ 25 لاکھ کا زیور دیا ہے۔ اتنے لاکھ کی فلاں چیز دی ہے۔ خواتین کو دولہا دلہن سے زیادہ چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے..... تو میں سوچتا ہوں کہ یہ کس قسم کی شادی ہے اور جب میں نے شادی کی تو سب کو ہم میاں بیوی سے دلچسپی تھی' ہماری چیزوں سے نہیں اور میں نے اس لیے تھوڑی دیر میں شادی کی کہ میں اپنی برادری میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس برادری میں جو مڈل کلاس کے لوگ ہیں ان کے لیے ان امیروں نے بہت پرابلمز کھڑے کیے ہوئے ہیں۔"

"اور سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکے ہی کوئی قدم اٹھائیں تو رسم و رواج ختم نہیں مگر کم ضرور ہو سکتے ہیں ..... اور آج کے پڑھے لکھے لڑکے ایسے اقدام اٹھا رہے ہیں۔"

ثنا عمران اسلم

"جی ثنا! کیسی ہیں۔ اور شادی مبارک ہو آپ کو۔"

"جی بہت شکریہ۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔"

"جی میں 15 مارچ کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ حیات ہیں۔ اللہ انہیں زندگی دے۔ ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں پنجاب کامرس کالج سے میں نے گریجویشن کیا ہے۔"

"بچپن لاہور میں ہی گزرا؟"

"میرے والد واپڈا میں کام کرتے تھے۔ ان کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی۔ سکس کلاس تک میں نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم لوگ لاہور آگئے۔ میرے والد کے انتقال کو تیرہ سال ہو گئے ہیں اور جس زمانے میں وہ واپڈا میں تھے' حالات بہت اچھے تھے۔"

"شادی کو کتنے ماہ ہو گئے ہیں اور عمران صاحب سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

"جی تقریباً" چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ ہماری شادی 13 دسمبر 2011ء کو ہوئی اور عمران سے ملاقات فیملی کے ہی ذریعے ہوئی تھی۔ جس دن وہ پرپوزل لے کر آئے تھے اس دن ہماری ملاقات ہوئی تھی یعنی جب بات پکی ہوئی تھی اس دن۔"

"اور جب پرپوزل آیا اور آپ کو معلوم ہوا کہ ایک مشہور ٹی وی اسٹار کا رشتہ آیا تو کیسا محسوس ہوا تھا۔"

"بہت اچھا لگا۔ جب معلوم ہوا کہ عمران اسلم صاحب ٹی وی پہ کام کرتے ہیں۔ اصل میں میرے والد اور عمران کے والد آپس میں بہت اچھے دوست رہ چکے تھے اور والد صاحب کے انتقال کے بعد بھی ان کے دوست سے ہمارے فیملی کے تعلقات تھے تو جانتے تو تھے ہم ایک دوسرے کی فیملی کو مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"شوبز کی فیلڈ بہت اچھی ہے مگر خطرناک بھی مشہور ہے۔ آپ کو ڈر لگتا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک تو ڈر نہیں لگتا' کیونکہ عمران بہت اچھے ہیں اور ہم ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں اور مجھے ان پر پورا اعتماد ہے۔ ان شاء اللہ زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

"آپ اس فیلڈ میں آئیں گی؟"

"نہیں بالکل نہیں' میں خالصتاً" ہاؤس وائف رہنا پسند کروں گی البتہ عمران کے کاموں میں ان کی ضرور مدد کروں گی۔ انہیں بھی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک زمانے میں تو میں خواتین ڈائجسٹ بہت پڑھا کرتی تھی اور آپ کے انٹرویوز تو میں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔"

"اور آج آپ خود اس انٹرویو کا حصہ بن گئی ہیں۔ یہ بتائیے کہ منگنی کتنا عرصہ رہی اور فون پہ گپ شپ رہتی تھی؟"

"جی فون پہ گپ شپ رہتی تھی کیونکہ 8 جولائی

2011ء کو ہمارا نکاح ہو گیا تھا یعنی منگنی والی رسم نہیں ہوئی بلکہ بات پکی ہوتے ہی نکاح ہو گیا۔ نکاح کے فوراً" بعد یہ کراچی چلے گئے تھے اور پھر رخصتی کرانے یہ دسمبر میں آئے تھے۔ اس دوران بات چیت ہوتی رہتی تھی۔"

"شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کی لائف میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تو جب فون پہ بات ہوتی تھی تو کیا محسوس کرتی تھیں آپ؟"

"فون پہ گفتگو سے آئیڈیا ہو جاتا ہے کہ بات کرنے والا کس مزاج کا ہے اور ان کے بارے میں منگنی کے بعد لوگوں سے پتا چلا کہ گھر کی لائف کو پسند کرتے ہیں اور مزاج کے بھی بہت اچھے ہیں تو ان سے گفتگو کے دوران بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا اور شادی کے بعد بھی میں نے ان کو ایسا ہی پایا۔"

"لاہور سے رخصت ہو کر آپ کراچی آئیں تو آپ کو کراچی کیسا لگا؟"

"ایڈجسٹ تو کرنا پڑتا ہے۔ جہاں میاں ہو' وہی جگہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ لاہور ایک بہت ہی بولڈ شی ہے' بہت ہی رونق والا شہر ہے۔ کراچی میں لوگ تھوڑا ریزرو رہتے ہیں اور اپنی اپنی لائف میں بزی رہتے ہیں۔ تھوڑی سی مشکل ہو رہی ہے ایڈجسٹمنٹ میں' لیکن عمران بہت کو آپریٹ کر رہے ہیں۔"

"کراچی میں دہشت گردی بھی ہے' ہنگامے بھی ہیں' ٹارگٹ کلنگ بھی ہے تو ڈر لگتا ہے۔"

"جی ڈر تو لگتا ہے کہ اللہ جانے کیا ہو گا اور لاہور میں بھی یہی سوچا کرتی تھی۔ مگر پھر تسلی تھی کہ آخر عمران بھی تو خیر سے اتنے عرصے سے کراچی میں رہ ہی رہے ہیں۔"

"سسرال کیسا لگا اور سسرال کا ماحول کیسا لگا؟"

"ماشاء اللہ سسرال والے بہت اچھے ہیں اور میری بدقسمتی ہے کہ میرے ساس سسر حیات نہیں ہیں۔ بس دو نندیں ہیں اور ایک جیٹھ ہیں' جو ملک سے باہر رہتے ہیں بس دو نندیں ہی ہیں یہاں پہ جو کہ بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے۔"

"یہ بور کے لڈو کیسے لگ رہے ہیں؟"

"جی میں سمجھتی ہوں کہ یہ وہ بور کے لڈو ہیں جو کھا لینے چاہئیں اور جہاں تک پچھتانے کی بات ہے تو یہ تو انسان پر منحصر ہوتا ہے اور میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے عمران جیسا شوہر ملا۔ یہ بہت ہی خیال رکھنے والے ہیں اور ہر لحاظ سے کو آپریٹو ہیں۔"

"کتنے رومانٹک ہیں۔ شادی کی رسمیں لاہوریوں کی مختلف اور چنیوٹ والوں کی مختلف ہوتی ہیں۔ انجوائے کیا؟"

"بہت زیادہ ہیں اور ماشاء اللہ سے چھ مہینے ہو گئے ہیں اور میں نے ان کی چاہت میں کوئی کمی نہیں دیکھی ہے۔ ہاں جی! رسمیں بہت زیادہ مختلف ہیں اور اس معاملے میں میری نندوں نے بہت تعاون کیا اور کہا کہ جیسے تم کہو گی ویسے ہی کریں گے۔ لیکن شادی بیاہ کی سب ہی رسمیں اچھی لگتی ہیں چنیوٹ برادری میں دودھ پلائی کی رسم لڑکے والے کرتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں لڑکی والے کرتے ہیں۔۔۔ مایوں مہندی کی رسمیں ایک جیسی تھیں۔"

"چنیوٹ برادری کی لین دین کی رسمیں بہت تکلیف دہ ہیں۔ جہیز بے تحاشا دینا' لڑکے کو بے اندازہ دینا۔ سونا بہت دینا۔ غریب لوگ بہت احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔"

"معاف کیجئے گا میں نے چنیوٹ برادری میں کوئی غریب نہیں دیکھا غریب سے غریب کو بھی ہم غریب نہیں کہہ سکتے۔ ماشاء اللہ بہت پیسہ ہوتا ہے ان کے پاس۔"

"پہلے دن کا عروسی جوڑا کس کی طرف سے تھا اور اس میں آپ کی پسند کا کتنا عمل دخل تھا؟"

"جوڑا ان کی طرف سے ہی تھا لیکن میں نے اپنی پسند کا بنوایا تھا اور بہت بھاری تھا۔"

"نکاح اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے؟"

"نکاح کے وقت تھوڑی گھبراہٹ تھی' جھجک تھی کہ پتا نہیں کیا ہو گا۔ پتا نہیں شادی کا فیصلہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں اور رخصتی کے وقت والدین کو چھوڑنے کی اداسی تھی لیکن عمران کی طرف سے میں بہت مطمئن تھی۔"

"عموماً" لڑکیاں پڑھائی کی وجہ سے گھر کی ذمہ داریاں نہیں سیکھ پاتیں آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا؟"

"نہیں جی۔۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری ماں نے مجھے سب کچھ سکھایا ہوا تھا۔ مجھے کوکنگ سے بہت لگاؤ ہے اور عمران کے لیے کھانا میں خود بناتی ہوں۔ عمران کو میرے ہاتھ کی چکن کڑاہی بہت اچھی لگتی ہے اور بریانی بھی فرمائشیں کر کے نہیں پکواتے بس ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اچھا کھانا ہو' چاہے کچھ بھی ہو۔ جب یہ گھر پر ہوتے ہیں تو میرے ساتھ کچن میں ضرور ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

"آپ کا موڈ خراب ہو تو عمران کی کس بات پر موڈ فوراً" ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"وہ کوئی بھی مزے واریات کر دیں تو میرا موڈ فوراً" ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میری تعریف کر دیں یا میرے پکے ہوئے کھانے کی تعریف کر دیں تو میرا موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"دونوں میں کون زیادہ فضول خرچ ہے؟"

"کوئی نہیں ہے' ہم دونوں ہی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ پیسہ کمانا بہت مشکل ہے اسے یوں اڑانا نہیں دینا چاہیے اور میں تو ویسے بھی شاپنگ پسند نہیں کرتی مجھے بہت کوفت ہوتی ہے بازاروں میں بلاوجہ گھومنے اور دکان دکان جانے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟"

"وائٹ گولڈ کا سیٹ ملا تھا اور ہنی مون میں پورے پنجاب کا ٹور کیا تھا اور کافی دن گھومتے پھرتے رہے' یہ انسان کی زندگی کے یادگار دن ہوتے ہیں۔"

"عمران آپ کو کس نام سے پکارتے ہیں اور ان کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں۔"

"یہ مجھے بیگم کہہ کر بلاتے ہیں اور اچھی عادتیں تو بہت ہیں اور بری۔۔۔ پتا نہیں کون سی ہے۔ ابھی تک تو پتا نہیں چلی ہے۔"

"بھاری زیورات' زرق برق کپڑے اور میک اپ ۔۔۔ عمران پسند کرتے ہیں؟"

"ارے نہیں۔۔۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ میرا ڈریس سمپل ہو۔ ہلکا پھلکا کاجل اور لپ اسٹک لگا لوں۔۔۔ بس اور کچھ نہیں۔"

"کمرے میں آکر عمران نے پہلی بات کیا کی تھی۔"

"انہوں نے مجھے گانا سنایا تھا کہ "کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عمران اسلم اور مسز عمران سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ماریہ زاہد

"کیسی ہیں ماریہ! آپ کو آج کل کافی ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ آپ بہت اچھی پرفارم کر رہی ہیں۔ کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"شکریہ! آپ پسند کرتی ہیں۔ کون کون سے ڈرامے دیکھے آپ نے؟"

"اچھا ـــ یہ میرا امتحان شروع ہو گیا۔ بھئی فضیلہ قیصر کے سیریل "خواب آنکھیں خواہش چہرے" "میری بہن میری دیورانی" "اعتراف" اور "خوشبو کا گھر" تمام ڈرامے بہت مقبول ہوئے اور "سنجا" بھی۔"

"جی جی ـــ واقعی یہ میری سیریلز اور سوپ بہت اچھے رہے اور آج کل کافی کام کر رہی ہوں۔"

سوپ "خوشبو کا گھر" میں تم نے ایک جوان بچے کی ماں کا رول کیا۔ کیسا لگا تھا؟ جبکہ تم تو خود کافی چھوٹی ہو؟"

"جی! میری پیدائش 31 مئی 1989ء کی ہے۔ بس جب آفر ہوئی تو ایک چھوٹے بچے کی ماں کا رول تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ میں جوان بچے کی ماں کا رول بھی کروں گی تو پہلے تو عجیب سا لگا۔ مگر پھر کر لیا کہ چلو! کوئی بات نہیں۔ ایک فنکار کا یہی امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے رول کو نبھاتا ہے۔"

"بہت اچھا نبھایا۔ بہت سوبر لگیں اس رول میں۔ آئندہ بھی کرو گی اس قسم کے رول؟"

(ہنستے ہوئے) "نہیں ـــ ابھی ایسے رولز کے لیے بہت ٹائم باقی ہے۔"

"پہلا پروگرام یا ڈراما کون سا تھا اور کس ڈرامے سے تمہیں پہچان ملی؟"

"پہلے ڈرامے میں شاید ایک ہی سین تھا۔ سوپ تھا "کاہے کو بیاہی بدیس" اور جس ڈرامے نے پہچان دی وہ جویریہ سعود کا سوپ "یہ کیسی محبت ہے" کافی لمبا چلا تھا یہ۔"

"ان سب سے متعارف کیسے ہوئیں؟"

"میں جب بی بی اے کر رہی تھی اور فیشن ڈیزائننگ کی طالبہ بھی تو ہماری یونیورسٹی میں "فیشن شو" ہوا۔ اس شو میں فیصل قاضی بھی آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک شو کے لیے آڈیشن کرنا ہے۔ تفریح تفریح میں میں نے بھی آڈیشن دے دیا۔ اتفاق سے کامیاب بھی ہو گئی ـــ پھر گھر والوں کو پتا چلا تو سب حیران بھی ہوئے اور پھر خوشی خوشی اجازت دے دی۔"

"پہلی مرتبہ کیمرہ فیس کیا تو ڈر تو لگا ہوگا؟"

"سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ چیز کیا ہے ـــ یہ بار بار ٹیکس کیوں ہو رہے ہیں ـــ تھوڑی سی کنفیوز تھی مگر پر اعتماد بھی تھی اور اس خود اعتمادی کی وجہ سے ہی تو مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔"

"انٹرنیٹ اور فیس بک سے لگاؤ ہے؟"

"سچ بتاؤں ـــ کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے اور پھر ٹائم ہی کہاں ملتا ہے کمپیوٹر پہ بیٹھنے کا۔ مصروف ہی اتنا رہتی ہوں۔"

"اس فیلڈ میں کہاں تک جانے کا سوچا ہے؟"

"بہت آگے تک جانے کا سوچا ہے مگر پلاننگ کوئی نہیں کی ہے۔ ابھی تو کام کر رہے ہیں۔ کام مل رہا ہے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ ویسے بہت آگے تک جانے کی خواہش ہے۔"

"مگر اس فیلڈ میں تھوڑی سی جیلسی بھی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"تھوڑی سی جیلسی ـــ؟ ارے! بہت زیادہ ہے۔ یہاں تو لوگ ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی بہت کرتے ہیں۔ دوسروں کی ترقی سے بہت جلتے ہیں۔"

"ایسے لوگوں سے کیا سلوک کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"نفرت ہے مجھے ایسے لوگوں سے اور میرا دل چاہتا ہے کہ تھپڑ مار دوں۔ کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو تمیز ہی نہیں ہوتی بات کرنے کی۔ میں کہتی ہوں کہ ایسے لوگوں کو کام کرنے کا حق ہی نہیں ہے جو پروفیشنل لائف کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔"

"اس فیلڈ میں رہ کر ہر وقت میک اپ سے دل گھبراتا ہے یا اچھا محسوس ہوتا ہے؟"

"دل گھبراتا ہے کیونکہ مجھے زیادہ میک اپ کرنے کا ذوق نہیں ہے۔ میں زیادہ تر سادہ ہی رہتی ہوں۔ ہاں کہیں جانا ہو کسی تقریب میں تو پھر ضرور کر لیتی ہوں۔"

"بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہو؟"

"اب بور ہونے کا زیادہ وقت نہیں ملتا کیونکہ بہت مصروف رہنے لگی ہوں' پھر بھی بور ہوتی ہوں تو میوزک سے دل بہلا لیتی ہوں یا پھر اپنی فرینڈز کے ساتھ وقت گزار لیتی ہوں۔"

"چلیں ماریہ! آپ کی شوٹ کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ پھر تفصیلی بات کریں گے۔"

نوین وقار

نورین وقار کا تعارف یہ ہے کہ انہوں نے ڈراما سیریل "ہم سفر" سے شہرت حاصل کی۔ سارہ کا رول کر کے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ان میں کافی فنکارانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔

"کیسی ہیں ـــ سارہ کے رول سے جو کامیابیاں آپ نے حاصل کی ہیں کیا امید تھی کہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھو لوں گی؟"

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ سچ پوچھیں تو مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ یہ کردار مجھے کہیں سے کہیں

بقیہ صفحہ نمبر 281

خطوط

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی، سکون اور عافیت کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سب کو اور ہمارے پیارے ملک کو سلامت رکھے۔ جو لوگ اس کی سالمیت اس کی بقا کے دشمن ہیں۔ انہیں اور ان کے ساتھیوں کو دین دنیا میں عبرت کا نمونہ بنادے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے امت العزیز شہزاد کا ہے۔ امت العزیز ابھرتی ہوئی مصنفہ ہیں۔ لکھتی ہیں۔

آپ لوگوں سے ناتا ٹوٹے تین سال ہو چکے تھے۔ زندگی نے کچھ اس طرح مصروف کر دیا تھا کہ اپنے لیے بھی وقت نکالنا محال تھا۔ نامعلوم کیسی تھکن اور بے دلی طاری تھی بہرحال آج ایک ایس ایم ایس ملا اور اگر یہ ایس ایم ایس مجھے نہ ملتا تو شاید میں آپ سے دوبارہ تعلق استوار نہیں کر پاتی۔ آپ بھی پڑھیے۔

کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ واقعی ابوالکلام آزاد نے یہ کہا تھا؟ اور نہ صرف مولانا بلکہ آج کل متواتر اسی طرح کے ایس ایم ایس مختلف اکابر کے حوالوں کے ساتھ گردش میں ہیں۔ ایسے پیغاموں کا آخر کیا مقصد ہے؟

رفعت ناہید سجاد آج کل جو ناول لکھ رہی ہیں اس میں بھی کہیں کہیں ایسی ہی پراسرار سازشوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ ایس ایم ایس ان ہی سازشوں کی ایک کڑی تو نہیں؟

امت العزیز! یہ ایس ایم ایس ہمیں بھی ملا ہے۔ آج کل مسلسل گردش میں ہے۔ اس ایس ایم ایس کے ذریعے مختلف قومیتوں کو برا بھلا کہہ کر پاکستان میں باہمی نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ایک چینل سے پروگرام پیش کیا گیا جس میں ابوالکلام آزاد کی تقریر کے کچھ حصے پیش کیے گئے اور یہ پروگرام مختلف کیبلز پر دن میں پچیس تیس بار دہرایا گیا۔

دراصل کچھ لوگ نظریہ پاکستان اور پاکستان کے قیام کو غلط ثابت کرنے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لیے اس قسم کی حرکتوں میں مصروف ہیں۔ اس کے پس پشت ان کی کیا نیت ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ اس کے قیام، اس کی بنیاد اور اس کے وجود کے متعلق جو چاہے کہہ سکے۔

قیام پاکستان کے 65 سال بعد اس بحث کو چھیڑنا کہ پاکستان صحیح بنایا غلط..... ؟ یہ سوال ہی بے مقصد ہے۔

کیا پاکستان کے علاوہ ہمارے پاس کوئی جائے پناہ ہے؟

انڈیا میں مسلمانوں کے حالات، ان کی بے پناہ غربت اور زبوں حالی پر نظر ڈالیں۔

گجرات میں سینکڑوں مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا جس میں ان کے وزیر اعلا نریندر مودی نے کھلم کھلا حصہ لیا۔ (واضح رہے یہ ان کی اپنی عدالت نے فیصلہ دیا ہے اور نریندر مودی کو مجرم ٹھہرایا ہے۔) احمد آباد میں بیس ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان کی دکانیں اور گھر جلا دیے

۔ ان کا قصور صرف اس قدر تھا کہ وہ کاروبار میں وہاں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بابری مسجد کی شہادت کیا یہ سب ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں۔

اختر حسین رائے پوری مشہور دانشور اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔

"پاکستان ناگزیر تھا۔ ہندو مسلمانوں سے شدید تعصب رکھتے تھے۔ وہ انہیں جگہ دینے کو تیار ہی نہ تھے۔ مسلمانوں کی بقا کے لیے پاکستان کا قیام ضروری تھا۔"

شازیہ نیاز احمد مغلانی نے کوئٹہ کینٹ سے لکھا ہے

کاش میرے بس میں ہوتا تجھ سے غافل ہو جاتا
ہم بھی سکوں سے رہتے بے خبر تیری طرح

جی کچھ ایسا ہی حال میرا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ نے کسی سلسلے میں میری کوئی چیز شائع نہیں کی۔

سب سے پہلے ثمرہ جی کو مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔ اس کے بعد سائرہ رضا کا بھی ٹھیک تھا۔ افسانوں میں بیسٹ افسانہ بشریٰ احمد کا تھا سلسلے وار ناول دونوں بہترین جارہے ہیں۔ سونیا نوید کا ناول مجھے بالکل پسند نہیں آیا مجھے پہلے پتا تھا اینڈ ایسے ہوگا بندھن میں فائق خان اینڈ ثانیہ کا بہت اچھا تھا سائرہ رضا کے بھائی کا شادی احوال پڑھ کر کافی ہنسی آئی۔ سائرہ جی مزاحیہ ناول بھی لکھیں۔ باقی تمام سلسلے بھی ٹھیک تھے۔ فائزہ کے ناول کا انتظار رہے گا۔

پیاری شازیہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے چھ ماہ کے دوران آپ کی کوئی بھی تحریر شامل نہیں ہوئی اور آپ نے انتظار کی کوفت اٹھائی ——— آپ شعاع سے غافل نہیں ہوسکتیں تو آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم آپ کے بغیر سکون سے رہ سکتے ہیں۔ آپ کی رائے، آپ کے خطوط، آپ کی محبتیں ہمیں بے حد عزیز ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

پچھلے ماہ یمنیٰ زاہد نے سائرہ رضا کے افسانے پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ سائرہ رضا نے ان کے جواب دیے ہیں۔ لکھتی ہیں

ہماری یمنیٰ زاہد! سب سے پہلے تو اس بات کا بے حد شکریہ کہ آپ نے کہانی کو بہت اچھی یا بہت بری کہہ کر سائیڈ میں نہیں رکھا۔ آپ کو اندازہ نہیں "چھپی" ہوئی قسم مصنف کی لکھی تحریر کا آدھا حصہ ہوتی ہے۔ کسی بھی قسم کا قابل اعتراض مواد ہماری اجازت کے بنا ہی حذف کر دیا جاتا ہے بعض اوقات تو لکھاری سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔

آپ کے اعتراضات اور تنبیہہ کے جواب میں۔

ملتانی مٹی صحت کے لیے نقصان دہ ہے یا نہیں۔ یہ ایک الگ سوال ہے یہ افسانہ زچہ بچہ کی صحت و خوراک پر نہیں لکھا گیا تھا نہ ہی وجیہہ پیرزادہ اپنی بٹی کو کوئی نیوٹریشن پلان دے رہی تھی۔ وہ اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان کے گھرانے کا معاشرے میں ایک خاص اسٹیٹس اور مقام ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس مقام کا خیال رکھا ہے "بطور مثال انہوں نے کہا کہ ملتانی مٹی دل چاہنے کے باوجود انہوں نے اس لیے نہیں کھائی کہ لوگ انہیں ملتانی مٹی کھاتا دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ (ملتانی مٹی کھانا صحت کے لیے مفید ہے یا مضر ایک الگ سوال ہے، یہاں اس کے بارے میں لکھنے کا کوئی محل نہیں تھا)

حمل کی آزمائشوں اور احمقانہ فرمائشوں والے پیریڈ سے میں خود تین بار گزری ہوں مگر میں خود کو ایسا کرنے سے روک دیتی کہ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔

علاقائی اور مادری زبان کو میں برا کہہ ہی نہیں سکتی مقصود تو یہ دکھانا تھا کہ میر اپنے والد کا کتنا تابعدار ہے کہ باپ کی آواز سنتے ہی وہ گردو پیش سے بے گانہ ہو گیا۔

مادری زبان کا ذکر اس لیے کیا کہ ظاہر کرنا تھا انبساط کو جس ماحول میں جانا ہے، وہاں کی زبان، کلچر اور ماحول بالکل مختلف ہے اور میر اپنے باپ کا ایک تابعدار فرزند ہے۔ کل اگر کوئی ایسی نوبت آتی ہے کہ انبساط اس ماحول میں ایڈجسٹ نہ ہو سکی تو وہ اپنے روایتی روپ میں ہوگا جہاں صرف "اصل" رہ جاتا ہے۔ باپ کا انکار اور ناپسندیدگی تو فطری تھی..... کہ اپنی زبان، اپنے خاندان اور اپنے ماحول میں ہی رشتے کرنا ہماری اولین ترجیح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے وہاں انبساط کی قبولیت آسان نہ ہوتی اور انبساط کے والد اس کو متوقع مشکلات سے بچانا چاہتے تھے۔ لکھنے والا دراصل ایک ترجمان ہوتا ہے جو ہر کردار کی زبان بولتا ہے اور اب سب سے اہم اعتراض جس نے میرے قلم کو لڑکھڑا دیا ہے کیا ہم صبر ایوب اور گریۂ یعقوب کی مثال

نہیں دیتے۔ آپ نے وہ شعر نہیں سنا۔

تیری یاد میں ہم نے کیا کیا نہ کیا
صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

کیا حسن کی مثال دیتے ہیں تو ہم "یوسف ثانی" کہہ کر قصہ مختصر نہیں کر دیتے۔ مزید الفاظ کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کیا نمرود کی آگ دہکانا ممکن ہے؟ کیا صبر ایوب کیا جا سکتا ہے؟ مگر یہ شاعرانہ تعلی ہے۔

ہم مثال دینے کو "انتہا بتانے کو" "اس جیسا" کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔

"سیب اور چھری تھما کر محفل سجائی جاتی تو سحر زدگی کے عالم میں کئی انگلیاں کٹ جاتیں۔"

ہر دور، ہر معاشرے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والی عورت من پسند حسین مرد کو دیکھ کر ہوش و خرد سے بے گانہ ہو سکتی ہے۔ یہ نظام قدرت اور جنس مخالف کی کشش ہے کوئی بھی عورت کب زلیخا بن جائے، یہ کہنا مشکل ہے۔

حرمت ردا اکرم نے ڈلوال سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سرورق پر خوب صورت کلر کے ساتھ بہترین ڈیزائن اور پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ اچھا سا پوز۔ سو تو ہم تو دل پکڑ کر ہی بیٹھ گئے۔ سائرہ جی کے قلم سے ان کے پیارے ویر کی شادی کا احوال پڑھا۔ بہترین پیرائے میں لکھا ہے انہوں نے خصوصاً "اینڈ پسند آیا کیونکہ وہ بھی شاید ہماری طرح نئی نئی دور زن ہیں۔ "جنت کے پتے" کا تو اتنا انتظار تھا سو ایک ہی نشست میں پورا کیا۔ تمام واقعات کو جس خوب صورت پیرائے اور تسلسل میں بیان کیا وہ صرف اور صرف "نمرہ جی" کا ہی کمال ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ احمد "لے آر پی" ہے کبھی لگتا ہے کہ جہان ہو گا مگر اب پھر پورا مہینہ سولی پر لٹکنا پڑے گا۔

"سائرہ رضا" کا "تیسری محبت" پڑھا تو بے ساختہ زبان سے زبردست نکلا۔ افسانے سارے ہی بہترین تھے۔

پیاری حرمت! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سحر خان نے کوئٹہ سے لکھا ہے

"یقین کیجیے ہمیں انتیسویں روزے کو عید کا چاند نظر آ گیا" ذرا ٹھہریے یہ کسی سوال نامے کا جواب نامہ نہیں، یہ بہنوں کی بزم میں ہماری شرکت ہے۔ پرچا ہمیشہ کی طرح پانچ تاریخ کی شام ہی کو مل گیا، اب ظاہر ہے جو لایا ہے پہلا حق اس کا پھر اسی کے بعد ہماری باری تو ہم تو یونہی ہمیشہ کی طرح پرچے سے چپکے فہرست چیک کر رہے تھے اچانک سنیعہ (چھوٹی بہن) بول پڑی۔ "سنیعہ زاہد نام تو ہمارا ہے ہائے کہیں افسانہ بھی تو ہمارا ہی نہیں۔"

تحت جذباتی منظر ارے "سحر ہمارا ہی ہے "امی" "بجا بھی" بھائی سب آ کر دیکھو ہمارا افسانہ شائع ہوا ہے "امی" امی۔"

جی جی قارئین یہ جو سنیعہ زاہد جس کا افسانہ شائع ہوا ہے، یہ ہماری بہن ہیں اور اس طرح انہوں نے اپنی خوشی اور پہلی کامیابی کا اظہار کیا یقین جانئے! اب ہمیں پتا لگا ہفت اقلیم کی دولت ملنا کسے کہتے ہیں۔

اب ذرا پرچے کے باقی سلسلوں کی طرف چلتے ہیں، عالیہ بخاری صاحبہ مجذا! ہمیں تو آپ سے عشق ہو چلا ہے ناول روایتی ہی سہی مگر آپ کی منظر نگاری اور خاص طور پر کرداروں کا تال میل ناول کی کامیابی کا بڑا سہرا ہے۔ کیا جملے کیا تاثرات اور کیا جذبات گویا ایک کے بعد ایک موتی پروتی ہوں مالا میں۔ ایک رائے ضرور دوں گی (اگرچہ ہم کیا اور ہماری رائے کیا) مگر زری کے لیے راجو مناسب ہو تو ہو مگر خیام قطعی نہیں (آپ تو سمجھتی ہیں نا عالیہ جی) آمنہ ریاض بے حد معذرت کے ساتھ بے معنی تجسس نے کہانی کا رنگ پھیکا کر ڈالا اور بہت سے اہم کرداروں کا منظر سے غائب ہو جانا کہانی کو مزید بے رنگ کیے دے رہا ہے۔

"نگہت سیما جی" ہم لاکھ برے آپ تو بہت اچھی ہیں پھر کیا وجہ ہوئی آپ کی طویل ترین غیر حاضری کی، کچھ بھی نگہت جی۔

آ جائیے کہ آپ کو ترسے ہے اب نگاہ
دیکھا نہیں ہے ہم نے بہت دن گزر گئے

ٹلی ویژن کو پیاری اور ہماری آنکھوں کی تاری عمیرہ صاحبہ! آپ نے تو ہمیں پل میں پرایا کر دیا، بتائیے آخر کیا قصور ہے ہمارا۔

سحر! سنیعہ باصلاحیت ہے آگے جا کر بہت اچھا لکھ سکتی ہے لیکن صلاحیت تو آپ میں بھی بہت ہے۔ ایک ناولٹ لکھ کر آپ خاموش کیوں بیٹھ گئیں۔ سحر! ہمیں آپ کے بارے میں پورا یقین ہے، آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں، صرف کہانی پر تھوڑی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم اس کالم میں بارہا لکھ چکے ہیں کوئی ایک تحریر شائع نہ ہو تو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ مسلسل کوشش ہی کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے کا راستہ ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ نگہت سیما کا ناول ان شاء اللہ جلد پڑھ سکیں گی۔

فاریہ بتول نے لالہ موسیٰ سے لکھا ہے

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور پیارا۔ نعت اور حمد تو اپنے نام ہی کی وجہ سے بہت پیاری ہو جاتی ہیں۔ ناولوں میں سب سے پہلے بات کروں گی نمرہ احمد کے ناول "جنت کے پتے" کی۔ میرا موسٹ فیورٹ ناول اور شعاع کی جان۔ میرا شک بالکل درست نکلا، حیا کو پھول بھیجنے والا نامعلوم اجنبی عبدالرحمٰن پاشا ہی ہے۔ اگر میجر احمد "پنکی" ہے تو پھر "ڈولی" "یقیناً" ہاشم ہی ہو گا جو حیا کو پھول اور کارڈ بھیجتا ہے۔ اب میجر احمد کا پتا نہیں لگ رہا کہ وہ کون ہے۔ کہیں وہ ہی تو پاشا نہیں ہے۔ اب نمرہ کا سسپنس نمرہ ہی جانیں۔ ہمارے پاس ان جیسا ذہین دماغ نہیں ہے۔ بس ان کے لیے یہی کہوں گی کہ "ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو آپ کی تحریر کا حق ادا کر سکیں۔ اب دوسرے ناول "تجدید وفا" کی بات کروں گی۔ سونیا نوید رائٹرز میں ایک نیا اور خوشگوار اضافہ۔ اس کا اینڈ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا جیسا سونیا نے کیا۔ ویلڈن سونیا! "تیسری محبت" اپنے نام کی طرح ایک منفرد اور پیارا ناول۔ "صباحت یاسمین" کو پہلی دفعہ شعاع میں شرکت پہ خوش آمدید۔ آخر ہمارے ہمسائے شہر سے تعلق ہے ان کا۔

پیاری فاریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پہلا خط شائع نہ ہو سکا۔

نمرہ احمد کی کہانیوں میں کون سا کردار کب کیا رخ اختیار کر جائے اس کے بارے میں اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ کے اندازے کس حد تک درست ثابت ہوتے ہیں۔

ستارہ اینڈ مہک گاؤں موہری شریف

السلام علیکم!

اکثر قارئین یہ شکایت کرتی ہیں کہ شعاع کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا تو ان سے ہم یہ ہی کہیں گے اگر شمارے میں صرف خیام والی کہانی (دیوار شب) ہی چلتی رہے تب بھی شمارہ جان دار ہے۔ بات کریں نمرہ احمد کی تو "مجھی از دی بیسٹ" کبھی وہ افق ارسلان کے ساتھ ہمیں راکاپوشی پر لے جاتی ہے تو کبھی تحمل آغا کے ساتھ قرآن پاک کی تفسیر پڑھواتی ہیں اور اب تو سبانجی یونیورسٹی بھی لے گئی ہیں اور ہر قسط کا اینڈ ایسے کرتی ہیں کہ ہماری دھڑکن بھی رک جاتی ہے کہ پتا نہیں اب آگے کیا ہونے والا ہے اور باقی سب سلسلے بھی اچھے تھے۔

شاہین رشید نے نومبر 2009ء کے شمارے میں پی ٹی وی کی کچھوے کی رفتار کے بارے میں لکھا تھا۔ اور اب یقین مانئے ہمارے محلے میں وہ تمام گھر جہاں سے اسٹار پلس اور سونی کے ڈراموں کی آواز آتی تھی اب وہاں سے بھی پی ٹی وی کے انوکھا لاڈلا کے حمیدو (سلیم شیخ) اور میں ڈراما کے چوہدری بابر (بابر علی کے ڈائیلاگ سنائی دیتے ہیں سو شاہین آپی اب پی ٹی وی کی خرگوش کی رفتار کے بارے میں ضرور لکھیے گا ہم پی ٹی وی کی فین ہیں اور رائٹرز سے گزارش ہے کہ جب ہماری ٹیم میچ ہارتی ہیں تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن ایشیا کپ میں جیت کے بعد کسی رائٹر نے تحریر نہیں لکھی۔ پلیز ثمینہ عظمت علی سے "جیو تو ایسے" یا "دی رول دی ورلڈ" جیسی تحریر لکھوائیں۔

ستارہ اور مہک! اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ میں لوگوں کو اسٹار پلس کا جنون ہوا کرتا تھا۔ ان ڈراموں میں جو لباس اور جیولری استعمال ہوتی تھی، فیشن بن جاتی تھی۔ لیکن اب ہمارے چینلز سے بہت اچھے ڈرامے آ رہے ہیں اور انہوں نے ناظرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے اور مقبولیت میں اسٹار پلس کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس میں ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی مصنفین کا بڑا حصہ ہے۔ زیادہ تر خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں شائع ہونے والی تحریریں ڈرامائی شکل میں پیش کی جا رہی ہیں اور بے پناہ پسند بھی کی جا رہی ہیں۔

ثمینہ عظمت تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

نبیلہ اسلم نے اٹک گاؤں بامیر سے لکھا ہے

مئی کا ٹائٹل بہت پسند آیا' سب رائٹر بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے شعاع بہت دیر سے ملتا ہے اس لیے تبصرہ نہیں کر سکتی کہانیاں ساری ہی بہت اچھی تھیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ احسن خان کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔

پیاری نبیلہ! آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے' تھوڑا انتظار کرلیں گے۔ اٹک کے ایک گاؤں میں رہنے کے باوجود آپ لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صالحہ اور اقصیٰ نے میرپور آزاد کشمیر سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین دونوں ہی رسالے ہمیں تاخیر سے ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ہم جلدی جلدی دونوں میں پڑھ کر خط لکھنے کی کرتی ہیں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ لیکن جناب خط شائع ہونا تو دور کی بات ہمارے انتخاب تک کو ذرا سی جگہ نہیں مل پاتی۔ خیر جناب ہم تو باوفا ٹھہرے' تمہیں تلاش کسی بے وفا کی تھی۔

سب سے پہلے بڑھے ستارہ شام کی طرف مگر یہ کیا آمنہ جی! اتنے تھوڑے صفحے کہانی ؟ ابھی شروع کی ابھی ختم پلیز صفحات بڑھا دیں۔ مستقیم بھئی تو زری کے چچا ہیں جبکہ وہ انہیں تایا کہتی ہے۔ دیوار شب میں معاذ کے ذہن میں زری کے لیے جو لڑکا آئے گا وہ خیام ہو گا۔ لیکن ہمارے خیال میں خیام کو ربیعہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

سب سے بیسٹ ناول نمرہ احمد کا ہے۔ نمرہ احمد جب بھی آتی ہیں۔ ایک نیا موضوع لے کر آتی ہیں۔ ان کی کردار نگاری اور منظر نگاری ایسی خوب صورت ہوتی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو کرداروں کے اردگرد محسوس کرتا ہے۔ تجدید وفا کا بھی اینڈ اچھا ہو گیا ہے۔ عرشی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ام مریم کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ ثانیہ جیسی لڑکیاں خود اپنے لیے گڑھا کھود کر سزا کا انتخاب کرتی ہیں' سائرہ رضا کا ناول بھی اچھا تھا۔ خاص طور پر عروہ کے دلائل بڑے متاثر کن تھے۔ افسانوں میں کھیل تماشا سب سے اچھا رہا۔ بلاعنوان' نصیحت آمیز کہانی تھی اور راز خود نوشی بھی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ تلافی بھی اچھا تھا۔ رخسانہ نگار سے کوئی سلسلے وار ناول لکھوائیں۔

صالحہ اور اقصیٰ! رخسانہ نگار ہماری بھی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ شعاع میں آپ جلد ہی ان کا ناول پڑھ سکیں گی۔

دیوار شب کے بارے میں اس ماہ ہمارے قارئین کی اکثریت نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ زری کی شادی عالیہ بخاری خیام سے کرائیں گی اور حیرت انگیز طور پر تمام قارئین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بے جوڑ شادی ہے اور اسے ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔ عالیہ بخاری طے کر چکی ہیں کہ ناول میں خیام کی شادی کس سے ہو گی اور وہ اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کا فیصلہ کیا ہے' یہ جاننے کے لیے آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس ماہ کی قسط میں آپ جان لیں گی۔

مبین نے نوشہرہ سے لکھا ہے

میں شعاع' خواتین اور کرن کی باقاعدہ قاری ہوں لیکن پرچے لیٹ ملنے کی صورت میں میں تبصرہ کرنے سے محروم رہتی ہوں۔ آپی پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں' میں پرچہ سالانہ لگوانا چاہتی ہوں' مجھے طریقہ اور پیسے بتا دیں' یہاں دور دور نزدیک ایک ہی شاپ ہے جس سے ڈائجسٹ ملتے ہیں اور وہ دکان دار پرچے دینا نہیں چاہتا' لا کر رکھ لیتا ہے لیکن دیتا نہیں جب تک نیا شمارہ نہ آجائے آپ کے تینوں پرچے میرے لیے بہت ہی زیادہ سکون کا باعث ہیں۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی جب پاس نیا شمارہ پڑھنے کے لیے کچھ نہ ہو تو ایک عجیب سی ٹینشن رہتی ہے آپ پلیز پلیز ان پرچوں کو 15 روزہ کر دیں آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ اور عفت سحر جی پلیز 8 یا 9 قسطوں کا طویل ترین ناول لکھیں۔ پلیز اور نبیلہ جی آپ بھی پلیز پلیز اتنا ہی لمبا لکھیں۔

مبین! آپ تینوں پرچوں کی سالانہ خریداری کے لیے 600 روپے فی پرچہ کے حساب سے 1800 روپے منی آرڈر کر دیں۔ آپ کو گھر بیٹھے پرچے ملتے رہیں گے۔ پرچوں کو فی الحال 15 روزہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

عائشہ نے ٹنڈو محمد خان سے لکھا ہے

سب سے پہلے ٹائٹل بہت پیارا بہت اچھا لگا۔ دو مہینے سے ٹائٹل بہت اچھا دے رہے ہیں آپ۔ نمرہ نے لفظوں پہ اپنی گرفت مضبوطی سے تھامی ہوئی ہے مگر کچھ

کچھ جگہ فلمی فلمی سا لگا ناول۔

"آئینہ خانے میں" تبصیر نشاط گھر بیٹھے تبصرہ کرتی ہیں یا آپ کے آفس میں بیٹھتی ہیں؟ پروفیسر معیز حسین کا انٹرویو شائع کریں۔ 1997ء میں نگہت عبداللہ کا "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" شائع ہوا تھا۔ مگر مجھے مہینہ یاد نہیں کوئی بہن بتا دے پلیز کہ کس مہینے میں شائع ہوا تھا؟

عائشہ! نگہت عبداللہ کا ناولٹ "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" 1997ء میں نہیں نومبر 1998ء میں شائع ہوا تھا۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ تبصیر نشاط آفس میں ہمارے ساتھ کام کرتی ہیں۔ پرنٹنگ کی غلطیوں کے لیے معذرت ہم پوری احتیاط سے کام کرتے ہیں مگر کبھی کبھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔

ثمینہ ریاض' روبینہ تنویر' سائرہ منیر احمد اور مریم منیر نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اس ماہ کا ٹائٹل ــــ مشکل مرحلہ یہی ہوتا ہے کیا کہیں کچھ برا نہ لگ جائے کیا ہی اچھا تھا جو ماڈل اپنے بالوں کو دوپٹہ بنانے کے بجائے "اصلی دوپٹا" لے لیتیں' (چاہے ہلکا سا ہی)

لیٹر لکھنے کی وجہ صرف اور صرف "نمرہ احمد" ہیں۔ اف! کیا خوب لکھا ہے نمرہ جی نے۔ ہم تو اش اش کر اٹھے۔ حیا کی خوب صورتی' بڑی آنکھیں اور لمبے بال' کیا کہیں کہ کتنا دل کرتا ہے اسے دیکھنے کا' کہانی کا انت جاننے کا انتظار ہے۔ ہم عجیب ہیں آپی' جب کہانی چل رہی ہو تو اس کا اینڈ جاننے کا شوق ہوتا ہے اور جب آخری قسط پڑھ لوں تو دل اور بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ اب آئندہ ماہ یہ تحریر نہیں ہوگی شعاع میں..... "اک نئی سنڈریلا" کا بے صبری سے انتظار ہے۔ سندس جبیں کا "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" بھی یاد رہنے والی تحریر ہے اور نایاب جیلانی' عنیزہ جی' راحت آپی' تنزیلہ ریاض یہ سب کہاں غائب ہو گئیں یار۔ ان سے لکھوائیں ناں آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" بہت سلو چل رہا ہے اور دلچسپی بھی ختم ہو رہی ہے عالیہ جی تسی تے گریٹ ہو۔ بہت مزے کا ہو گیا ہے ناول اور دلچسپی برقرار لیکن عالیہ جی پلیز زری کے لیے خیام کو منتخب مت کیجیے گا خیام اور ربیعہ ہی جچیں گے اور معاذ اور جویا کو ملوا دیں اور سلمان اور آیا گل کو سبق ضرور دلائیں۔

اب اظہر حسین اور علی ظفر کی فرمائش بھی چھوڑ دی انٹرویو کی! (وہ بھی خوشی خوشی) رضی ہے آپ کی!

ثمینہ' روبینہ' سائرہ اور مریم! ہمیں یہ جان کر شدید حیرت ہوئی ہے کہ آپ نے چار خط لکھے اور ایک خط بھی شائع نہیں ہوا' یہ تو ممکن ہے ایک یا دو خط شائع نہ ہو سکیں لیکن آپ کے چار خط شائع نہیں ہو سکے۔ اس کا ہمیں بہت افسوس ہے اور حیرت بھی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی رائے اور عالیہ بخاری تک آپ کے مشورے ان سطور کے ذریعے پہنچائے جا رہے ہیں۔ دیوار شب اختتامی مراحل میں ہے۔ اطمینان رکھیں عالیہ بخاری یقیناً" قارئین کے جذبات کا خیال رکھیں گی۔

لاہور سے نوشین سحر نے لکھا ہے

کم از کم سترہ سال سے خواتین اور شعاع کی خاموش قاری ہوں۔

ہر مہینے شعاع دیر سے اور خواتین جلدی مل جاتا ہے اب کی بار الٹ ہو گیا اور پہلے شعاع ہاتھ میں آ گیا۔ بے صبروں کی طرح نمرہ احمد کا نام ڈھونڈ کر "جنت کے پتے" نکالا۔ نمرہ جی! دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ گھر بیٹھے آپ نے دنیا دکھا دی۔ پہلے مصحف اور اب جنت کے پتے۔

"ستارہ شام" کی رفتار تھوڑی سی بڑھی ہے۔ الجھے ہوئے رشتے اب سمجھ میں آ رہے ہیں تو مزا آ رہا ہے۔ ایک مزے کی بات بتاتی ہوں۔ سائرہ رضا کا نام دیکھ کر ناول شروع کر لیا اور جب اختتامی صفحے پر پہنچی تو دل نے کیا ہو نہ ہو ناول کا نام "تیری محبت ہے اور پھر چیک کیا تو خود ہی کندھے پر تھپکی دے لی (اپنی ذہانت پر) اور ہاں! سائرہ جی مجھے پتا نہیں تھا آپ شادی شدہ ہیں۔ میرے تصور میں تو آپ کے نام سے ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی کا تصور ابھرتا ہے (یاد رہے شادی شدہ لڑکی کے زمرے میں نہیں آتی) از خود نوٹس ایک بونگی سی تحریر تھی۔ صباحت یا...... نہیں! یہ کیا کر دیا آپ نے سچی دل ڈوب گیا آپ کی تحریر سے بہت خوب صورت تحریر۔ مسافر اور شہ نشین کچھ تھکن سی ہو گئی تھی پڑھ کر۔ وہ محتسب ہے اچھی تحریر تھی پر کچھ کمی سی محسوس ہوئی۔

تجدید وفا کے اختتام نے دل کو اندر تک ٹھنڈا کر دیا۔

دعا جی بہت شکریہ اس خوب صورت تحریر کے لیے۔ تبصیر نشاط کے آئینہ خانے میں سب مزے کا تھا۔ موسم کے پکوان..... مجھ سے بہتر جانتی ہیں آپ شاعری اور دور آل کمال کی تھی۔

پیاری نوشین! اتنی طویل خاموشی؟ خواتین کے لیے تو مشہور ہے کہ وہ خاموش رہ ہی نہیں سکتیں۔ سترہ سال میں کسی بھی تحریر نے آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور نہیں کیا۔ اتنا طویل ساتھ نبھانے کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

اقرا عروج اور ام سمیعہ نے فتح پور سے لکھا ہے

مئی کا شمارہ ملا' پڑھ کر خوشی ہوئی اس بار بھی تمام افسانے ناولٹ اور ناول اچھے تھے۔

اقراء اور سمیعہ! شعاع میں خط لکھا' بہت خوشی ہوئی لیکن اتنے مختصر خط میں مزا نہیں آیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

گجرات سے سدرہ اشرف لکھتی ہیں

خط لکھنے پر جس نے مجبور کیا ہے وہ ہے "نمرہ احمد" جی ہاں! نمرہ احمد کی تحریریں اس قدر معلوماتی' دلکش و دلچسپ ہوتی ہیں کہ انسان پڑھتے ہوئے کہیں اور متوجہ ہی نہیں ہو سکتا۔

ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک مکمل شعاع شعاعیں بکھیرتا رہا۔ تمام رائٹرز کی کوشش زبردست تھی اور "دیوار شب" اور "ستارہ شام" کے بارے میں تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ لاجواب۔ "تجدید وفا" بھی بہت پسند آیا۔

نایاب جیلانی سے لکھوائیں۔ کنیز نبوی کہاں ہیں۔ انہیں ڈھونڈیں اور ان سے دوبارہ عشق میں گندھی ہوئی شاہ بھٹائی کی کافیوں سے بھری ہوئی تحریر لکھوائیں۔

شعاع کا سب سے زیادہ اچھا سلسلہ مجھے "تاریخ کے جھروکے" لگتا ہے کیونکہ مجھے بھی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔

سدرہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ السانہ للصاحہ؟ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ فوراً" بھجوائیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کنیز نبوی تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

اقصیٰ مریم' اسوہ مریم کاسی اسٹریٹ کوئٹہ سے لکھتی ہیں

مجھے اور اسوہ کو تمام سلسلے بے حد پسند آئے۔ سلسلے وار ناولز کے حوالے سے عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض بہت خوب صورتی کے ساتھ لکھنے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ ویل ڈن۔ مکمل ناولوں کی بات ہو اور "نمرہ احمد" کا ذکر نہ ہو۔ ایسا کہاں ممکن ہے۔ ہر قسط میں ایسا سسپنس قائم کیا کہ جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ناولٹ اچھے تھے۔ سونیا نوید نے اینڈ انتہائی حیرت انگیز کیا۔ افسانوں میں آمنہ مفتی بازی لے گئیں۔ آپی "آمنہ زریں" کہانیاں کیوں نہیں لکھتیں پلیز ان سے کچھ لکھوائیں۔

اقصیٰ اور اسوہ! آپ کا خط تاخیر سے شائع ہوا' اس کے لیے معذرت' شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شمع مسکان نے جام پور سے لکھا ہے

سب سے پہلے "تجدید وفا" پڑھا۔ اچھا کیا۔ عرشی کو اپنا بویا کاٹنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کی ماں کو ایک مرتبہ پھر اس سے ملانا تھا۔ کوئی پچھتاوا' کوئی ملال اس کا انت ہوتا۔ ویسے اینڈ بہت اچھا تھا۔ "جنت کے پتے" اف! نمرہ جی۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم خود ترکی کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آمنہ مفتی کا افسانہ "مسافر" الجھنوں میں گھرا۔ عالیہ جی پلیز پلیز زری کو خیام سے مت ملانا۔ ہمیں بہت افسوس ہو گا۔ خیام کی جوڑی اب صرف ربیعہ سے ہی جوڑنا۔ آئی مین ملانا۔ اور یہ جویا کے اوپر بھی کچھ ترس کھائیں۔ آمنہ ریاض کے ناول کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ آنٹی پلیز' شاہد آفریدی اور حماد اعظم کا انٹرویو بھی شائع کریں پلیز۔

شمع! شعاع پر تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ قبول کریں۔ آپ کی فرمائشیں نوٹ کرلی گئی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

☼

عالیہ بخاری

دیوارِ شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا ذریعہ حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ نگینی آپا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھرم ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دُعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

قسط: ۵۲

ایک بار تو زویا کو ایسا ہی لگا جیسے اس نے سننے میں کچھ غلطی کی ہے۔ مگر ان سب کے خوشی سے کھلتے چہرے اس آدھی ادھوری بات کی بڑی واضح تائید کر رہے تھے۔

"کیا کہا تھا آپ نے ابھی' کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟" اس نے پھر بھی اپنے دل کی تسلی کے لیے آپا گل سے تصدیق چاہی تو وہ کچھ جھنجلا سی گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے زویا؟ ڈاکٹری کیا پڑھ رہی ہو' تمہارے تو ہوش و حواس جواب دینے لگے ہیں' کالج میں کیا خاک لیکچر سنتی ہو گی' جب یہاں گھر میں ایک چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

ساری بات میں اب بھی اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ اب بھی ہونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔

آپا گل مڑ کر چمک دار ریپر میں لپٹے ہوئے مٹھائی کے ڈبوں کو بڑے سارے اس شاپر میں دوبارہ جمانے لگیں۔ جس میں سے ابھی انہوں نے نکال کر میز پر رکھے تھے۔

"اکبر خود جوا کر لائے ہیں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ کلو گلاب جامن ہے ان دو کلو کے ڈبوں میں' اب بھلا کوئی تول کر تو دیکھنے سے رہا کہ مٹھائی چار کلو ہے کہ تین' بس تاثر اچھا پڑنا چاہیے' اصل بات تو یہ ہے۔"

ان کے لہجے اور چہرے پر بڑی فخریہ سی چمک تھی۔ زویا کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ آگئی۔

"اندازہ لگانے کے لیے تولنا کیا ضروری ہے آپا گل! لوگوں کی آخر آنکھیں بھی تو ہوتی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" انہوں نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا تو زویا نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

"کچھ نہیں' میں تو صرف اس سب کا سبب ہی پوچھ رہی تھی آپ سے۔ اتنی فراخ دلی ایک مدت بعد دکھائی ہے آپ نے۔"

"طعنے دینے میں تم' سلمان اور جویا تینوں ایک ہو' ذرا بھی جو فرق ہو' یہ تو میری ہی ہمت ہے جو تم لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر بھی تمہاری بھلائی کا سوچتی رہتی ہوں' پریشان ہوتی ہوں تمہارے لیے۔ وقت اور پیسہ دونوں ضائع کرتی ہوں' ورنہ مجھے کیا پڑی تھی یہ سب کرنے کی۔ بھلے سے جویا ساری عمر نوکری کرتی رہے۔ یوں ہی غلامی کرتے زندگی گزر جائے اس کی۔" وہ گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"آرام سے' یہ کرسی بھی اب جواب دینے والی ہے۔" زویا نے بے ساختہ ہی انہیں یاد دلایا۔ تو وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑیں۔

"یہاں رکھا ہی کیا ہے خستہ حالی کے سوا' خیر تم بتاؤ' تم چل رہی ہو ہمارے ساتھ جویا کی سسرال یا نہیں؟" ان کی لش پٹش تیاری اور مٹھائی کے ڈبوں کا راز اس بار اور بھی واضح ہو کر کھلا تھا۔ سو اب نہ یقین کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں رہی تھی۔ مگر پھر بھی۔۔۔

"جویا کی سسرال!" اس نے زیر لب دہرایا۔ مایوسیوں' پریشانیوں کے اس نہ ختم ہوتے دور میں یہ الفاظ بڑے ہی اجنبی تھے۔

"تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں اتری حیرانی آپا گل کو اور بھی خفا کرنے لگی۔ "کیا جویا کی اب کہیں شادی نہیں ہونی ہے؟ تم لوگوں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ بے چاری بس اس گھر کا بوجھ اٹھاتی رہے ساری زندگی۔ کسی کو اس کی فکر نہیں ہے' لیکن میں ایسی خود غرض نہیں ہوں۔"

زویا کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ آپا گل کی دوستی ان کی ناراضی سے کہیں زیادہ معنی خیز' زیادہ خوف زدہ کرنے والی تھی۔

"کہاں کر رہی ہیں آپ جویا کی شادی؟"

"ہے ایک لڑکا بہت اچھا' کھاتا کماتا۔" وہ تفصیل دینے سے کترا کر نکلیں۔

"جویا کو پتا ہے' اس بارے میں؟"

"جب ہم خود مطمئن ہو جائیں گے تو اسے بھی بتا دیں گے۔ اسے کیا اعتراض ہونا ہے۔" وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ کو پتا ہے کہ اسے اعتراض ہو گا۔" وہ تیزی سے ان کے سامنے آئی۔ "بلکہ اعتراض کیا۔ وہ کبھی بھی راضی نہیں ہو گی' چاہے آپ اچھے سے اچھا لڑکا اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیں گی تب بھی۔۔۔" زویا کو ان کی بے حسی پر بہت زور کا غصہ آیا تھا۔

"دماغ کی خرابی ہمیشہ ہی لاعلاج مرض نہیں ہوتی۔۔۔ جویا کو بھی ٹھیک ہونا پڑے گا۔۔۔ ورنہ یہ سب کچھ کبھی نہیں بدلے گا' بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے حالات۔"

زویا کے چہرے پہ نگاہ جما کر انہوں نے تلخ ترین لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے سامنے شاکرہ امی کے کمرے میں چلی گئیں۔

ان کے قیمتی پرفیوم کی مہک اب بھی فضا میں باقی تھی۔ بہت سی باتیں سچ تھیں' لیکن وہ ان کے پیچھے جانے کے بجائے وہیں بیٹھ رہی۔

جویا اب تک نہیں آئی تھی' آج کل وہ اسکول کی چھٹی کے بعد بھی وہیں رکی رہتی تھی۔ سینئر کلاسز کے امتحان قریب تھے۔ سو ٹیوشن کی اضافی شفٹس شروع تھیں۔ جویا کی واپسی اس وقت ہوتی جب قریبی مسجد سے عشاء کی اذان بلند ہوتی تھی۔ تھکن' اگلے دن کی تیاری اور گھر کے چھوٹے موٹے کام' کتنے کتنے دن ہو جاتے تھے اس سے ڈھنگ سے کوئی بات کیے ہوئے۔

اور وہ خود بھی اپنی پڑھائی میں مصروف' اپنے کیریئر کی جدوجہد میں۔

اسے اپنی بے حسی پر شرم آئی۔ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا آپا گل نے۔ وہ سب ہی ایک ہی جیسے تھے۔ کم از کم جویا کے معاملے میں تو۔

وہ بے چین سی ہو کر شاکرہ امی کے کمرے میں چلی آئی۔

سلمان شیشے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ زوبیہ کا غم منانے کے اس دورانیے میں آج پہلی بار وہ ڈھنگ کے حلیہ میں تھا اور قریب ہی بیڈ پر شاکرہ امی بیٹھی تھیں آپا گل کے منتخب کردہ کپڑے پہن کر۔ وہ بالکل گم صم سی محسوس ہو رہی تھیں۔ زویا کو بے اختیار ہی جویا اور اس سے پہلے سلمان کے رشتے کے سلسلے میں ایسے موقعوں پر شاکرہ امی کی خصوصی تیاریاں یاد آ کر رہ گئیں۔

وہ جوش و خروش۔ وہ اہتمام' الامان!

سامنے دکھائی دیتی شاکرہ امی کا اس پچھلے روپ سے کوئی دور کا بھی تعلق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

"سنو آپا گل! تمہارے اس بھائی فرید کی کوئی بہن بھی ہے۔ چاہے اسی شکل صورت کی ہو' لیکن ایک آدھ فلیٹ وہ اسے بھی دے رہا ہو۔"

زویا نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا۔ وہ بال بنا چکا تھا اور بہت سنجیدگی سے آپا گل کی طرف متوجہ تھا۔

"بھائی فرید۔" زویا نے الجھن سی محسوس کی تھی۔ "یہ کون ہیں آپا گل؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ان سے مخاطب ہونا پڑا۔

"وہی جو ابو کا مقدمہ لڑ رہے ہیں اور اب جویا سے شادی کے خواہش مند ہیں' ان ہی کے ہاں جا رہے ہیں ہم لوگ۔" آپا گل کے بجائے سلمان نے تیزی سے جواب دیا تھا۔

"ہاں تو کیا بتا رہی تھیں تم۔۔۔" زویا کو نمٹا کر وہ فی الفور آپا گل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا جو انکوائری وہ اپنے لیے

لینا چاہ رہا تھا شاید زیادہ اہم تھی۔

اور جویا کا رشتہ وہ لوگ اپنے طور پر شاید طے ہی کر چکے ہیں اس وکیل کے ساتھ۔۔۔ وہی جسے آپا گل کی مکمل حمایت حاصل ہے اور جس سے جویا کو نفرت کی حد تک چڑ ہے۔

نیچے اکبر بھائی کی گاڑی کا ہارن بجنا شروع ہو گیا تھا۔ آپا گل نے مارے ہڑبڑاہٹ کے ہر قصہ ادھورا چھوڑا اور شاکرہ امی کا ہاتھ پکڑ کر ایسی سرعت سے سیڑھیاں اتر گئیں کہ زویا۔ "ارے ارے" ہی کرتی رہ گئی۔

"دروازہ بند کرلو' جویا نہ جانے کب تک آئے۔" سلیمان نے جاتے جاتے چلا کر سب سے اوپر کی سیڑھی پر کھڑی زویا سے کہا تھا۔ مگر وہ خود ان کے پیچھے نہیں آسکی تھی۔ اکبر بھائی کی گاڑی کے جانے کے بعد تک وہ خاصی دیر وہیں اوپر کھڑی رہی۔ ماحول پر ان سب کے چلے جانے کے بعد گہری خاموشی چھائی تھی۔ ڈھلتی ہوئی سہ پہر یک دم ہی اداسی میں ڈوبی۔

دھیرے دھیرے نیچے اترتی زویا کے دل پر بھاری بوجھ کا سا احساس تھا۔ نیم وا دروازے کو بند کرتے ہوئے دل کو بڑے ہی نحوست بھرے واہمہ نے گھیرا تھا۔

✡ ✡ ✡

برآمدے کے ٹھنڈے چکنے فرش پر وہ کب سے اسی ایک موڈ میں بیٹھی تھی۔ سر جھکائے' خاموش۔ کسی سوچ میں گم۔

وہ دو بار وہاں سے گزرا تھا۔ مگر مکمل نظر انداز کرتے ہوئے۔ اس کے خیال میں یہی سب سے بہتر تھا۔ مگر گھر میں ہر ایک اس کا ہم خیال نہیں تھا۔

"اس لڑکی کا جلد سے جلد کچھ کرو معاذ! ورنہ میں سچ کہتی ہوں کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر کر دوں گی۔" وہ دادی کے کمرے میں داخل ہونے لگا تھا۔ جب اسے امی وہیں دروازے سے نکلتے ہوئے مل گئیں۔

"اب جہاں اتنے دن آپ نے برداشت کر لیا ہے تو چند دن اور سہی امی! کہا ہے میں نے 'دو' چار لوگوں کو' اب ایسے ہی تو آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا نا!"

"تم اس کی زیادہ فکر مت کرو۔ بہت تیز لڑکی ہے۔ دیکھو تو کس دیدہ دلیری سے اپنے خاندان والوں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ ورنہ کوئی سیدھی سادی بچی ہوتی تو بے چاری چپ چاپ ساتھ ہی چلی گئی ہوتی۔"

امی کے پاس زری کے لیے اب رہی سہی رعایت بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس سے براہ راست بات تو پہلے ہی نہیں کر رہی تھیں۔ اب اس کی بات کا جواب دینا بھی ختم ہوا تھا۔

معاذ کو ان کے اس رویے کا بہرحال رنج تھا۔

"یتیم' بے سہارا لڑکی ہے امی! چلی ہی جائے گی' آپ تھوڑا سا رویہ اچھا کر لیں گی تو۔۔۔"

"مجھے سبق مت پڑھاؤ معاذ!" انہوں نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں صرف تمہارے ابا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہوں' ورنہ ایک جوان لڑکی کو اپنے گھر میں ایک دن بھی نہیں رہنے دیتی اور لڑکی بھی وہ جس کا ہر انداز' مجھے پہلے دن سے کھٹک رہا ہے۔ دعائیں کر کر کے یہ وقت گزارا ہے میں نے۔ مگر اب ایک دن بھی نہیں۔۔۔ رحم کرو مجھ پر۔"

بات کرتے کرتے' ان کی نگاہ معاذ کے عقب میں گئی اور ایک دم ہی وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

معاذ نے بے ساختہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ زری پیچھے ہی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ امی کی باتوں کا کافی حصہ یا کچھ تو ضرور ہی سن چکی ہے۔

قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی وہ دکھ بھری شرمندگی میں مبتلا ہوا۔ "امی کا یہ مطلب نہیں تھا زری! وہ دل کی بہت اچھی ہیں' بس کچھ حالات ہی ایسے ہو رہے ہیں کہ۔۔۔"

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ "کم از کم آپ کو تو مجھ سے ایسا کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے اور امی جو بھی کہتی ہیں' اس میں کچھ غلط بھی نہیں۔ یہ تو آپ کا بہت بڑا احسان ہے جو۔۔۔"

"میرا کوئی احسان نہیں ہے تم پر۔" معاذ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "بلکہ تم نے میری بات مان کر ضرور احسان کیا ہے مجھ پر زری!"

"آپ کی بات ماننا مجھ پر فرض تھا۔" اس کی آواز دھیمی ہوئی۔ مگر لہجہ انتہائی مضبوط۔

"ارے زری! کہاں ہے صبح سے تو' میں کب سے تجھے بلوا رہی ہوں۔" دادی واش روم سے باہر آ رہی تھیں اور ان کی نگاہ سب سے پہلے زری پر ہی پڑی تھی۔

"میں آپ ہی کے پاس آ رہی تھی دادی!" وہ کہتے ہوئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ معاذ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے مڑ کر مشکور نگاہوں سے دادی کی طرف دیکھا۔

اپنی الماری کی چابیاں زری کو تھماتے ہوئے وہ مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھیں۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا۔ معاذ کو دیر ہو رہی تھی۔

اگلے صحن سے بائیک نکال کر گیٹ بند کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دادی کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے الماری کے پاس کھڑی زری ابھی بھی نظر آ رہی تھی۔ دانستہ یا نادانستہ وہ کس کس کا قصوروار ٹھہرا تھا۔ شاید اس روز وہ زری کو اپنے ساتھ نہ لاتا تو اس کے حق میں زیادہ بہتر رہتا۔ چلی جاتی دارالامان میں اور دو' چار ماہ بعد اس کے خاندان والے اسی طرح شرم کھا کر وہاں سے اسے لے بھی جاتے۔ صبر و شکر کے ساتھ زندگی کی ابتدا وہ کر ہی لیتی۔

سامنے پھیلی سڑک پر بائیک دوڑاتے ہوئے وہ اس کے بارے میں سوچے گیا۔ زری کی امیدوں کو بڑھاوا دینے والا وہ خود تھا۔ اس کی ہمدردی کو وہ جذباتی' کم عقل لڑکی بڑی آسانی سے کچھ اور رنگ دے گئی۔۔۔ اور وہ۔۔۔

"دھت!" اس نے قریب سے اوور ٹیک کرتی ایک گاڑی سے اپنی بائیک کو بچایا۔ یہاں پہلے ہی ایک بڑا کھاتا کھلا تھا۔ جس میں ناقابل تلافی نقصان درج تھا۔

بائیک جانے پہچانے سے راستے پر تھی۔ شام ڈھل چکی تھی۔ جب وہ جویا کے اسکول پلس کوچنگ سینٹر والی گلی کے کونے پر پہنچا تھا۔

گیٹ پر بیٹھا گارڈ اسے دور سے ہی دکھائی دے جاتا تھا۔ آج کل یہاں دیر تک کلاسز چل رہی تھیں اور جویا خاصے وقت تک رکی رہتی تھی۔

صبح سات ساڑھے سات سے لے کر آٹھ ساڑھے آٹھ اور کبھی کبھی نو بجے۔ کتنی ہی بار وہ گھنٹے منٹ شمار کرتا رہ جاتا۔ اپنے حصے میں آئی ان تھک محنت کو وہ پوری ہمت کے ساتھ نبھا رہی تھی۔۔۔ مگر کب تک بھلا؟

سامنے کھڑا بڑا سارا سوالیہ نشان اب بھی جواب طلب تھا۔ بنا پلک جھپکائے وہ خاصا دور کھڑا اسی ایک سمت دیکھے گیا۔

خیام اور سالار کی کالز' امی کی گھر پہنچنے کی ہدایت سب ہی کو نمٹانے میں کتنی ہی دیر لگی ہو' مگر اس وقفے میں وہ بہرحال آتی نظر آ گئی تھی۔ وہ دوسری ٹیچرز کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ اسی طرف آ رہی تھی اور قدرے فاصلے پر بھی دوسری لڑکیوں اور جویا کی چال کا فرق بڑا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ان سے پیچھے رہ جاتی اور پھر تیز قدم اٹھا کر ان کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کرتی اور ہر بار جب وہ ایسا کرتی معاذ نے اپنے قدم' اپنے اعصاب شل

ہوتے ہوئے محسوس کیے تھے۔

بظاہر کوئی دور کا بھی تعلق نہیں اور امید کی ہلکی سے ہلکی کرن بھی معدوم سہی۔ پھر بھی اس کا ہر راستہ اسی ایک سمت مڑتا تھا۔ نہ وہ اس کی تکلیف شمار کرتے تھکتا اور نہ ہی اس کے روز مرہ معمول سے ہی انجان رہتا اب بس میں تھا۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا کہ وہی زمانہ اچھا تھا جب خاندان بھر میں ابرار چچا کا ڈنکا بجتا تھا اور وہ ہر موقع پر اسے ذلیل کرنے سے نہ چوکتے تھے۔

کم از کم تب جویا کے حصے میں ایسے کڑے دن رات تو نہیں آتے تھے۔ ایک آرام دہ محفوظ و مامون زندگی اسے بھی میسر تھی۔

قدم بہ قدم۔۔۔ درمیانی فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

جویا کا زرد چہرہ' جھکی ہوئی نگاہیں اور گم صم سی کیفیت کچھ بھی معاذ سے چھپا نہیں رہتا تھا۔ مگر وہ تھی کہ اس کی موجودگی سے بھی لاتعلق۔۔۔ کتنی ہی بار وہ یہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ مگر مجال ہے جو ایک بار بھی جویا کی نگاہ اس طرف اٹھی ہو۔ اس کی ارد گرد سے دلچسپی کب کی تمام ہوئی تھی۔

وہ کچھ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

معاذ کو بھی نہیں۔

تب ہی اچانک اس کا پیر سڑک کے کنارے پڑے کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔

معاذ نے بے ساختہ ہی آگے بڑھنا چاہا۔ مگر جویا کی ساتھی لڑکی اسے تھام چکی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کا احساس تھا' لیکن وہ اپنی ساتھی لڑکیوں کو اطمینان دلا رہی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ اس کا سہارا لے کر چلنا بھی شروع کر چکی تھی۔ اس بار اس کی رفتار پہلے سے بھی کم ہوئی تھی۔ سڑک کے دوسری طرف کھڑے معاذ نے سختی سے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے رگڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

دوسری منزل پر واقع اس بڑے سارے فلیٹ میں بڑی خوشگوار سی چہل پہل تھی۔

بالکونی کی طرف کھلنے والے دروازوں سے ٹھنڈی تیز ہوا کے جھونکے یہاں اندر ہونے والی دعوت کی لذیذ سی مہک کو نہ جانے کہاں تک اڑا کر لے جا رہے تھے۔

چکن تکہ' ملائی سیخ کباب' بریانی' فرائی فش۔۔۔ سلمان نے اپنی پلیٹ میں بیک وقت سب کچھ ڈالا تھا۔ آپا گل نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹوکا بھی' مگر وہ اس وقت جان بوجھ کر انجان بنا تھا۔

اتنے عرصے بعد ایک ساتھ اتنا بہت کچھ اور آگے میٹھے میں بھی رس ملائی اور ٹرائفل۔

"کچھ اور لیں نا سلمان بھائی۔۔۔ آپ تو کھا ہی نہیں رہے۔" ایک اچھے میزبان کی طرح فرید الدین نے اس کی لبالب پلیٹ میں کچھ اور اضافہ کیا۔

"ارے نہیں نہیں۔۔۔ میں خود لے لوں گا' ویسے آپ نے بہت تکلف کر لیا۔ اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔"

سلمان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ' محض رسمی سی کارروائی تھے۔ پھر بھی فرید الدین نے انہیں بہت خوشی سے قبول کیا۔ اس کا کیا گیا اہتمام رائیگاں نہیں جا رہا تھا۔ آپا گل ان کے شوہر دونوں ہی جتنا پکا اطمینان اسے دلا چکے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک سو ایک فیصد پر اعتماد تھا۔

"آپ کا فلیٹ بہت اچھا ہے۔" سیخ کباب کا بڑا حصہ منہ میں رکھتے ہوئے سلمان نے اس پر تکلف دعوت کا کچھ حق ادا کرنا چاہا۔ "لوکیشن بھی اچھی ہے اور خاصا بڑا اور ہوادار۔۔۔"

آپا گل نے اطمینان بھری نگاہوں سے سلمان اور پھر اکبر بھائی کی طرف دیکھا۔

وہ صرف اور صرف کھانے میں مصروف تھے۔ آپا گل نے بدمزا ہو کر دوبارہ اپنی توجہ سلمان اور فرید الدین کی طرف کی۔

"میرا کیا' آپ ہی کا گھر ہے سلمان بھائی! اپنوں سے بڑھ کر بھی بھلا کچھ ہوتا ہے کیا۔" فرید الدین کی خاکساری عروج پر تھی اور ایک من چاہی خوشی کو پا لینے کا اطمینان بھی۔

"دیکھا سلمان! میں کیا کہتی تھی' فرید بھائی بہت ہی محبت کرنے والے اور فراخ دل انسان ہیں' تمہیں ان سے مل کر اچھا ہی لگے گا۔" آپا گل نے اپنی پچھلی کہی باتوں کی سلمان سے تائید چاہی تو وہ اور بھی جوش و خروش سے سر ہلانے لگا۔

"واقعی مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ اکبر بھائی کے دوستوں میں اتنے معقول لوگ بھی ہیں۔" اپنی دانست میں مذاق فرما کر وہ خود ہی زور زور سے ہنسنے لگا تھا۔ آپا گل کے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ آگئی۔

"بہت مذاقیہ ہے ہمارا بھائی۔"

"اور بے حس بھی۔" فرید الدین نے بمشکل دل میں آئی بات کو زبان پر آنے سے روکا۔ یہ وقت ان کی اصلیت جتانے کا کب تھا بھلا؟ اور اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو یہاں آتے ہی کیوں؟

کمینگی بھرا یہ تجزیہ ابھی بھی نامکمل تھا۔

"بھابھی گل!" وہ ان کی طرف مڑا' جو اس کی سب سے بڑی مددگار تھیں۔ "اچھا ہو گا جو ہم آج ہی ساری تفصیلات طے کر لیں' میں حاضر ہوں' جو کچھ اطمینان آپ کو چاہیے' ضرور دینے کی کوشش کروں گا۔"

بنیادی طور پر وہ ایک کنجوس شخص تھا اور اس ایک دعوت پر کیے جانے والے خرچے پر ہی وہ ساری باتیں کر لینا چاہتا تھا جو اگلی کئی دعوتوں میں طے پائی جاتی تھیں۔ آپا گل جیسی گھاگ عورت کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں فرید بھائی! اس طرح ہتھیلی پر سرسوں تھوڑی جمائی جاتی ہے۔ ابھی گھر میں صلاح مشورہ ہوتا ہے۔ ابو جیل میں سہی' رائے تو لینی پڑے گی نا ان سے بھی۔"

"انہیں تو آپ اب رہا ہی سمجھیں۔ میں نے بات کر لی ہے۔ پیسے سے کام خود بخود سیدھے ہونے لگتے ہیں۔ مال خرچ ہو گا تو ابرار صاحب کا سارا کیس ختم۔"

"خیر خیر۔ اب یہ سب ایسے بھی نہیں ہے۔ یوں ہی بے پر کی مت اڑاؤ فرید الدین!" اکبر بھائی نے بڑے بے تکے پن سے اس گفتگو میں دخل دیا تھا۔ آپا گل نے کچھ ناراضی سے ان کی طرف دیکھا۔ مگر فرید الدین ان ہی کی دریافت تھے۔ سو وہ کچھ بھی کہنے کے لیے آزاد تھے۔

"پیسہ تو پہلے بھی خرچ ہوا ہے' جرمانے کی رقم بھی بھری گئی ہے' مگر اس کے بعد بھی کیا کیا باتیں نکلی ہیں۔ قانون سے نپٹنا کھیل نہیں ہے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ضمانت میں آسانی ہو جائے۔ مکمل خاتمہ تو۔۔۔" بڑے یقین سے انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"۔ آپا گل ان سمیت ساری سسرال کے بے موقع بول پڑنے کی عادت سے ہمیشہ کی عاجز تھیں۔ بنی ہوئی بات کو اپنی حماقت سے بگاڑنے والے۔

"ضمانت بھی بہت ہے' ایک طرح سے رہائی ہی ہو جاتی ہے' ہمیں تو آپ پر پورا بھروسا ہے فرید بھائی!" سلمان نے مکمل طور پر فرید الدین کی سائیڈ لی تھی۔ "ہمارا اور آپ کا ساتھ اب ہمیشہ رہنے والا ہے' آپ جیسے نیک اور شریف انسان تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔"

اقرار کے لیے ایک مکمل کھلا اشارہ۔ فرید الدین نے اطمینان کی گہری سانس لی تھی اور آپا گل نے اس سے بھی

کہری۔
سلمان کی سمجھ داری ایسے معاملات میں مسلم تھی۔ خود اس کی اپنی زندگی نظر بد کا شکار نہ ہوتی تو اس سمجھ داری کی ہی روشن مثال تھی۔
فرید الدین اب بہت خوش خوش میٹھا پیش کر رہا تھا۔
"تم اس سے فلیٹ کی بات صاف صاف کرلو آپا گل! ایسا نہ ہو کہ آگے جا کر یہ ہمیں ہری جھنڈی دکھا دے' پہلے ہم شفٹ ہوں گے بعد میں۔۔۔"
فرید الدین کی تعریف میں قلابے ملانے کے فوراً" بعد ہی وہ آپا گل سے سرگوشی میں اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا تھا۔ جواباً" وہ بڑی متانت سے سر ہلائے جا رہی تھیں۔
"ٹھیک ہے۔ میں ابھی بات کر لیتی ہوں اور حتمی جواب دینے کی ذمہ داری امی کے سپرد' وہ آسانی سے ہفتہ' دس دن کے لیے ٹال دیں گی' مگر اب اس سے زیادہ نہیں۔ سمجھا کرو۔" پراسرار سے انداز میں انہوں نے سلمان کو جو سمجھانا چاہا' وہ فوراً" ہی سمجھ گیا۔
"دیر تو میں خود بھی نہیں چاہتا' اس جہنم بنے گھر سے تو نکلیں۔ جلد سے جلد کچھ بھی کرو آپا گل تم۔ میں اور امی تمہارے ساتھ۔۔۔"
آپا گل اچانک ہی چونکی تھیں۔
"امی!" ان کی نگاہ کمرے سے بالکونی تک کا جائزہ لے کر مایوس ہوئی۔ شاکرہ امی کہیں نہیں تھیں۔
"امی کہاں ہیں سلمان' ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھیں صوفے پر؟" آپا گل نے پریشانی سے سلمان کو دیکھا۔
شاکرہ امی جب سے آئی تھیں' بالکل لاتعلقی سے ڈرائنگ روم کے سب سے کونے والے صوفے پر خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ کھانے پر بھی انہوں نے طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے انکار کر دیا تھا۔
فرید الدین نے تیزی سے ملحقہ تینوں کمروں میں جھانکا۔ آپا گل نے واش رومز کے دروازوں پر کھڑے ہو کر آوازیں لگائیں۔ سلمان بالکونی میں جا کھڑا ہوا مگر وہ کہیں نہیں تھیں۔
"ضرورت ہی کیا تھی انہیں لانے کی' اپنے حواسوں میں کب ہیں وہ۔" فرید الدین کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر سلمان زور' زور سے بول رہا تھا۔ "ہمارے تو ماں' باپ نے اولاد کی زندگی جہنم بنا دی ہے۔ سوائے پریشان کرنے کے انہیں اور آتا ہی کیا ہے۔ اب دیکھ لو' کہاں چلی گئی ہیں بغیر بتائے۔" آپا گل کی آنکھ کے ہر اشارے کو اس نے قطعی نظر انداز کیا تھا۔
مجبور ہو کر وہ خود ہی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ پرانی بنی ہوئی اس عمارت کی سیڑھیاں گھومتی ہوئی نیچے جا رہی تھیں۔ سنبھل سنبھل کر اترتی ہوئی آپا گل کو اس گول چکر کے نچلے سرے پر وہ بیٹھی ہوئی آخر نظر آ ہی گئیں۔
گھٹنوں کے گرد دونوں بازوؤں کو لپیٹے ہوئے وہ پتا نہیں کب سے یہاں بیٹھی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو آپا گل کے بھی دل کو کچھ ہوا۔
"امی!"
وہ ان کی آواز پر چونک کر مڑیں۔ "گل! واپس گھر چلو۔" ان کی آواز اور چہرے پر خوف کا تاثر تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پھر فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

زرتاج نے بڑی کوفت سے موبائل آف کر کے صوفے پر اچھالا اور زیر لب وہ جو کچھ نبیل کی شان میں کہہ سکتی تھی' کہہ ڈالا۔
صبح سے کوئی دسویں گیارہویں بار ایسا ہوا تھا اور یہ آج کا نہیں' اب روز کا معمول تھا۔ نبیل جب سے لاہور گیا تھا' شروع کے ایک آدھ دن زرتاج کے حضور خود پر اپنی حاضری لگوانے کے بعد سے وہ ٹھیک اپنی اصلیت پر اترا ہوا تھا۔
"بے غیرت' آوارہ! اپنی رنگ رلیوں میں ہوش کہاں ہے اسے۔" نبیل کی متوقع رنگ رلیوں کے بارے میں وہ جتنا بھی سوچتی' اس کا غصہ اور نفرت ہر حد کو عبور کر رہا تھا۔
یہ شادی اس کی زندگی کی بدترین غلطی تھی اور اس میں اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اس کے موبائل پر کوئی فون آ رہا تھا۔ روزی کے کیس کو دبانے کے سلسلے میں وہ جن لوگوں سے کام لے رہی تھی۔ ان ہی میں سے ایک اہم کانٹیکٹ تھا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے تسلی سے دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع کو سننا چاہا تھا۔
لاکھوں روپے خرچ کر دینے کے بعد بھی' حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ سالار کی طرف سے بڑے نامی گرامی وکیل نامزد ہوئے تھے۔ جن کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کوئی کیس کبھی نہیں ہارے۔
نبیل کے خلاف ثبوت نہ سہی' حالات مکمل طور پر ایک اسی کو ملزم ٹھہراتے تھے۔ عدالت میں نبیل کی حاضری کو اب اور زیادہ دن نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ لاکھوں روپے خرچ کر کے ملنے والی مہلت قریب الختم تھی۔
"پیش تو انہیں ہونا ہی پڑے گا' ورنہ عین ممکن ہے کہ پولیس انہیں گرفتار کرنے کے لیے چھاپہ مارے' آپ کے گھر پر یا پھر وہاں جہاں وہ ہیں۔" ہر پیش کش اور ہر لالچ دیے جانے کے باوجود حرف آخر یہی تھا کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں ہیں۔
زرتاج نے بڑی مایوسی سے فون بند کیا۔
"سارے کے سارے ابن الوقت پیسہ لیتے ہوئے کچھ اور زبان بولتے تھے اور اب کھا پی کر ہری جھنڈی دکھا رہے ہیں۔" پیشانی کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے وہ خود سے اپنے کرم فرماؤں کا گلہ کیے گئی۔
وقت واقعی بدل رہا تھا۔
بہت کچھ جواب تک بے حساب ہو چکا تھا۔ انصاف کے لیے روز جزا منتظر سہی' مگر یہ خون ناحق یہیں دنیا میں قصاص مانگ رہا تھا۔
آنکھ کے بدلے آنکھ۔
ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔
جان کے بدلے۔۔۔
خوف کی ایک لہر زرتاج کے وجود کو ذرا دیر کے لیے ہی سہی' شل کر گئی۔
نبیل اب بھی فون پر نہیں تھا۔
خوف' جھنجلاہٹ اور مایوسی بھرے ان ہی لمحات میں زرتاج نے گیتی کو اپنے کمرے سے آتے دیکھا تھا۔
وہ شاید کہیں جا رہی تھی۔ زرتاج کو اس بات کا اندازہ اس کے ہاتھ میں تھامے بیگ سے ہوا تھا۔ سادہ خوش رنگ لباس اور ہلکی سی لپ اسٹک کے ساتھ وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ زرتاج نے بے ساختہ ہی آنکھ چرائی۔
"معلوم نہیں یہ مصیبت کہاں سے آئی تھی؟"
زرتاج کے دل کو لگا دوسرا غم' گیتی آرا کا ہی تھا اور اگر وہ اس بدبخت نبیل کی پھیلائی ہوئی مصیبت کو نہ جھیل

رہی ہوتی تو اب تک کیتی کے بارے میں بہت کچھ جان بھی چکی ہوتی اور اس کو یہاں سے چلتا بھی کرچکی ہوتی۔
"زندگی کتنی آسان ہوتی پھر یک بہا۔"
آج کل وہ پہلی بار حسرتوں کا مزا بھی چکھ رہی تھی۔
"سنو!"
"جی!" کیتی کو شاید اس کے پکارنے پر حیرت ہوئی تھی۔
"کہاں جارہی ہو؟" بہت کوشش کرکے وہ اپنا لہجہ نرم رکھ پائی تھی۔
"بازار جارہی تھی' کچھ کام ہے آپ کو۔"
"کام؟ نہیں۔۔۔ جاؤ تم!" وہ پھر سے تلخ ہوئی۔ "جب تمہارا شوہر تمہیں نہیں روکتا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تم پر پابندیاں لگاؤں۔"
کیتی چپ چاپ چند لمحے اس کی شکل دیکھے گئی۔
کوئی شک نہیں کہ وہ اس عورت سے 'جسے دیکھ کر اس کے ذہن میں ہمیشہ ناگن کی شبیہہ ابھرتی تھی' بے حد خوف زدہ رہتی تھی۔ سالار جیسے شوہر کی موجودگی اور ہر ممکن تسلی کے بعد بھی۔۔۔
زرتاج رخ موڑے دوسری طرف دیکھ رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس سے مزید بات نہیں کرے گی۔ کیتی خاموشی سے لاؤنج سے نکلتی چلی گئی۔ باہر راجو اس کا منتظر تھا۔ کچھ چیزیں لینی تھیں۔ ذاتی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام تھے۔
کیتی آرا اب اس بڑے سے ہنگامہ خیز شہر کے طرز زندگی کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ اب اسے سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کم پریشان کرتا تھا اور آہستہ آہستہ وہ اس فراخ دل شہر کی خوب صورتی کے سحر میں گرفتار ہونے لگی تھی۔ راجو اب گھر کا ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ سالار کے آفس میں اپنی جاب شروع کرچکا تھا لیکن کیتی کو کہیں جانا ہوتا تو سالار کی غیر موجودگی میں وہی تھا' جو اس ذمہ داری کو بخوشی نبھاتا۔
اس کی حیثیت گھر کے فرد کی سی تھی اور انیکسی میں اس کے لیے ایک مکمل گھر کی ساری سہولیات میسر تھیں۔
"کسی میڈیکل اسٹور پر روک لیجیے گا راجو بھائی!" کیتی کو اچانک ہی کچھ ضروری کام یاد آیا۔
سامنے نظر آتے چوراہے سے گھوم کر ذیلی سڑک پر ایک سپر اسٹور نظر آرہا تھا۔
کیتی کو کمپنی میں کام کرنے والی ملازمہ کی بیٹی کے لیے کچھ دوائیں لینی تھیں۔ اس کا دیا ہوا ڈاکٹر کا پرچہ آج صبح سے کیتی کے پرس میں تھا۔ کیتی کو اسٹور کے سامنے اتار کر راجو نے قریب ہی گاڑی پارک کی تھی۔
کیتی اندر جاچکی تھی۔ اندر اس بڑے سے اسٹور میں کچھ خاص رش نہیں تھا۔ کیتی دواؤں کے کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ سیلز مین نے اسے مطلوبہ دوائیں نکال دی تھیں مگر وہ کچھ مطمئن نہیں تھی۔ مزید کچھ فوڈ سپلیمنٹ' شہد کی بوتل' دودھ کے ڈبے وغیرہ۔ بہت سا اضافہ وہ اپنی طرف سے کیے گئی۔ پچھلے دنوں اس لڑکی کے ہاں آپریشن سے بیٹی ہوئی تھی اور کیتی کو اس کے خراب حالات اور خراب ترین صحت کا بے حد دکھ تھا۔
"سب کی فکر کرنے والا تو وہ رب ہے' لیکن اپنے اردگرد کے لوگوں کی فکر اس نے ہمارے ذمہ کی ہے اور اس میں بھول چوک کی معافی نہیں ہے۔"
استاد فراغت بیگم کی کی ہوئی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت اور وہ اس بھول چوک کے معاملے میں بے حد حساس رہی تھی۔ ہزاروں میں بنے اس بل کی ادائیگی کرتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑا ہی گہرا سکون کا تاثر تھا۔
تب ہی اس نے قریب سے کسی کو کہتے سنا۔
"یہ آٹھ سو پینتیس روپے کی دوائیں۔۔۔ ان میں کچھ تو ڈسکاؤنٹ کریں پلیز۔۔۔" آواز کچھ جانی پہچانی' لیکن التجا کرتا ہوا لہجہ بالکل ہی اجنبی۔
بالکل بے ساختہ کیتی کی نگاہ اس طرف اٹھی تھی۔ معمولی سے حلیے میں وہ بدلے ہوئے لہجے والا لڑکا کوئی اور نہیں خیام ہی تھا۔
"دیکھیں کچھ تو کم کریں پلیز۔۔۔ ورنہ مجھے مجبوراً "دوائیں کم کرنی پڑیں گی۔" وہ اس کی موجودگی سے آج بھی بے خبر تھا۔ کیتی کی پلک تک نہیں جھپکی۔
اس کی سنہری رنگت میں اب وہ پہلے جیسا اجلا پن نہیں تھا۔ چہرے پر چھائی اداسی اور بھی گہری ہوگئی تھی۔۔۔ لیکن یہ وہی تھا! تب ہی شاید اسے بھی خود پر جمی کسی نگاہ کا فطری سا احساس ہوا تھا۔
کیتی نے اسے اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں پھیلتی ہوئی حیرانی کو بھی۔ اس کے لب ہلکے سے کھلے تھے 'شاید اس نے کیتی آرام کا نام بھی لیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے سب کچھ معدوم ہوا تھا۔
"یہ آپ کا سامان!" سیلز مین نے شائستگی سے کیتی کی طرف اس کے بڑے سے شاپر ز بڑھائے۔ "آپ کی گاڑی تک یہ لڑکا چھوڑ آئے گا۔"
"ہاں!" وہ جیسے چونک کر منظر میں واپس آئی۔ "بہت شکریہ۔" پورے وقار کے ساتھ چلتی ہوئی وہ خیام کے قریب سے گزر کر باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔
وہ جواب تک اپنی جگہ منجمد تھا' بے ساختہ ہی تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا' پکارنا چاہتا تھا۔
"کیتی۔۔۔ کیتی۔۔۔ کیتی!" مگر یہ نام زبان پر آنے سے قاصر ہوا تھا۔ شیشے کے دروازے کے دوسری طرف سے خیام نے اسے سپر اسٹور کی سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھا۔
ایک کرشماتی لمحے کے گزر جانے کے بعد سب کچھ پھر سے پہلے جیسا ہو جانے والا تھا۔۔۔ سو وہ اسے کیوں نہیں روکتا!
دل سے ابھرتی آواز میں شدت کا مطالبہ تھا اور اس وقت وہ حیران بھی نہیں ہو سکتا تھا' سو تیزی سے سپر اسٹور کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ بہت سے لوگ اچانک ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہے تھے۔ کوئی فیملی تھی۔ عورتیں۔ بچے۔۔۔ وہ انہیں دھکا دیتے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا سو چند لمحے سیڑھیوں تک آنے میں لگ ہی گئے۔
تب ہی اس نے ایک بہت شان دار' نئے ماڈل کی بڑی گاڑی کو کیتی کے آگے رکتے ہوئے دیکھا۔ ڈرائیور بڑے ادب سے کیتی کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔
وقت کے ایک چھوٹے سے پل نے اک کیتی آرا کے ہائی فائی اسٹیٹس سے روشناس کروایا تھا۔ تائی ستارہ کے چوبارے پر چھوڑی ہوئی کیتی سے بالکل ہی مختلف۔۔۔ زمین آسمان کے سے فرق کے ساتھ سامنے آنے والی یہ لڑکی۔۔۔ کیتی تھی بھی اور نہیں بھی۔
وہ بالکل چپ کھڑا اس طرف دیکھے گیا۔
"سنو بیٹا!" کیتی نے سامان لانے والے بچے کے ہاتھ میں ہزار کا نوٹ تھمایا۔ "وہاں کاؤنٹر پر جو صاحب دوائیں لے رہے تھے ان کا بل پے کرکے باقی پیسے تم رکھ لینا۔ پہچانتے ہونا۔"
"جی وہی گورے سے۔۔۔ اکثر آتے ہیں' آپ بے فکر رہیں۔" وہ ٹپ لینے کی خوشی میں سرشار تھا۔
"چلیں راجو بھائی!" کیتی کے لہجے میں گہرا سکون اترا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ابا!"

"ہوں!" وہ اس کی آواز پر ہی چونکے تھے۔
معاذ سامنے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔
"آؤ نا' باہر کیوں کھڑے ہو۔"
"اصل میں مجھے لگا کہ یہ وقت آپ کے کام کا ہے' مصروف ہوتے ہیں۔" وہ چلتا ہوا اندر آیا۔
انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھلی کتاب کو بند کیا۔
"تمہارے لیے میں ہر وقت فارغ ہوں بیٹا! کہو کوئی خاص بات؟" وہ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو پہلی نظر میں ہی بھانپ چکے تھے' مگر اس کے منہ سے سننا چاہتے تھے۔
"بات تو کچھ نہیں' مگر بس دل چاہ رہا تھا' آپ کے پاس بیٹھنے کے لیے۔" معاذ کی آواز دھیمی تھی۔
ان کا اندازہ اور بھی پختہ۔
وہ جب بھی زیادہ پریشان ہوتا' اسی بہانے سے پاس آکر بیٹھتا تھا' یوں ہی ادھر اُدھر کی باتیں کیے جاتا۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی ان ساری باتوں کے بیچ سے وہ ایک بات نکال لیتے' جو اس کے لیے فکر کا سبب بنی ہوتی۔
"اسکول کب تک شفٹ ہو رہا ہے' نئی عمارت میں؟"
"بہت جلد ان شاء اللہ۔ افتتاح آپ ہی کو کرنا ہے۔ سالار کسی اور کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور ابا! آپ جب اسکول کو دیکھیں گے تو اتنے خوش ہوں گے کہ۔۔۔"
اسکول کے ذکر پر وہ بے ساختہ پرجوش ہو جاتا تھا' لیکن دل سے جڑا کچھ اور بھی بہت اہمیت رکھتا تھا' جو سوائے اداس رکھنے کے کچھ نہ کرتا تھا۔
اگلے چند منٹ جب وہ اپنے اسکول کی شان میں قصیدہ پڑھ رہا تھا۔ ابا اس دکھ بھرے سلسلے کو سوچ گئے۔
"ابرار کے کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟" وہ چپ ہوا تو انہوں نے فوراً" ہی پوچھ لیا۔
"آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے ابرار چچا کے کیس کی فائل میں ہی تو سنبھال رہا ہوں۔ گہرا تعلق ہے میرا ان سے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کو ٹالنے لگا' مگر ابا بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھے گئے۔
"تعلق تو اتنا سنجیدہ ہے کہ کم ہی تعلق ہوں گے۔۔۔۔ یہ اور بات کہ تم کسی بھی وجہ۔۔۔۔" کچھ اور ذہن میں آنے لگا تھا سو وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دوسری جانب دوسری بات پر آ گئے۔
"کم از کم اتنا تو تم کر سکتے ہو کہ اس دوسرے وکیل کے بارے میں معلومات کر لو' کیس کیا لڑ رہا ہے' کچھ امید ہے بھی یا نہیں۔ ابرار بے چارے نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ اب تو۔"
معاذ نے کچھ حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ساری زندگی ابرار چچا کے ہاتھوں ہتک اٹھانے کے بعد بھی اگر آج وہ ان کے لیے فکر مند تھے تو یہ ان کی سادہ دلی اور نیک نیتی تھی۔ اور وہ تو ایسے ہی تھے۔ سو پھر حیرت بھی کس بات کی؟

"کاش! سلمان مجھے اتنا مجبور نہ کرتا تو ہم شاید اب تک ابرار کو چھڑا ہی لیتے' مگر وہ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔"
"یہ عادت ان کے پورے خاندان کی ہے ابا! کچھ بھی نہ سننے کی۔" معاذ نے دھیمے لہجے میں ان کی تائید کی تھی۔
وہ بے ساختہ ہی مسکرا دیے۔
"میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" اس نے جھینپ کر کچھ صفائی دینا چاہی تھی۔
"جویا بہت صابر اور بلند حوصلہ بچی ہے معاذ! اسے تم ابرار کے پورے گھرانے سے نہ ملاؤ۔ جو کچھ اس نے اپنے خاندان کے لیے کیا اور کر رہی ہے' اس کا اجر اسے خدا ضرور دے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔" ان کا لہجہ ان کے الفاظ کی گواہی دے رہا تھا۔ عجیب سی بات تھی کہ ناامیدی اور دکھ سے بھرے اس سارے سلسلے کے بارے میں ایک وہی تھے' جو سب سے زیادہ پر امید رہتے تھے۔

پتا نہیں ابا کو اپنی پیش گوئیوں پر اتنا یقین کیسے رہتا ہے۔
"میں سوچ رہا ہوں۔۔۔۔ اس بار جویا سے ملوں' وہ میری بات کو بہتر طور پر سمجھے گی اور شاید شاکرہ بھابھی کو بھی سمجھا سکے۔ اگر وہ مان جاتی ہے تو پھر ہمیں سلمان اور گل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"
"وہ کبھی نہیں مانے گی ابا! وہ صاف کہہ چکی ہے کہ ہم ان لوگوں کے معاملے میں دخل نہ دیں۔ وہ ہم سے کوئی تعلق' کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ اسے آپا گل اور سلمان دونوں پر پورا بھروسا ہے۔ وہ سب ایک ہیں' شاید ہم ہی غلط اندازے لگا لیتے ہیں۔"
"وہ اپنی وجہ سے نہیں' تمہاری بہتری کے لیے۔ ہمیں دور رکھنا چاہتی ہے' یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی معاذ!"
"تمہاری بہتری؟" وہ سمجھا نہیں تھا۔
ابا چند لمحے اس کے چہرے پر نگاہ جمائے کچھ سوچ گئے۔ سلمان کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کا قصہ معاذ کے سامنے انہوں نے گول ہی کیے رکھا تھا' لیکن جویا انہیں الگ کس لیے رکھنا چاہتی تھی' یہ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔
"اگر وہ مدد نہیں لینا چاہتی ہے تو کیا ہم اسے ہمیشہ بالکل اکیلا چھوڑے رکھیں گے؟"
معاذ نے بے ساختہ ہی ان سے نگاہ چرائی۔
وہ بھلا کب ایسا چاہتا تھا' مگر جو چاہتا تھا' وہ بھی کس قدر ناممکن تھا۔
باہر پچھلے احاطے میں مکمل خاموشی پھیلی تھی۔
"ربیعہ کے رشتے کے لیے وہ لوگ کب تک آ رہے ہیں بابر سے؟" اس نے دانستہ بات بدلی۔
"شاید دو تین ہفتے اور لگیں گے۔۔۔۔ اس کے بعد مجھے ربیعہ کی رخصتی میں دیر نہیں کرنی ہے ان شاء اللہ سب کام بالکل سادگی سے ہو گا۔ وہ لوگ بھی دھوم دھام کے قائل نہیں ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔"
معاذ اداسی سے مسکرایا۔
"کیسی عجیب سی بات لگتی ہے نا ابا! کہ ربیعہ اب یہاں سے چلی جائے گی' میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے جانے کے بعد گھر کیسا لگے گا؟"
"بیٹیوں کو تو آخر جانا ہی ہوتا ہے۔ بس اللہ سے ان کے اچھے نصیب کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔ شکر ہے کہ ہم ایک بڑے فرض سے سبک دوش ہونے جا رہے ہیں' بڑی مہربانی' بڑا کرم ہے اس کا۔۔۔"
اتنی سی بات کے دوران ہی معاذ نے ان کی آنکھوں میں آنسو چمکتے ہوئے دیکھے تھے۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" اپنی جذباتیت پر قابو پا کر وہ مسکرا دیے۔ "اچھا' وہ زری کے اس رشتے دار کا میرے پاس کئی بار فون آ چکا ہے۔"
"میرے پاس بھی۔" معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ چار دن میں کسی اچھے لڑکے کو ڈھونڈ لینا بہت آسان ہے۔ شادی کی رٹ لگ گئی ہے انہیں زری کی' حالانکہ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ہم دیکھ رہے ہیں' جیسے ہی کوئی اچھا لڑکا ملا' ہم خود دیر نہیں کریں گے اس کام میں۔ ہمارے لیے تو خود مسئلہ بن گئی ہے یہ لڑکی۔ امی کا موڈ دیکھ رہے ہیں نا آپ؟" وہ تھوڑا تھوڑا سا بے زار ہو چلا تھا اور اس سے کہیں زیادہ فکر مند۔۔۔۔
"مجھے لگنے لگا ہے ابا! کہ زری کو اس گھر میں لا کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ سارے گھر کو آزمائش میں

ڈال دیا ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔"

انہوں نے پہلی بار اسے کسی نیک نیتی سے کیے گئے کام پر پچھتاتے ہوئے دیکھا' ورنہ اب تک اس نے ہر مشکل' ہر کٹھن وقت کو پورے حوصلے سے نبھایا تھا۔

"نیکی آسان تو کبھی بھی نہیں ہوتی بیٹا! اگر کبھی کبھی ذرا زیادہ ہی مشکل ہونے لگتی ہے' لیکن محض اس وجہ سے پیچھے ہٹنا بزدلوں کا کام ہے اور تم تو میرے بہت بہادر بیٹے ہو۔ فخر ہے مجھے تم پر۔" محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے اس ساری بے دلی اور مایوسی کو ایک چھوٹے سے پل میں زائل کیا۔

معاذ ہلکے سے مسکرا دیا۔

ابا ہمیشہ ہی اس کے لیے مضبوطی کا سبب بنتے تھے۔

"زری کی شادی بھی بہت جلدی ہو جائے گی۔ میں نے لڑکا دیکھ لیا ہے۔ بہت مناسب رہے گا زری کے لیے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت خوش بھی رہے گی اس کے ساتھ۔" معاذ نے بہت حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"کمال ہے' آپ نے لڑکا دیکھ بھی لیا اور مجھے بتایا بھی نہیں۔" ابا مسکرانے لگے۔

"میں نے سوچا' پہلے سالار سے بات کرلوں۔ اگر اسے مناسب لگتا ہے تو پھر بات کو فائنل کریں۔ راجو اچھا لڑکا ہے نا؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بہت اچھا۔ کمال ہے' مجھے کیوں نہیں خیال آیا اس کا' کیا کہا سالار نے؟ راضی ہیں وہ؟"

"ہاں! بلکہ وہ تو بہت خوش ہوا کہ اس طرح راجو کی بھی زندگی میں مکمل تبدیلی آئے گی۔ خوشیوں کی طرف پلٹے گا وہ بھی۔ ملازمت تو وہ کر ہی رہا ہے آفس میں۔ سالار کے گھر کی انیکسی میں رہتا ہے اور زری کے لیے اس سے اچھا کیا ہے کہ وہ سالار جیسے شریف شخص کی سرپرستی میں چلی جائے۔"

وہ ان کے ہر لفظ سے متفق تھا۔ "آپ نے بہت بڑی ٹینشن دور کی ہے ابا!" بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے معاذ نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ "خدا کرے کہ میں اس سے بھی بڑی پریشانی تمہاری دور کرسکوں۔" وہ ہلکے سے مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے اندرونی حصے سے باہر احاطے تک وہ خود چل کر آیا تھا' بغیر کسی سہارے کے۔

اس کے چہرے سے ابھی بھی کمزوری ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک روشن ہونے لگی تھی۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے نا خیام بھائی! کتنا روشن دن ہے۔ کیا سورج زمین کے زیادہ قریب آتا جا رہا ہے؟" ساجد نے مسکراتے ہوئے ساتھ چلتے خیام کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔

"بہت دن بعد باہر آئے ہو نا' اس لیے ایسا لگ رہا ہے۔ جب ہم کافی دیر تک اندھیرے میں رہتے ہیں تو ہمیں باہر کی دنیا ایسی ہی لگتی ہے۔ زیادہ اجلی' زیادہ چمک دار۔ سمجھے!" خیام نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

سر جھکا کر ساتھ چلتے ہوئے ساجد کے باپ نے منہ پھیر کر اپنے آنسو خشک کیے۔

کرخت چہرے اور تلخ لہجے والا یہ شخص اب بدلا بدلا سا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے میں وہ کتنی ہی بار خیام کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ چکا تھا اور کتنی ہی بار اس نے یہاں بار بار آتے معاذ کے آگے آنسو بہائے تھے۔

آج ساجد ڈسچارج ہوا تھا۔

علاج کا ایک صبر آزما دور' جس میں پل پل امید بندھی اور ٹوٹی اور پھر بندھی تھی۔ وہ جیسے موت کے بھاری پتھر کو

ہٹا کر واپس پلٹا تھا۔

"اور اب تم اپنا بہت خیال رکھو گے۔ یہ دوائیں پابندی سے استعمال کرنی ہیں ابھی۔ ذرا بھی لاپروائی نہیں ہونی چاہیے۔"

خیام نے دواؤں کی تھیلی ساجد کو تھمائی۔

"میں خود خیال رکھوں گا اس کا' ایک پل کو نظر سے دور نہیں کروں گا۔ ہر دوا' ہر پرہیز کروانا میری ذمہ داری ہے اب۔ خیام بیٹا! تم بالکل فکر مت کرو۔" ساجد کے باپ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بڑی پرزور یقین دہانی کروائی۔

اور اس بار وہ ایسا ہی کرنے والا تھا۔ یہ خیام کو یقین تھا۔

"اور اب میں آپ کے نئے اسکول میں پڑھنے بھی آؤں گا خیام بھائی!" ساجد چلتے چلتے ذرا رکا تھا۔ "مجھے داخلہ تو مل جائے گا نا۔۔۔ تھوڑا سا بڑا ہو گیا ہوں نا میں' اب چھوٹے بچوں کے ساتھ۔"

شوق' حسرت' جھجک' سب ہی کچھ تو تھا۔

"تم بالکل بھی بڑے نہیں ہوئے ہو اور تمہیں کیا لگتا ہے معاذ بھائی تمہیں پڑھائے بغیر بڑا ہونے دیں گے؟ ابھی سے انہوں نے تمہاری کتابوں کا سیٹ الگ کروا رکھا ہے' خاص میری الماری میں۔ آکر دیکھنا تم۔"

خیام کی دی ہوئی اطلاع اس کے لیے کسی طاقتور ٹانک سے کم نہیں تھی۔ اس کے کمزور چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ پھیلی تھی۔ "سچ!"

"ابھی ابا سے اجازت بھی لے لیں۔" اسے شاید اپنے باپ پر اب بھی مکمل بھروسا نہیں تھا۔

"خالو نے اجازت دے دی ہے' بلکہ وہ خود تمہیں لے کر آئیں گے اسکول۔ جاؤ! اب دیر مت کرو۔ خالہ بتول تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

ساجد کے باپ نے بڑی مشکور نگاہوں سے خیام کی طرف دیکھا۔

"میں ضرور لے کر آؤں گا ساجد کو اسکول' مگر جو احسان تم نے اور معاذ نے ہم غریبوں پر کیا وہ۔۔۔" بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر صرف ہاتھ جوڑے تھے۔

خیام نے بے ساختہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"اگر آپ اس سب کو احسان سمجھتے ہیں تو جواباً" ایک احسان آپ بھی ہم پر کردیں۔۔۔ آئندہ کسی اور بچے کو کم از کم آپ ساجد نہ بننے دیں۔ اس گندے ترین کام سے الگ ہو جائیں۔ خدا آپ کی کمائی میں بہت برکت دے گا۔ دیکھیے گا۔" خیام کی آواز دھیمی تھی۔ اس نے جواباً" اثبات میں سر ہلایا۔

"جائیں! دھوپ تیز ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ باری باری ساجد اور اس کے باپ سے گلے ملا۔ آج ساجد کا باپ کسی سے اسکوٹر مانگ کر لایا تھا۔ دواؤں کی تھیلی اس نے ہینڈل میں لٹکائی۔

خیام اس جگہ کھڑا انہیں جاتا ہوا دیکھے گیا۔

ہینڈل سے لٹکی ہوئی تھیلی دور تک نظر آتی رہی۔

ایک احسان' جو وہ اس پر کر گئی۔

ایک تلخ سی مسکراہٹ خیام کے لبوں پر آئی۔

کل شام سے اب تک وہ کتنے ہی متضاد خیالات سے گزرا تھا۔

گیتی کا پرسکون چہرہ' نظر آتا ہائی کلاس طرز زندگی' سب ہی کچھ خلاف توقع تھا۔ پتا نہیں کیوں' مگر اس سارے

عرصے میں جب بھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے مڑ کر پل دو پل کے لیے ہی دیکھا..... گیتی کو اپنے لیے آنسو بہاتے ہوئے محو انتظار ہی پایا تھا۔

واپس نہ جانے کے پکے ارادے کے ساتھ اگر تھوڑا سا گلٹ تھا تو وہ صرف گیتی کے نام کا ہی تھا۔ نہ بقیہ گھر والوں کی ذرا سی بھی انسیت' نہ نانی ستارہ کی محبت اور بڑھاپے کا ہی خیال.....

مگر گیتی.....

دانتوں تلے لب کو دباتے ہوئے اس نے اس ایک نام پر بھی خاک ڈالنی چاہی' جو اندر کہیں اچانک بہت توڑ پھوڑ مچانے کا سبب بنا تھا۔ وہ کب بھولا تھا اسے؟

"سب ڈراما' سب دکھاوا' نگینہ خالہ کی بیٹی کو اور کیسا ہونا تھا۔ چار پیسے مل گئے تو ہو گئی زندگی مکمل۔ اب چاہے کسی عیاش کروڑ پتی کی بیوی بنی ہے یا....." اگلے خیال کو اس نے سامنے پڑے پتھر کی طرح ٹھوکر سے اڑایا۔ وہ ابھی تک اسپتال کے احاطے میں ہی کھڑا تھا۔

"سو جب یہ طے ہے کہ مڑ کر دیکھنا کب کا منع ہو چکا ہے۔ سو پھر یہ دکھ منانا بھی کیا ضروری ہے۔" گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے خود کو تسلی دی مگر اب یہ اتنی کارگر بھی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

شام ریشمی' مخمور' دل نشین اور پر سکون!

خنک' بڑے سارے ہال میں مہکتا ہوا سرمئی اندھیرا اترا تھا۔

نبیل نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس محفوظ و مامون ماحول کو دل ہی دل میں سراہا۔ "اگر اس کے بس میں ہو تو شاید وہ ساری زندگی بھی یہاں سے قدم نہ نکالے۔"

"ساری زندگی؟" اندر کہیں ایک کمینی سی ہنسی ابھری تھی۔ "ساری زندگی اسی ایک پر اکتفا کیا ہو گیا ہے تمہیں نبیل صاحب؟"

"چلو! ساری زندگی نہ سہی' اگلے کافی سارے سال تو وہ یہاں بخوشی گزار ہی سکتا ہے۔" کچھ جھینپ کر اس نے خود ہی اپنی تصحیح کی۔ "اس اعصاب کو مستقل توڑتے ماحول میں زر تاج جیسی عورت کے ساتھ رہنے سے تو..... آخ!!"

پتا نہیں اس نے کس پر تھوکنا چاہا تھا۔ زر تاج پر یا اپنی اوقات پر۔

الماس ابھی ابھی اٹھ کر گئی تھی۔

حسین' کم عمر' دل ربا اور کسی بھی مرد کو پاگل بنائے رکھنے کے ہر ہنر سے واقف۔

نبیل کے پچھلے تین چار ہفتے کسی خواب میں کٹے تھے اور اب اس حسین خواب کے اختتام پر پھر سے بد فطرت' بد زبان' زہریلی زر تاج کا سامنا نا گزیر تھا۔

نبیل کے موبائل نے ایک بار پھر یاد دہانی کروانی شروع کی۔

منہ ہی منہ میں کسی نہ کہے اور سنے جانے والے القاب سے زر تاج کو نوازتے ہوئے سیل فون کان سے لگایا۔

"تم آ رہے ہو کراچی واپس یا میں یہ بھی کسی کی ڈیوٹی لگاؤں کہ وہ تمہیں ابھی اسی وقت پہلی فلائیٹ سے زبردستی وہاں سے روانہ کر دے بے وقوف آدمی؟" دوسری طرف سے وہ حلق کے بل چلائی تھی۔

"آرام سے بات کرو زر تاج! میں اگر تمہاری بد مزاجی کو جھیلتا رہا تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ تم جب چاہو میری بے عزتی کر دو۔" خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے جو تھوڑا سا رعب جتانا چاہا تھا' وہ بھی بس یوں ہی گیا۔

"بکواس بند کرو' یہاں اگلی پیشی پر تمہارا کورٹ کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔ ٹھیک تین بعد کی تاریخ ہے اور اگر تم نہیں آتے تو کیا پتا پولیس تمہیں لاہور سے ہی گرفتار کر کے لے آئے تو اپنی رہی سہی عزت کو بچانے کے لیے بہتر ہو گا کہ خود ہی آجاؤ۔"

یہ اس کا وہی مخصوص انداز تھا' جب وہ کسی کو مرنے کی حد تک خوف زدہ کرنے کی ٹھان لیتی تھی۔

کئی بار وہ اس تجربے سے گزرا تھا اور ہر بار زر تاج اسے خوف زدہ کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

مگر اس بار وہ ایک مختلف پچ پر کھیل رہا تھا۔

"مجھے بہت تیز بخار ہے زر تاج! اور میں فوری سفر کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ آجاؤں گا ایک دو دن میں اور مجھے پتا ہے کہ تم بہر حال اس معاملے کو سنبھال ہی لو گی' سو پھر یہ گھبراہٹ کیسی؟" اس بار اس کے اطمینان نے زر تاج کو خوف کا گھونٹ پینے پر مجبور کیا تھا۔

"تم ایسے حالات کو ڈیل کرنے میں مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہو زر تاج! اور رہی بات پولیس کو تکلیف دینے کی تو ایسا نہ ہی ہو تو اچھا ہے' ورنہ پھر کہیں بات انٹرپول تک نہ پہنچ جائے..... ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے معنی خیز سی خاموشی چھائی تھی۔ نبیل کے چہرے پر آئی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔ بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔

"کاش! وہ زر تاج کی زندگی کے کمزور ترین پہلوؤں پر ابتدا سے ہی ہاتھ رکھتا تو وقت زیادہ سہل' زیادہ کامیابیاں سمیٹتا ہوا گزرتا۔" اپنی ذہانت پر غرور اور پچھتاوا' آج کل ساتھ ساتھ ہی گھیرتا تھا۔ یہ سوچنے کی زحمت اٹھائے بغیر کہ زر تاج جیسی ذہین عورت کے لیے یہ ایک وقتی سی رکاوٹ ہے۔

"مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"نہیں۔ صرف یاد دلا رہا ہوں کہ لندن کچھ ایسا بھی دور نہیں اور ہمارے خاندان کی تاریخ میں ایسے کارنامے.."

"تم ہمارے خاندان کا حصہ نہیں ہو نبیل! اور یہ کہ مانی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ میرے پہلے شوہر کی اولاد ہے۔" سرد لہجے میں بات کاٹتے ہوئے اس نے نبیل کا مقام متعین کیا۔ "اور بہتر ہو گا کہ تم واپس آجاؤ جلد سے جلد' یہاں اب تمہاری غیر موجودگی زیادہ دیر نہیں چل سکے گی۔ سالار ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہے اس کیس کے' وہ تو میرے کانٹیکٹس اس سے کہیں زیادہ ہیں جو۔"

بات خود بخود سنجیدہ موڑ پر آئی تھی۔

اپنی اپنی جگہ دونوں ہی کو پتا تھا کہ یہ وقت بہر حال آپس کی محاذ آرائی کا نہیں ہے۔ نبیل کو ایک آدھ دن میں اپنی واپسی کا پکا وعدہ کرنا ہی پڑا۔

"اور اب مزید ایک پیسہ بھی اس ڈانسر کو دینے کی ضرورت نہیں جس کے در پر تم مہینے بھر سے پڑے ہو۔"

حرف آخر وارننگ بھی تھا اور حکم بھی۔

زر تاج نے اس سے آگے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی' سو بات ختم ہوتے ہی فون بند کیا تھا۔

نبیل نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔ یہاں کے روز و شب میں حد درجے احتیاط کے باوجود' وہ پھر پکڑا جا چکا تھا۔

حالانکہ اس بار وہ زر تاج کے لاہور والے گھر میں بھی نہیں رہا تھا' ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور بظاہر آس پاس زر تاج کا کوئی پالتو اسٹاف ممبر بھی نہیں تھا۔

"پھر بھی....." ایک مایوسی بھرا تجزیہ کسی بھی سوال کا جواب دیے بغیر مکمل ہوا۔

الماس دوبارہ کمرے میں آئی تو نبیل کو پہلے جیسے موڈ میں نہیں پایا تھا۔

"تمہارے ملازم سخت ناقابل بھروسا ہیں' میں نے تمہاری امی سے کہا بھی تھا کہ جب میں یہاں ہوں تو کم سے کم لوگوں کو میری موجودگی کا علم ہو' مگر تمہارے ہاں تو نکموں کی فوج بھری ہوئی ہے۔ ہر وقت رش لگا رہتا ہے۔" نبیل کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

فوری طور پر تو الماس سمجھ ہی نہیں پائی کہ آخر وہ کس بات کا غصہ اتار رہا ہے.... مگر یہ کھلم کھلا تنقید اسے بھی کہاں گوارا تھی۔

"وہ سب پشتوں سے ہمارے گھرانے کے ساتھ جڑے ہیں نبیل جی! اور ہمارے ہاں وفاداریوں کی بڑی قدر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی غیر ضروری نہیں ہے ہمارے لیے۔ اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔"

ہزار کوششوں کے باوجود بھی ڈانسر کے لیول سے اوپر نہ اٹھنے والی الماس کے لہجے میں بھی وہی تمکنت ذرا دیر کے لیے اترنے لگی جو کہ نانی ستارہ کے گھرانے کو بقیہ برادری سے علیحدہ کرتی تھی۔

نبیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔

"لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے' ٹکے ٹکے کی بخشش کے لیے امیدیں لگانے والے نیم نشہ بازوں کا ایسا مان سمان۔"

"دھت!" اس کے دل میں چھپا تمسخر اس کے انداز سے عیاں ہوا تھا۔

"ملازم ملازم ہوتا ہے۔ تنخواہ دی اور کام لیا' کام پسند نہ آیا تو دوسرے ہی لمحے نکال باہر کیا.... خیر چھوڑو۔" اس نے الماس کا ہاتھ تھاما۔

وہ یہاں بیٹھ کر ایک فضول سی بحث میں وقت ضائع کرنے والا نہیں تھا اور سچ تو یہ کہ اگر الماس اسے اتنی زیادہ پسند نہ آچکی ہوتی تو شاید اب تک وہ کسی اور طرف کا رخ کرچکا ہوتا۔

"میں جارہا ہوں۔ یاد کرو گی؟"

"میں آپ کو جانے نہیں دینے والی۔" وہ دل ربائی سے مسکرائی۔ "ویسے بھی آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اس بار ہمارے رشتے کو مکمل نام دیں گے۔ ایک پہچان...."

نبیل نے کچھ اضطراب سے پہلو بدلا۔

ان سارے سحر انگیز لمحوں میں یہ کڑوا بادام کتنی ہی بار منہ میں آیا تھا اور ہر بار اسے الماس اور گلناز کی جسارت پر حیرت کم اور غصہ زیادہ آیا تھا۔

لاکھوں روپے وصول کرلینے کے بعد بھی یہ شادی کا چاؤ۔ الماس کا اصرار بڑھنے لگا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں الماس! لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ میں تم سے شادی کرسکوں بہت سارے مسئلے حل کرنے ہیں ابھی۔"

اتنے دنوں میں وہ یہ جواب اتنی بار دے چکا تھا کہ اب خود بخود ہی رٹا رٹایا سا انداز ہوچکا تھا۔ الماس کو بڑی سخت توہین محسوس ہوئی تھی' گلناز کی سختی سے ہدایت تھی کہ اس بار نکاح نہ سہی وہ اپنے نام کوئی کوٹھی' بنگلہ تو ضرور ہی کروالے اور خود الماس کے دل میں بھی خالہ زاد بہنوں کی کوٹھیاں پھانس بن کر اٹکی تھیں۔

"کچھ تو ایسا ہو' جو مجھے نہ سہی' امی کو ہی اطمینان دلادے۔" بڑی آہستگی سے اس نے نبیل کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"کیا مطلب! ابھی تک انہیں میرا اعتبار نہیں آیا۔ کتنے تحفے' کتنا خرچا کرچکا ہوں میں' اس بار جو جیولری میں نے تمہیں دی ہے اس کی قیمت کا اندازہ ہے تمہیں...." کم ظرف نودولتیوں کی طرح اس نے فی الفور اپنی اوقات دکھائی۔

الماس کی پیشانی پر آیا بل اور بھی گہرا ہوا۔

"چند لاکھ کے زیورات اتنی بڑی دلیل تو نہیں ہیں' اس سے کئی گنا ہم استعمال کرکے بھول بھی چکے ہیں نبیل!" بے نیازی سے کہتے ہوئے وہ اٹھنے لگی تھی' تب ہی نبیل نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا' اس بار اس کی گرفت سخت تھی۔

"میری چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے تمہاری نظر میں' اتنی قیمتی! لاکھوں خرچ ہوئے ہیں۔"

"قیمت تحفے کی کب ہوتی ہے نبیل صاحب! قیمت تو اس کی ہوتی ہے' جسے تحفہ دیا جارہا ہے اور دینے والے کے دل میں اس کے مقام کا تعین بھی وہیں ہوجاتا ہے۔"

"الماس! الماس!" باہر سے گلناز نے بڑی میٹھی آواز میں پکارا تھا۔ الماس نے چونک کر اپنا ہاتھ نبیل کی گرفت سے چھڑایا۔ اپنی ماں کے ہر اشارے سے وہ پوری طرح مانوس تھی۔

نبیل کے حصے میں آیا وقت ختم ہوچکا تھا۔

"الماس بیٹا! گیتی کا فون آیا ہے' تمہیں پوچھ رہی ہے۔ بات کرلو بہن سے۔"

گلناز بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی کمرے سے داخل ہوئی تھی' اس بار الماس نے کمرے سے نکلنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ گیتی کا حوالہ اس کی ماں نے کیوں دیا ہے۔

"میری بھانجی کا فون ہے۔ بہت امیر آدمی کی بیوی ہے بڑی عزت سے بیاہ کرلے کر گیا تھا وہ اسے' یہیں سے' خالہ ستارہ کے چوبارے سے' یہ بڑی کوٹھی ادھر لاہور میں اس کے نام کی اور باقی دینے لینے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی اس نے۔"

رک کر گلناز نے اس کے چہرے پر ایک کھوجتی ہوئی نظر ڈالی وہ ذرا بھی متاثر نظر نہیں آرہا تھا' الٹا ایک طنزیہ سا تاثر! مذاق اڑاتی سی کیفیت!

گلناز کو سمجھنے میں محض لمحہ لگا کہ وہ اس کی باتوں کو جھوٹ کا پلندہ سمجھ رہا ہے یا ویلیو بڑھانے کی بڑی سستی سی کوشش! ایک دبی دبی سی سانس گلناز کے لبوں پر آئی تھی۔

الماس کے حوالے سے جو ایک خواب دیکھنے کی غلطی وہ کرنے لگی تھی اس کی تعبیر بہرحال نبیل نہیں تھا! خواب ٹوٹنے سے زیادہ افسوس اسے اپنی ناسمجھی پر ہوا تھا۔ نبیل جیسے کاغذی رئیس کو اس کی اوقات سے زیادہ منہ لگانے کی غلطی اس ایک خواب کی دین تھی۔

یہاں بھلا رشتہ داریوں کی گنجائش قدم قدم پر کہاں تھی؟ ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کی خوش بختی تھی نہ ہر لڑکی گیتی کا سا مقدر رکھتی تھی اور نہ ہی آنے والوں پر سالار کا سایہ بھی پڑا تھا۔

جلتی ہوئی آنکھوں اور بھاری دل کے ساتھ وہ حقیقت کی طرف پلٹی۔

"ہم فن کی میراث کو آگے بڑھانے کے پابند ہیں نبیل صاحب! ہمارے گھرانے کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ کلاسیکل میوزک میں بیگم ستارہ جان کے مقام سے کون واقف نہیں۔ میری بھانجی صندل اس وقت ٹاپ کلاس ہیروئن ہے اور دوسری ایک اعلا خاندانی شخص کی بیوی۔"

نبیل کے چہرے پر مذاق اڑاتی کیفیت اور بھی گہری ہوئی تھی۔

"کون سے نمبر کی بیوی' دوسری' تیسری' چوتھی یا پھر ایسے ہی۔"

باقی آئندہ شمارے میں

ایلیا یقین

اُجالا ہونے کو ہے

"اف پھر یہ نمی سے بھرا دن۔"

"گرمی میں ہلکی خنکی یا سردی میں گرمی بلا۔"

نمی اتنی کہ جیسے ہوا نے پانی کے گھونٹ بھرے ہوں' جیسے بچپن میں۔۔۔ میری ماں کی تلی ہوئی ڈبل روٹی جس میں چکنائی کے قطرے مجھے حلق سے اترتے محسوس ہوتے تھے۔

یہ نمی سے بھرے دن اور سیلن زدہ دیواروں جیسی راتیں مجھے ہمیشہ اندر تک آنسوؤں سے بھگو دیتی ہیں۔

چاہے نسیمہ نے پونچھا لگانے کے بعد گیلے فرش پر چپل کا نقش چھپنے سے پہلے پنکھا چلا دیا ہو۔

چاہے اسما نے ریاضی کے ٹیسٹ میں زیادہ نمبر لیے ہوں۔

میری کیاری کے سب پودے بخیریت ہوں اور سراج نے مجھے پھول لا دیے ہوں۔۔۔ پھر بھی میں اندر سے بھیگی ہوئی ہوتی ہوں۔

کیوں کہ میں ایک عورت ہوں۔

اور۔۔۔ عورت لمحوں کی قیدی ہوتی ہے۔۔۔ وہ قید رہنا چاہتی ہے۔

محبت کے اظہار کے لمحے میں۔۔۔

دکھ کے سمے میں۔۔۔

کچھ پا لینے کے وقت میں۔۔۔

کچھ کھو دینے کے احساس میں۔۔۔

لمحے اور موسم۔۔۔ ماہ و سال۔۔۔ سب کاغذ ہوتے ہیں اور ان پر بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔

عورت کے لیے بھی اور مرد کے لیے بھی۔۔۔

مرد اپنا لکھا بھول جاتا ہے' کھو دیتا ہے۔

عورت ہر سال پچھلے اور اس سے پچھلے سال کی یاد مناتی ہے۔

گویا وہ نئے کاغذ پر پرانے سال کی فوٹو کاپی کر لیتی ہے کیوں کہ وہ قیدی ہوتی ہے۔۔۔ اور وہ ان سب لمحوں سے آزادی نہیں چاہتی۔

ایک وقت بچپن ہوتا ہے' جو پتھر جیسا ہوتا ہے۔

اعلا اور وزنی۔۔۔ میرے پاس ایسے بہت سے پتھر ہیں۔

مجھے چیختی آوازوں سے خوف آتا ہے۔ غصے بھرے الفاظ مجھے سہما دیتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے غصہ بالکل نہیں آتا۔ اس لیے نہیں کہ میں بہت بردبار ہوں' اس لیے کہ شاید۔۔۔ انسان ہر جذبہ خاص مقدار میں لے کر پیدا ہوتا ہے اور میں جتنا غصہ لے کر پیدا ہوئی' وہ سب کا سب میں خود ہی سہہ کر ختم کر چکی ہوں۔

بوڑھے بہت سے جذبوں سے شاید اسی لیے عاری ہوتے ہیں کہ وہ برداشت کرنے کی ساری توانائی ختم کر چکے ہوتے ہیں۔۔۔ اور اب میرا جی چاہتا ہے کہ کاش! نسیمہ کے لگائے ہوئے پونچھے پر کوئی چپل نہ رکھے۔ اسما کے ریاضی میں خود ہی اچھے نمبر آجائیں اور کاش۔۔۔ مجھے ماضی یاد نہ آیا کرے۔

میرا ماضی ایک تنگ منہ والی صراحی جیسا ہے' کیوں کہ میرا باپ "پیر مزاج" آدمی تھا۔ اپنے دوستوں میں جتنا بھی مقبول ہو' لیکن گھر میں اس کی شکل فرعون جیسی ہو جاتی۔ اسے اپنی بات کے آگے ایک لفظ سننا گوارا نہیں تھا۔ پانی چند سیکنڈ دیر سے لانے پر جھپٹ پڑتا۔

کسی بات کا جواب اس کی مرضی کے مطابق نہ ہوتا تو طیش میں آجاتا۔ اس کا ہاتھ ڈرائیور' بچوں پر' غرض کسی پر بھی بڑی آسانی سے اٹھ جاتا۔ اس نے اولاد کو ہنر سکھایا نہ تعلیم دلائی پھر بھی وہ اپنی تعریفوں پر خوشی سے پھولے نہ سماتا۔

اس کی داڑھی سفید تھی مگر اس کی جذباتی عمر کبھی نوجوانی سے آگے نہ نکلی تھی۔ جانے کیسے جذبات تھے جو ختم ہونے کو نہ آتے تھے۔ اس نے اپنی جوانی میں بڑے عیش کر رکھے تھے۔ اسکول سے بھاگ کر سینما جانا' مہنگی چیزیں استعمال کرنا' میں نے خود ایک تصویر دیکھی تھی جس میں وہ نیکر پہنے ساحل پر کھڑا تھا اور اب۔۔۔

اب اس کی نمازیں اور عبادت ہمارے لیے بوجھ تھیں۔ اسے ظلم' تشدد اور خود نمائی کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔

اس کی نظروں سے تحقیر اور نفرت خارج ہوتی اور میرے اندر جمع ہو جاتی۔ رات کو مجھے اس کا سفید

ناخنوں والا کالا ہاتھ اپنے گلے کی طرف بڑھتا محسوس ہوتا۔ میں اکثر راتیں روتے ہوئے گزار دیتی۔۔۔وہ مچھروں اور حبس سے بھری راتیں۔۔۔دیواروں سے ٹکریں بار بار کر میری پیشانی پر نیل پڑ جاتے اور وہ کہتا۔
"کہو تو تمہیں خودکشی کا سامان لادوں؟ تم پھندا ڈال کر لٹک جاؤ۔"

میں تذلیل' خوف اور بے بسی کے آنسوؤں سے بھیگے ان لمحوں سے کبھی نہیں نکل سکی۔

سراج سے شادی کے بعد بھی میری کیفیات معمول پر نہ آسکیں۔ میں اس سے کبھی کچھ شیئر نہ کر سکی۔ کیوں کہ دکھ موندی آنکھوں سے دیکھے گئے خوابوں کی طرح ہوتا ہے' جو آپ کسی بھی طرح بیان کرلیں' مگر دکھا نہیں سکتے۔

پھر اسما کی پیدائش کے بعد مجھے ایک مشن مل گیا۔ بیٹی کو خوشیوں کی تتلیاں پکڑ پکڑ کر دینے کا مشن۔

میں نے اسے ہر وہ چیز دی جس سے میں محروم تھی۔ تعلیم' ضروریات' آسائشات اور ہنر بھی۔

میں نے نو برس کی عمر سے اسے سلائی سیکھنے بٹھا دیا۔ وہ زیادہ نہ سیکھ سکی۔ اسے دستکاری میں دلچسپی تھی۔ میں نے اسے وہ سب کچھ سیکھنے دیا جو وہ چاہتی تھی ۔ کڑھائی' بنائی' پینٹنگ' مہندی اور بھی بہت کچھ۔ گیارہ برس کی ہوئی تو میری خواہش پر اس نے سلائی بھی سیکھ لی۔ میری بارہ برس کی بیٹی اتنے خوبصورت اور نفیس کام کرتی ہے کہ مجھے یقین ہے خدانخواستہ کوئی برا وقت آیا تو وہ محتاج نہیں ہوگی۔

اگر وہ نہ کھیلے تو میں روزانہ شام کو اسے کھیلنے پر مجبور کرتی ہوں کیوں کہ یہ عمر میں نے جھڑکیاں اور غصہ پی کر گزاری تھی۔ میں اپنے گھر میں کبھی اسٹیل کا کوئی برتن نہیں آنے دیتی۔

میرے ماضی میں اسٹیل کے کئی برتن تھے' جن پر جابجا میرے باپ کے "آٹو گراف" تھے۔ جو بات بات پر جعلی پیروں کی طرح غصہ کھاتا اور جو چیز سامنے ہوتی' پھینک دیتا۔ رات جب میں برتن دھوتی تو ان ٹیڑھے میڑھے برتنوں کے نشانوں کے پس منظر جو مجھے ازبر تھے' رلایا کرتے۔

اب پھر وہی موسم آگیا' جس میں پانی فضا میں تیرتا پھرتا ہے۔

نسیمہ صبح گیارہ بجے بھی صحن دھوئے تو رات تک نمی کا احساس رہتا ہے۔ میں ماضی کا کھاتہ کھولے اپنے اندر اور باہر کی نمی محسوس کر رہی ہوں۔ سیلن زدہ دیوار جیسی رات دھیرے دھیرے اونچی ہو رہی ہے کہ اسما میرے پاس آئی۔

"امی! آج میرے ریاضی میں دس میں سے دس نمبر آئے ہیں۔" وہ مجھے ٹیسٹ پیپر دکھاتی ہے۔

میں چونکہ آج کل یاسیت میں جی رہی ہوں' سو میرے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے۔ "پچھلے ہفتے صفر بھی تو آئے تھے۔"

"تو کیا ہوا امی؟" اس کی ہنسی کھنک دار ہے۔ "وہ تو پچھلے ہفتے کی بات تھی' اب دیکھیں پورے نمبر آئے ہیں۔" اسے میری حوصلہ شکن بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں شرمندہ ہو جاتی ہوں۔

"دیکھیں امی! اگر میری ریاضی اچھی ہو جاتی ہے تو کیا ضرورت ہے مجھے صفر یاد رکھنے کی۔ میں نے ایک ہفتے میں محنت کر کے اتنا بہتر کرلیا ہے تو ظاہر ہے' اب اس ہفتے میں اسے کیوں یاد رکھوں؟ وہ تو ماضی ہے' حال میں تو مجھے اچھے نمبر ملے ہیں نا! آپ خوش نہیں؟"

اب وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتی ہیں۔

میں اسے دیکھے جاتی ہوں۔ وہ عورت نہیں ہے' انسان ہے۔ وہ ماضی میں جینا نہیں چاہتی۔ وہ حال کو بہتر کرنا چاہتی ہے حالانکہ میں نے اسے یہ ہنر نہیں سکھایا کیوں کہ یہ ہنر میں خود بھی نہیں جانتی ہاں! لیکن میں نے اس میں کبھی اپنے دکھ نہیں انڈیلے لیکن۔۔۔ اتنے اعتماد سے حال میں جینا بھی تو اسے میں نے نہیں سکھایا۔۔۔ یہ خدا کی دین ہے کہ وہ یہ ہنر لے کر پیدا ہوئی ہے۔

اور شاید۔۔۔ کہ میں بھی حال کے ماہ و سال پر خوشیاں لکھ سکوں کیوں کہ اب۔۔۔ مجھے سیلن زدہ دیوار جیسی رات سے مٹی کی خوشبو آرہی ہے جو انسان کے خمیر کا بنیادی عنصر ہے۔

☆

فوزیہ احسان رانا

حسنیٰ! تمہارے پاس پانچ ہزار روپے ہوں گے؟" ارسلان نے کچن کے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔ حسنیٰ نے مصروف سے انداز میں پلٹ کر ارسلان کو دیکھا۔

"جی ہیں۔ آپ کو ضرورت ہے؟" حسنیٰ نے کیتلی سے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ارسلان کو دیکھا۔

"وہ کل کشف کا کالج میں ایڈمیشن کروانا ہے اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" ارسلان دھیرے سے کہتا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا۔ حسنیٰ اپنی جگہ پر ساکت و صامت کھڑی جاتے ہوئے ارسلان کی پشت گھورتی رہی۔ بے خیالی میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کشف کالج جا رہی ہے۔ اب اس گھر کی لڑکیاں کالج جا سکتی ہیں کیوں کہ وہ گھر کی بیٹیاں ہیں اور جب میں اپنی ماسٹر ڈگری کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی تو کیسے میری تعلیم کو' میری قابلیت کو میری سب سے بڑی خامی بنا دیا گیا تھا۔" بہت ساری تلخ و شیریں یادیں اس کے دل و ذہن میں کلبلانے لگیں وہ چائے کا کپ لے کر کمرے میں آئی۔ ارسلان واش روم میں تھا۔

حسنیٰ نے اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹے کو چند لمبی لمبی سانسیں لے کر کمرے کی خاموش فضا میں تحلیل کر کے خود کو پر سکون کیا۔ وہ جب بھی اندر کے درد سے بے حال ہوتی' یوں ہی آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگتی ذرا سی دیر بعد وہ خود کو اس کیفیت سے نکالنے میں حتی الوسع کامیاب ہو جاتی۔ جب تک ارسلان واش روم سے نکلا' حسنیٰ خود کو ہشاش بشاش کر چکی تھی۔

"عدنان کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا ہے اور اس نے سب کولیگز کو آفس لنچ ٹائم میں مٹھائی کھلائی۔ بہت خوش تھا عدنان۔" ارسلان اب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔

"بہت خوشی کی بات ہے ارسلان!" حسنیٰ خوش ہو کر بولی۔ عدنان کی بیوی حسنیٰ کی چچازاد بہن تھی۔ عدنان اور عروبہ نے ہر مشکل وقت میں حسنیٰ اور ارسلان کا ساتھ دیا تھا اور صحیح معنوں میں رشتے دار ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

"ارسلان! پھر کب چلیں گے عروبہ کے ہاں؟" حسنیٰ کے اندر ایک نئی توانائی سی آگئی تھی۔ وہ بچوں کی طرح بہت پرجوش ہو رہی تھی۔

"جب کہو گی' چلیں جائیں گے مگر فی الحال فون کر کے دونوں کو مبارک باد تو دے دو۔" ارسلان حسنیٰ کے جذبات سے آگاہ تھا۔ عروبہ کو دوسرے بچے کی بہت خواہش تھی۔ وہ دس سال کے طویل عرصے بعد اب دوبارہ بیٹے کی ماں بنی تھی۔ حسنیٰ کی خوشی اس کے ہر ہر انداز سے عیاں ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اطمینان سے لان میں کرسی پر بیٹھے فون پر مگن ہو چکی تھی۔

ارسلان کی امی دو مرتبہ حسنیٰ کے پاس آئیں مگر اسے باتوں میں مگن دیکھ کر واپس لوٹ گئیں۔ وہ پوچھنا چاہتی تھیں حسنیٰ سے کہ آج کیا پکانا ہے۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی کنیز بیگم ہیں جو حقارت بھری نظروں سے بہو کو دیکھتی تھیں۔ ارسلان نے ابھی تعلیم مکمل ہی کی تھی کہ شادی ہو گئی کوئی جاب نہیں تھی اس کی اس وقت۔

حمنیٰ معصوم اور سادہ طبیعت لڑکی تھی اور اس کا جرم یہ تھا کہ ارسلان نے ماں کے سامنے بہت ضد کی اس نے ہٹ دھرمی کی انتہا کر کے حمنیٰ سے شادی کی تھی۔

کنیز بیگم اکلوتے بیٹے کی بے جا ضد سے ہار تو گئی تھیں مگر اندر ہی اندر انہوں نے حمنیٰ کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔ اپنی جھوٹی شان و شوکت اور کھوکھلی انا کو سرنگوں رکھنے کے لیے پے در پے غلطیوں پہ غلطیاں کرتی چلی گئیں۔

"بیٹا! آج کیا پکانا ہے؟" کنیز بیگم نے انتہائی عاجزی و انکساری سے حمنیٰ سے پوچھا۔ حمنیٰ کے مسکراتے ہونٹ یک دم سکڑ گئے۔ ایک تلخ یاد پوری سچائی سے اس کے تن من میں آگ سی بھر گئی۔۔۔

"اماں! آج کیا پکانا ہے؟" حمنیٰ نے سہمے سہمے انداز میں کنیز بیگم سے پوچھا تھا۔

"بی بی! یہ گھر میرا ہے۔ جو دل چاہے گا۔ پکاؤں گی تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔" کنیز بیگم انتہائی حقارت سے بولی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کو اپنی شاپنگ دکھا رہی تھیں جو آج کر کے لائی تھیں۔

"اماں! آپ صفوان کو گود میں بٹھا لیں۔ میں بنا لیتی ہوں کھانا۔" حمنیٰ نے پھر ان کا ارتکاز توڑ کر تھوڑی سی توجہ چاہی تھی۔

"بچوں کی آیا گیری مجھ سے نہیں ہو گی۔ پیدا کیے ہیں تو خود ہی سنبھالو بھی۔" انہوں نے نفرت سے حمنیٰ کو دیکھا اور کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگیں۔

حمنیٰ بے چارگی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

"عشق لڑانے کی آگ لگی ہوئی تھی بس۔ کالج اور یونیورسٹی میں یہی سب کچھ تو کرتی تھی۔ پڑھنا کیا خاک ہوتا تھا ایسی آوارہ نے۔" ان کی بڑبڑاہٹیں حمنیٰ کے اوسان خطا کر دیا کرتی تھیں۔ وہ روز جیتی اور روز مرتی تھی۔ اس کی قابلیت اس کی خوبیاں کنیز بیگم کی نظر میں خامیاں تھیں۔

"بیٹا! جو پکانا ہے بتا دو میں بنا لوں۔" کنیز بیگم کی آواز نے حمنیٰ کو ماضی سے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لیا۔

"اماں! جو آپ کا جی چاہے بازار سے لے آئیں۔" حمنیٰ سپاٹ چہرے پر نرم آواز میں بولی۔

"پیسے؟" کنیز بیگم ہچکچاتے ہوئے بولیں تو حمنیٰ اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ لوٹی تو کنیز بیگم وہیں کھڑی تھیں۔ ان کی اکڑ، ان کا طمطراق کب کا ختم ہو چکا تھا۔ ہر وقت ایک شرمندگی ایک خوف ان کی نظروں سے چھلکتا رہتا تھا۔

"یہ لیں پیسے اور جو آپ کا دل چاہے پکانے کے لیے لے آیئے گا۔" حمنیٰ تو ان کو کبھی بھی سخت سست نہیں سناتی تھی۔ بس وہ خود ہی اتنی عاجزی و انکساری سے رہتیں کہ حمنیٰ شرمندہ ہو جاتی۔ اس کا اپنا دل ملال سے بھر جاتا۔

"حمنیٰ!" ارسلان نے جلدی جلدی ناشتا بناتی حمنیٰ کو پکارا۔

"جی!" وہ متوجہ ہوئی۔ ارسلان کچھ چپ چپ سا تھا۔

"یار! وہ آج تم کشف کو کالج لے جانا ساتھ اور اس کا ایڈمیشن بھی کروا دینا۔ پیسے میرے پاس نہیں ہیں تم۔۔۔"

ارسلان نے بات ادھوری چھوڑ دی وہ جھجک رہا تھا وہ اس کے ہر درد سے واقف تھا کہ اس گھر کے مکینوں نے کیسے اسے خون کے آنسو رلایا تھا۔

"ارسلان! آپ ایسے کیوں بات کر رہے ہیں۔ میں کشف کو ساتھ لے جاؤں گی کالج۔ ڈونٹ وری۔" حمنیٰ نے محبت لٹاتی آنکھوں سے ارسلان کو دیکھا۔

"حمنیٰ! مجھے احساس ہے کہ میرے گھر والوں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اماں نے تو جو کیا سو کیا۔ ابا نے بھی بجائے اماں کو روکنے کے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔" ارسلان کی چمکتی آنکھیں دھندلی سی ہو گئیں۔

اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹکنے لگا۔

"پلیز ارسلان! وہ بڑے ہیں۔ اللہ انکل کی مغفرت فرمائے۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں کہ میری کالج میں نوکری لگ گئی۔ آپ کو بھی جاب مل گئی۔ خدا نے ہمیں بیٹوں کی نعمت سے نوازا۔ مشکل وقت کٹھن ضرور تھا مگر گزر گیا ہے۔ اسے یاد کر کے کیوں ہم غم زدہ رہیں۔" وہ بولی تو درد کے سائے ــــــــــــــ اس کے صبیح چہرے پر لرزنے لگے۔

"تھینکس۔" ارسلان تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھتا کچن سے نکل گیا تو حمنیٰ نے بہت دیر کے رکے ہوئے دو آنسوؤں کو بہہ جانے کی اجازت دی اور خود جلدی جلدی ناشتا ٹیبل پر لگانے لگی۔

"کشف! تم تیار ہو جاؤ آج تمہیں میرے ساتھ کالج جانا ہے۔" حمنیٰ نے کہا تو کشف جلدی جلدی سے تیار ہونے کمرے میں بھاگ گئی۔

وہ اپنے ہر عمل سے مطمئن اور پر سکون تھی۔ لیکن جب بھی اس کی نظر کنیز بیگم کی نظر سے ٹکراتی تو ان کی آنکھوں میں اتنی سراسیمگی خوف اور شرمندگی ہوتی کہ حمنیٰ جیسی (خدا کا خوف رکھنے والی) لڑکی لرز کر رہ جاتی اور اس کا دل چاہتا وہ آگے بڑھے اور ارسلان کی امی کو جھنجوڑ کر ان کے وجود سے لپٹے والہے اندیشے اور خوف اتار پھینکے مگر وہ جب بھی ایسا کرنا چاہتی اس ڈری سہمی عورت پر حقارت سے بولتی متنفر سے دیکھتی عورت کا وجود حاوی ہو جاتا اور حمنیٰ اپنے خول میں سمٹ جاتی۔

حمنیٰ نے کشف کا ایڈمیشن کروا دیا تھا۔

اب ارسلان پہلے حسان اور صفوان کو اسکول چھوڑنے جاتا پھر کشف اور حمنیٰ کو کالج ڈراپ کر کے آفس چلا جاتا۔ ارسلان اور حمنیٰ نے مشترکہ کمیٹی ڈال کر پچھلے سال گاڑی بھی خریدی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج حمنیٰ کا پروگرام عروبہ کی طرف جانے کا تھا۔ اس لیے وہ کالج سے سیدھی بازار چلی گئی تھی۔ اس نے عروبہ کے بیٹے کے لیے کچھ کپڑے اور کھلونے خریدے اور گھر آ گئی۔ اگلے دن اتوار کی چھٹی تھی اور اس کا دل تھا کہ ساس اور کشف کو ساتھ لے کر عروبہ کے گھر جائے گی۔

اس نے جلدی جلدی گھر کے کام سمیٹے اور کنیز بیگم سے کہنے کے لیے کہ وہ تیار ہو جائیں ان کے کمرے میں جیسے ہی داخل ہونے لگی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اسے سنائی دی۔ پھر وہ سسکیاں ہچکیوں میں بدلیں اور اگلے ہی پل کوئی زور و شور سے رونے لگا۔ حمنیٰ کے قدم دہلیز نے جکڑ لیے۔ وہ واپس پلٹنا چاہتی تھی مگر کسی نادیدہ قوت نے اسے گویا جکڑ کے وہیں منجمد کر دیا تھا۔ کنیز بیگم رو رہی تھیں۔

"ارسلان کے ابا! میں آج اس کی محتاج ہو گئی ہوں۔ جس کو میں حقارت سے دیکھتی تھی۔ کاش! تم سے پہلے میں دنیا سے رخصت ہو جاتی۔ اتنی ذلت اور شرمندگی تو نہ اٹھانا پڑتی۔۔۔ ارسلان کے ابا!"

وہ ارسلان کے ابا کی تصویر تھامے روئے جا رہی تھیں۔ حمنیٰ آگے بڑھ کر ان کو گلے لگانا چاہتی تھی۔ ان کے آنسو صاف کرنا چاہتی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ دل اداسی کی دبیز تہ تلے دبا جا رہا تھا۔

وہ بہت حساس دل کی پر خلوص لڑکی تھی۔ اس نے کنیز بیگم کے جھریوں بھرے تھکے ہوئے نڈھال چہرے پر نظر ڈالی تو اس چہرے میں سے ایک اور چہرہ ابھرا۔

رعونت بھرا چہرہ۔ حقارت بھری آواز۔ تمسخر اڑاتی آنکھیں۔ دل چیر دینے والے الفاظ۔ جلاتا سلگاتا نفرت سے معمور لہجہ۔

"اماں! مجھے بہت درد ہو رہا ہے پلیز مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔" حمنیٰ درد سے بلکتی تڑپ رہی تھی مگر وہ نفرت سے اسے دیکھتی گھر سے ہی نکل گئی

تھیں۔ درد سے بے حال حمنیٰ فرش پر گر گئی تھی۔ تب ہی اتفاق سے ارسلان گھر آگیا تھا۔ حمنیٰ نیم بے ہوش تھی۔ چھوٹا سا حسان رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ بچہ نہ جانے کب سے بھوکا صحن میں رل رہا تھا۔ ارسلان کی جان نکل گئی۔ اس کی جیب میں ایک کھوٹا سکہ نہیں تھا۔ مگر اس نے کہا کچھ بھی نہیں۔ حسان کو پڑوسن کے حوالے کر کے وہ حمنیٰ کو لے کر اسپتال پہنچا تھا۔ حمنیٰ نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ گھر سے اسے دیکھنے کوئی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کی فیس دوائیاں لینے کے لیے ارسلان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ تفکرات کی لکیریں اس کی کشادہ پیشانی پر ابھری تھیں۔ اس نے بے سدھ سوئی ہوئی حمنیٰ کو دیکھا اور رنج سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میری محبت نے تمہیں ذلت و خواری' ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں دیا حمنیٰ۔" جاب کے لیے صبح سے شام تک جگل خوار ہوتا تھا مگر کہیں بھی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ شاید ابھی خدا کو ان کی اور آزمائش مطلوب تھی۔

وہ انہی سوچوں میں غلطاں بیٹھا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پڑوسن خالہ حسان کو لے کر آئی تھیں۔ نہایا دھویا صاف ستھرا حسان ماں کو سامنے دیکھ کر ہمکنے لگا تو ارسلان نے اسے پکڑ لیا۔

"خالہ! آپ کی بہت مہربانی۔ آپ نے حسان کا خیال رکھا۔ ورنہ ہم اسے کہاں چھوڑتے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا!" وہ بولیں۔ پھر ذرا توقف سے دوبارہ بولیں تو ان کا لہجہ نم تھا۔

"بیٹا! میں نے کنیز کو بہت سمجھایا کہ اپنی بہو اور پوتے کو دیکھنے میرے ساتھ چلو مگر وہ نہیں مانی۔ ایسا تو انسان بے گانوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا جیسے وہ اپنے خون کے رشتوں کے ساتھ کر رہی ہے۔" ارسلان چپ چاپ اپنے ہونٹ کچلتا رہا۔ اپنی کم مائیگی کا جان لیوا احساس رہ رہ کر اسے کچوکے لگا رہا تھا۔

"حمنیٰ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" خالہ نے حمنیٰ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ! اس کی ایسی حالت کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے اس کے ہنستے مسکراتے چہرے پر زردی بکھیر دی ہے۔ میں حمنیٰ کو کوئی خوشی' کوئی عزت اپنے گھر میں نہیں دے سکا۔"

"بیٹا! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا' یہ وقت بھی گزر جائے گا۔" خالہ نے ارسلان کی ہمت بندھائی تو وہ بچوں کی طرح خالہ کے گھٹنوں پر سر دھرے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ خالہ نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہیں۔

خالہ اسپتال سے جاتے ہوئے ارسلان کی مٹھی میں چند ہرے نیلے نوٹ تھما کر حسان کو لے کر واپس گھر چلی گئیں۔ ارسلان حیرت سے گنگ اپنی ہتھیلی پر دھرے نوٹ دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے کہے بنا بھی ہمارے اندر کا حال جان لیتے ہیں۔ ہماری ضرورتیں' ہماری بے بسی اور ایسے لوگ عام نہیں ہوتے' خاص ہوتے ہیں۔

حمنیٰ کی گہری نیند سے آنکھ کھلی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ رہے تھے۔ اس نے اپنے پپڑی زدہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اپنے اطراف اجنبی در و دیوار کو دیکھا' پھر اس کا سویا ہوا ذہن جاگا اور کل کا واقعہ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ یاد آگیا۔ ارسلان ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا۔ حمنیٰ سے نظریں ملنے پر ایک ملال نے اس کے دل کو بوجھل سا کر دیا۔ حمنیٰ کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے احساسات سے عاری لگ رہا تھا۔

"آپ کی مسز بہت کمزور ہیں۔ اسی لیے آپ کے بے بی کا وزن کم ہے۔ ان کی غذا کا دھیان رکھیں اور ہاں ان کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ دوائیاں میں نے لکھ دی ہیں' باقاعدگی سے استعمال کروائیں۔" ڈاکٹر حمنیٰ کا گال تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئی تھی اور وہ دو نفوس خوشی کے موقع پر بھی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

"حسان... کہاں ہے؟" لفظ ٹوٹ کر حمنیٰ کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

"گھر میں ہے۔" ارسلان کی بات پر حمنیٰ نے مات دینے والی شکوہ کناں نظر اس پر ڈالی تو ارسلان احساس جرم کے حصار میں بند ہونے لگا۔ وہ چپ رہی۔

گھر آنے کے بعد بھی دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ گھر کے کسی فرد نے بھی کمرے میں جھانکا تک نہیں۔ ارسلان کا دل ندامت سے لبریز ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ آنسو پلکوں کی باڑھ پر رک کر ارسلان کا درد بڑھا رہے تھے۔ اپنوں کی بے گانگی و اجنبیت بھرے رویے' خون کے رشتوں کی بے حسی و سرد مہری اسے رلا رہی تھی۔

ان ہی بے کیف اور بے رنگ دنوں میں ایک خوشی نے ان کے مردہ تن میں جان ڈالی تھی۔ ارسلان کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔ حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اور وہ جو اپنے نفس کو ہر لمحہ' ہر پل مجروح ہوتے دیکھ کر پل پل جیتے تھے اور پل پل مرتے تھے۔ عزت سے جینے لگے۔ پیسہ ہاتھ میں آیا تو ان کا ٹوٹا بکھرا اعتماد بھی بحال ہونے لگا۔

صفوان ابھی چھ ماہ کا تھا جب حمنیٰ کو بھی کالج میں جاب مل گئی۔ وہ اپنے اللہ کی شکر گزار تھی۔ صفوان دو سال کا ہوا کہ ارسلان کے ابا وفات پا گئے اور کنیز بیگم کا سارا طنطنہ' ساری اکڑ نکل گئی اور اب وہ شرمندہ شرمندہ سی نظریں جھکائے رکھتیں۔

ارسلان نے کوئی بات جتائے بغیر گھر کی ساری ذمے داریاں اپنے کندھوں پر اٹھالیں۔ حمنیٰ بھی اس کے ساتھ تھی مگر اس کے دل میں گڑی کیل کسی طور نکل نہیں رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

حمنیٰ' عروبہ کے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔

"اماں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔"

"اور تم ان کے ساتھ اچھا کر رہی ہو؟" کوئی اس کے اندر سے چلایا۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔

"مانا تم لوگ ان کی اور ان کی بیٹیوں کی ہر ضرورت پوری کر رہے ہو۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہو مگر ان کو اس پشیمانی سے نکالنے کی کوشش نہیں کرتے' جو ان کو ہر لمحہ' ہر ساعت بے چین رکھتی ہے۔ رزق دینے والا اللہ ہے۔ انسان تو بس وسیلہ بنتا ہے۔ جو غلطی انہوں نے کی اور اپنے لیے شرمندگی خرید لی' کیا تم چاہو گی کہ وقت پھر بدل جائے اور یہی شرمندگی تمہاری آنکھوں میں تمام عمر کے لیے ٹھہر جائے۔ پچھتاوا تمہاری رگ و جان میں اتر جائے۔ وقت کو سنبھال لو' یہ آج تمہارا ہے' اس کا حق ادا کرو۔"

اس کے اندر کی لڑکی اسے آگاہ کر رہی تھی۔ حمنیٰ کا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا۔ وہ لرزتی ٹانگوں کے ساتھ کھڑکی کھول کر ڈریسنگ کے سامنے آبیٹھی۔ اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"میں ان کو کب شرمندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کی شکل دیکھ کر میرا دل کٹنے لگتا ہے۔ مگر میں کیسے بھول جاؤں اپنی ذات کی بے توقیری' اپنی اولاد کی ناقدری۔ بہت مشکل ہوتا ہے تلخ یادوں کو بھلانا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"لیکن میں ان کی طرح غلطی کر کے پشیمانی نہیں مول لوں گی۔ ان کی آنکھوں سے شرم' جھجک اور خوف کو مٹا کر اعتماد کی روشنی دوں گی۔ وہ ارسلان کی ماں ہیں۔ ان کا احترام مجھ پر واجب ہے۔ اللہ ان کو معاف کرے۔ انسان کسی کو سزا دینے پر قادر نہیں ہے۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت' جب ہم بدلہ لینے پر قادر ہوں۔"

✲ ✲ ✲

"او کے اماں جی! ہم جا رہے ہیں۔" حمنیٰ نے کنیز بیگم کی پیشانی چومی تو کنیز بیگم نے سرشار سے لہجے میں دعائیں دیتے ہوئے اپنی بہو کو گلے لگا لیا۔ ارسلان کے اندر ڈھیروں سکون و اطمینان اتر آیا۔

کشف اور حمنیٰ گاڑی میں بیٹھیں تو اماں نے آیتہ الکرسی پڑھ کر ان پر دم کیا۔ زندگی بہت سارے رنگ دکھا کر اب ہزاروں خوشیاں ان کے دامن میں ڈال رہی تھی۔ دن بہت چمکدار اور روشن تھا۔

✲

عظمیٰ محمود

"خالہ! خالہ جی!" وہ دھریک کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تلے مطالعے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں جب سات سالہ گڈو آن دھمکا۔ اسے دیکھتے ہی ان کے مہربان چہرے پر محبت بھری مسکان ابھر آئی۔ کاٹن کا سادہ سا مگر صاف ستھرا دوپٹا درست کرتے ہوئے انہوں نے کتاب بند کی اور ڈوری سے لگا چشمہ آنکھوں سے ہٹا کر گلے میں لٹکایا۔ یہ ان کی بھولنے کی بیماری کا بہت بڑا تدارک تھا' جو حاجی صاحب نے دو ماہ قبل ہی کیا تھا۔

"خالہ کی جان! کتنی بار کہا ہے کہ دروازے پر بیل دے کر اجازت لے کر دوسرے کے گھر جاتے ہیں۔"

انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ اس کے کپڑوں پر تیل کے ہلکے ہلکے دھبے تھے مگر وہ خود ہاتھ' منہ' پاؤں سمیت صاف ستھرا سلیقے سے بال جمائے رکھنے والا پیارا بچہ تھا۔

"مگر بجلی نہ ہو تو بیل کیسے بجائی جائے؟"

"پھر دروازہ کھٹکھٹا لینا چاہیے نا۔" وہ اسے لے کر کچن میں چلی آئیں۔ اپنے چھوٹے سے دوست مہمان کی تواضع کرنے۔

"اور اگر بندہ کتاب میں اتنا مصروف ہو کہ آواز نہ سنے پھر؟" وہ پھر شرارت سے گویا ہوا۔

"تو پھر سلام کر کے گھر والوں کو مخاطب کرتے ہیں بیٹا جی اور بلا اجازت کبھی کسی کے گھر داخل نہیں ہوا کرتے۔ جب تک کہ کچھ عجیب سا نہ دیکھو۔" کولر سے ٹھنڈا پانی نکال کر انہوں نے شربت کا ڈھکن کھولا۔

"عجیب سا دیکھنے کے لیے بھی تو گھر میں داخل پڑتا ہے نا!" وہ اکیسویں صدی کا حاضر دماغ بچہ تھا۔

"وہی کہا ہے نا بیل پر' کھٹکھٹانے پر اور آواز دینے پر کوئی نہ آئے اور دروازہ کھلا ہے تو مذہب میں چھوٹ ہے کہ گھر میں دیکھ لو' کوئی بیمار تو نہیں' کہیں چوری تو نہیں ہو گئی مگر ایک حد تک۔" انہوں نے پانی میں شربت گھول کر اسے گلاس پکڑایا۔

"خالہ جی! وہ آپ سے کام تھا۔" شربت پینے کے بعد غالباً گرمی کا اثر زائل ہو گیا تھا اور دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ہاں' ہاں' بول نا' ایسے کیوں پوچھ رہا ہے۔" انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"خالہ! اماں کہہ رہی ہیں کہ دو سو روپے دے دیں' اگلے ماہ لوٹا دیں گی۔" اس نے سر جھکا کر مدعا بیان کیا۔ وہ چھوٹا ضرور تھا مگر حد سے زیادہ حساس۔ یوں روز روز مانگنے آنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔

"اس میں اتنا شرمانے کی کیا بات ہے۔ خالہ بھی کہتا ہے اور غیروں کی طرح بات بھی کرتا ہے۔" وہ محبت بھرے انداز سے بولیں۔

پچاس' پچاس کے چار نوٹ انہوں نے تہہ کر کے اس کے کرتے کی بائیں جیب میں ڈالے۔

"اور یہ پانچ روپے تیری پتنگ کے لیے۔" پانچ کا سکہ انہوں نے اس کی دائیں ہتھیلی پر رکھا' جو اس نے خوشی خوشی وصول کر لیا۔ انہیں لگا ان کی چار ماہ کی حمیرا ایک دم سات سال کی ہو کر ان کے سامنے آ گئی ہو۔

پرندوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا تھا گویا مغرب

ہونے کو تھی۔ وہ وضو کی غرض سے سیڑھیوں کے نیچے بنے باتھ روم کی جانب بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

”اور لوگوں میں بہترین وہی ہے۔ جس کے اخلاق اچھے ہیں۔“

جون جولائی کے آگ برساتے مہینے میں انہوں نے کمرہ ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے دوبارہ دھویا' تاکہ گرمی کا کچھ تو اثر زائل ہو۔ حاجی صاحب کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اور پھر بجلی کا کیا بھروسا۔ اس وقت وہ برآمدے سے جھاڑو کی مدد سے پانی خشک کر رہی تھیں کہ بیل بجا کر گڈو آن دھمکا۔ اس نے آج آتے ہی ہلا نہیں مچایا۔ خاموشی سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے کی غرض سے صحن میں اکلوتے جھکے ہوئے بوڑھے دھریک کے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ یہاں سے ذرا پچھلی سائیڈ پر رضیہ بیگم نے بہت ساری سبزیاں اگا رکھی تھیں' جس سے پورا محلہ مستفید ہوتا تھا۔ وہ بڑی محویت سے اس عمر رسیدہ مہربان سی خاتون کو پھرتی سے صحن خشک کرتے دیکھنے لگا۔ اسے یہاں ہمیشہ سکون کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے گھر میں بھی سوائے ماں' باپ کے کوئی نہ تھا مگر ایسے سکون کا احساس نہیں' سناٹا' تنہائی اور اکیلا پن ہوتا تھا۔ اور یہاں کیسا سکون' کیسا ٹھنڈک کا احساس' میٹھا فرحت بخش ممتا کا لمس جو وہ کبھی اپنی ماں سے بھی محسوس نہ کر پایا تھا..... وافر مقدار میں ملتا تھا۔

”وہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے پتر! یہاں آجانا۔“ اسے وہیں دھریک کے سائباں تلے مجسمہ بنے دیکھ کر انہوں نے پکارا۔

اچھے بچوں کی طرح اس نے جوتے دروازے کے باہر ہی اتارے اور اندر چلا آیا۔ کمرے میں بالکل سامنے چار لکڑی کی کرسیاں اور پرانی سی میز رکھی تھی جس پر ایک صاف ستھرا کپڑا ڈال کر اوپر پلاسٹک کی شیٹ بچھائی گئی تھی' جس پہ لائبریری سے ایشو کروائی گئی دو کتابیں' ایک فاؤنٹین پین' کچھ سادے کاغذ دھرے تھے۔ دائیں بائیں دو چارپائیاں۔ ایک پر گاؤ تکیہ بھی تھا' دائیں جانب اوپر والی جگہ پر ایک تپائی پر ایک گروپ فوٹو فریم کیا گیا تھا۔ جس میں حاجی صاحب' ان کی بیگم رضیہ خاتون' بیٹا حسنین علی' بہو سمیرا اور چار ماہ کی پوتی حمیرا۔ تصویر کے آگے تسبیح اور ایک کھانسی کا سیرپ اور دل کے امراض کی کچھ دوائیاں رکھی تھیں۔ چارپائی کے پائنتی ایک الماری تھی' ساتھ ایک تپائی تھی' جس پر تیل' کنگھی' سرمہ اور اس طرح کی دوسری اشیا تھیں جبکہ کرسیوں والی سائیڈ پر بنی شلف پر برتن رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں نیا' انوکھا کچھ نہیں تھا مگر کچھ تھا ایسا کہ وہ بھاگ بھاگ کر اس گھر کا رخ کرتا۔

”خالہ! آج کیا پکایا ہے؟ میں اسکول سے سیدھا ادھر ہی آیا ہوں۔“ وہیں ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ کر اس نے دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا لیا۔ جبکہ رضیہ بیگم ٹیبل پر رکھی کتابیں درست کرتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دیے جا رہی تھیں۔

”تلی ہوئی مسالے والی بھنڈی اور ساتھ میں پودینے کی مزے دار سی چٹنی۔ تو کھائے گا نا؟“ مینو بتا کر انہوں نے بڑے مان سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”آہا' پھر تو بڑا مزا آئے گا آپ مجھے پلیٹ میں نکال کر دے دیں میں گھر جا کر کھا لوں گا۔ نہانا بھی ہے نا۔“ بیٹھ کر وہ نظریں جھکا کر تیز تیز بول رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں اسے عابدہ نے ہی بھیجا ہوگا اور وہ حساس سا بچہ ماں کا پردہ رکھتے ہوئے اپنا نام لے رہا تھا۔

”چل پتر! جیسے تیری مرضی۔ ویسے اسکول کا یونیفارم اتار کر گھر کے کپڑے پہن کر آتے نا۔ پھر یہاں دو نوالے میرے ساتھ لیتے اور باقی گھر جا کر کھا لیتے۔“ سالن نکال کر انہوں نے راکھ میں چند سوکھی ہوئی ٹہنیاں ڈال دیں جو ہلکے ہلکے سلگنے لگیں۔ پلیٹ کو ڈھک کر انہوں نے اسے پکڑا دیا اور خود دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اچھا خالہ! اللہ حافظ۔“ اس نے دروازے پر لٹکے ہوئے بوری کے پردے کو پرے سرکایا۔

”اللہ حافظ پتر! اماں کو سلام دینا اور کہنا کہ کبھی شکل ہی دکھا جایا کرے۔“ واپس آکر وہ چھلکے ڈالنے لگیں کہ حاجی صاحب کے آنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ گھر بھی حاجی صاحب کے گھر کی طرح قدرے پرانی طرز پر بنا ہوا تھا۔ بس فرق صرف اتنا سا تھا کہ ان کے گھر کی طرح یہاں سبزے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ نائلون کی چارپائی بچھائی ہوئی تھی۔ نائلون کبھی سرخ یا گلابی رہی ہوگی اب تو میل سے کالی تھی۔ اسٹیل کی پلیٹ اور چمچہ پلنگ کے کونے پر رکھا تھا' جس میں چند کابلی چنے' پیاز کے چھلکے اور کناروں پر تیز مسالوں والا سوکھا ہوا دہی اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہاں کسی وقت چاٹ تناول فرمائی گئی ہے۔ چارپائی پر ایک عدد تولیہ کے علاوہ گڈو کی جرابیں اور اسٹیل کا ایک گلاس بھی اپنی قسمت پر نوحہ کناں تھا۔

صحن کے ایک کونے میں ڈیوڑھی کے دائیں جانب (بطور استقبالیہ) کوڑے کے رنگ برنگے شاپرز تھے جن میں سے دودھ کے نچڑے ہوئے پیکٹ' بچا ہوا خراب سالن' پھلوں کے چھلکے کھلے عام مکھیوں اور بیماریوں کو دعوت طعام دے رہے تھے۔

غسل خانے کا دروازہ بند تھا' یقیناً کوئی نہا رہا تھا۔ اس کی دیوار کے ساتھ کھرا بنا ہوا تھا' جس کی ڈھائی انچ کی منڈیر پر کپڑے دھونے والا پیلا صابن' اور برش کے علاوہ برتن دھونے والا ہرا صابن بھی رکھا تھا۔

ڈیوڑھی کے بالکل سامنے کچن سے تقریباً پانچ فٹ دوری پر دیوار کے ساتھ غالباً کسی زمانے میں کیاریاں بنا کر کوئی سبزی وغیرہ اگانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی' جس کی باقیات ”دیکھو اور عبرت حاصل کرو“ کی عملی تفسیر تھیں۔

بائیں جانب برآمدہ تھا۔ سامنے ایک عدد کمرا' جو بیڈ روم بھی ہے اور گیسٹ روم بھی۔ برآمدے کے کونے میں واشنگ مشین تھی' جس کے ڈھکن سے میلے کپڑوں کا ڈھیر جھانک رہا تھا۔ کمرا ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے ایک پرانی میز پر روم کولر دھرا تھا۔ کولر کے اوپر سرسوں کا تیل' کنگھیاں' چھوٹا سا شیشہ' چند سکے' مسواک' ٹوتھ برش' ٹوتھ پیسٹ' گڈو کی اردو کی کاپی' اس کی پنسل وغیرہ آرام فرما رہے تھے۔

”ارے واہ! بڑے مزے کی خوشبوئیں آرہی ہیں۔“ راشد علی تولیے سے سر رگڑتے غسل خانے سے برآمد ہوئے۔ سر خشک کر کے انہوں نے گیلا تولیہ اور چارپائی پر پڑا تولیہ تار پر پھیلا دیا' ساتھ میں گڈو کی جرابیں بھی اور پلیٹ اور چمچہ لے کر کچن کی جانب بڑھ گئے۔

”مرغی پکائی ہے۔ آپ چٹائی بچھائیں بس دو پھلکے اور ڈال لوں پھر کھانا نکالتی ہوں۔“ وہ بڑے مصروف اور خوش گوار انداز میں بولی تھی۔

راشد علی کو حیرت کا بھرپور جھٹکا لگا۔ بیگم کا یہ انداز مہینے کے شروع میں ہی نظر آتا ہے اور آج غالباً چوبیس اپریل تھی۔

”یہ مہینے کی آخری تاریخوں میں ہمارے ہاں مرغی کیسے پک گئی؟“ بیگم کا خوش گوار موڈ دیکھ کر وہ وہیں دروازے میں ایستادہ ہو گئے۔

”کیوں مہینے کی آخری تاریخوں میں کیا ہم مرغی نہیں کھا سکتے؟“ ماتھے پر شکن لا کر اس نے قدرے ترچھی نظر سے میاں کو گھورا۔

”عابدہ! کیا تم نے آج پھر۔“ ان کے ادھورے جملے میں مفہوم واضح تھا۔

”ہاں بھجوا دیا ہے سالن ان کے ہاں۔“ وہ جانتی تھی سوال گندم جواب چنا والا معاملہ یہاں نہیں چلے گا مگر شتر مرغ کی طرح اس نے کچھ دیر کو اپنا سر ریت میں چھپا لیا۔

”میں یہ نہیں پوچھ رہا۔“ ان کو غصہ آگیا۔

”آخر کیوں عابدہ! تم دوسروں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاتی ہو؟ پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگا کرو۔“ غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"تم سے کیا مانگوں؟ تم تو خود مجھ سے لے کر گئے تھے کرائے کے پیسے۔" وہ ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم در در پر مانگنے کھڑی ہو جاؤ؟" دانت پیستے ہوئے انہوں نے اپنی آواز کو دبایا۔

"میں در در پر مانگنے نہیں گئی تھی۔"

"پھر کہاں سے لائی ہو؟" انہوں نے کچن کا دروازہ بند کر دیا اور خود اندر آ گئے۔

"خالہ رضیہ نے دیے ہیں۔" وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولی۔

"انہوں نے دیے ہیں یا تم نے مانگے تھے؟"

"مانگ لیے تو کیا قیامت آ گئی؟ اتنا پیسہ ہے ان کے پاس۔ دونوں میاں بیوی کماتے ہیں اگر پانچ سو میں لے آئی تو کون سا وہ فاقوں مر جائیں گے۔ ارے! ان کو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کیسے مشکل وقت میں ہم نے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ اگر کبھی وہ ہمارے لیے کچھ کر دیتے ہیں تو تمہارے کیوں پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟"

"ہم نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا مگر یاد رکھنا! اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو ہم یہاں کبھی نہ ہوتے۔"

"اچھا جاؤ' چٹائی بچھاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ سارا دن گھر کے کام دھندوں میں سر کھپاؤ اور وقت پہ کھانا بھی نصیب نہیں اس منحوس گھر میں۔"

"خود کھاؤ۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ اور یاد رکھنا! تمہارے اس فعل کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" کمرے میں گھس کر اندر سے کنڈی چڑھالی۔

کچن میں بیٹھی عابدہ نے تھوڑی دیر خود کو کوسا پھر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی پلیٹ بوٹیوں سے بھری اور ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر نوالے بنانے لگی۔ جبکہ کچن کی دیوار سے لگا گڈو ہولے ہولے سسک رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا آسمان سے کن من برستی بوندیں نہیں ہیں۔ یہ وہ پتھر ہیں' جو ابابیلوں نے ہاتھی والوں پر برسائے تھے۔ اپنا زخمی زخمی وجود سمیٹ کر وہ ڈیوڑھی پار کر گیا۔ وہ جانتا تھا اس درد کی دوا کہاں ہے۔

☼ ☼ ☼

حاجی صاحب' رضیہ بیگم کے ہمراہ بے سرو سامانی کی حالت میں تب یہاں آئے تھے' جب وہ مولوی عبداللہ تھے۔ آج سے پانچ سال پہلے جب دھرتی کو ایک عفریت نے ہلا کر رکھ دیا تھا' جہاں اس نے اور بہت سے معصوم خواب نگلے تھے' وہیں مولوی عبداللہ کا گھرانہ بھی تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی کھیتوں میں تھے جب قیامت ٹوٹی۔ پھر سب ختم ہو گیا۔

وہ دونوں اچھے وقتوں کے ساتھی محمد ماجد علی کے ہاں چلے آئے۔ پتا چلا' وہ تو کب کے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ دل بہت رنجیدہ ہوا۔ دنیا کی الجھنوں میں الجھ کر دونوں ایک دوسرے کے حالات سے غافل ہو گئے تھے۔ اب یہ جدائی سالوں کی نہیں' سانسوں کی تھی۔

"کوئی بات نہیں انکل! میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ یہاں رہیں۔ عابدہ آپ کی بہو اور گڈو آپ کا پوتا۔"

راشد علی کی باتوں نے بڑا حوصلہ دیا۔ سوچا چار' دن کی زندگی ہے' اچھا ہے' سکون سے بسر ہو جائے مگر عابدہ کا ہر وقت جگہ کی کمی کا رونا' خرچا پورا نہ ہونے کا رونا' ان دونوں کو کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کر گیا۔ بڑی دقتوں سے انہوں نے راشد علی کو منایا۔ گریجویٹی کی رقم ملی تو ایک گلی آگے چھوٹا سا گھر خرید لیا۔

وہ دونوں میاں بیوی گورنمنٹ اسکول کے ریٹائرڈ پرنسپل اور وائس پرنسپل تھے۔

عابدہ کا تعلق ایسے گھر سے تھا۔ سات بہن بھائیوں میں جہاں بمشکل تین وقت کا کھانا ملتا ہے۔ باپ دو بڑھتی عمر کی کنواری بیٹیوں کو بیاہنے کے چکروں میں گھر سے صبح منہ اندھیرے نکلتا اور جب لوٹتا تو تمام بچے سو چکے ہوتے۔ ماں سارا سارا دن کام کاج میں الجھی' اتنی فرصت بھی نہ ملتی کہ بال ہی بنا لے۔ سات بچوں میں بڑی پانچ بہنیں' جن میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ بھائی دونوں چھوٹے۔

راشد علی کے سنگ وہ ایسی رخصت ہوئی کہ سالوں میکے کا رخ نہ کرتی۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے خوب سپنے سجائے' اکیلے گھر پر راج کرنے کے' اپنی من پسند کے کھانے کھانے کے' خوب سارے کپڑے' میچنگ چوڑیاں' جیولری اور سینڈلز۔ یہ چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں اس کے لیے بہت اہم اور بڑی تھیں۔ شادی کے بعد اس نے جیٹھ کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہوئے ساس سسر ان کے حوالے کیے۔ نند تھی نہیں۔ سو اب راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ سارا سارا دن محلے کے گھروں میں گھومتی' دوستیں بناتی۔ پھیری والوں سے بھاؤ تاؤ کرتی رہتی اور گھر اس کی توجہ کا منتظر رہتا۔

گڈو کی آمد نے بھی اس کے معمول کو متاثر نہ کیا۔ میاں کی کمائی کو پندرہ دن میں اڑا دینے کے بعد آخری دن کسمپرسی کی سی حالت میں گزارتے ہوئے ایسے میاں سے لڑتی جھگڑتی کہ وہ پیسے کہیں باہر لٹا آتا ہے اور اسے خرچا پورا نہیں دیتا۔ گھر کی حالت دیکھ کر راشد علی نے مزید بچوں کی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ نا نیک بخت! اتنی سخت کھانسی ہے تجھے۔" رات کو پھر انہیں کھانسی کا دورہ پڑا تھا' باوجود آواز دبانے کے ان کی آواز اتنی اونچی ہو ہی گئی کہ حاجی صاحب اٹھ بیٹھے اور اس وقت وہ ان کے پاس کرسی ڈالے کبھی نصیحت کرتے' کبھی ڈانٹتے' پریشان ہو رہے تھے۔

"زیادہ نہیں' بس معمولی سی ہے۔ ابھی کف سیرپ کا ایک چمچہ لوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔" شدید کھانسی کے دوران انہوں نے بمشکل جملہ ادا کیا اور گلاس لبوں سے لگا لیا' جو ابھی حاجی صاحب لائے تھے۔

"کیسے فکر نہ کروں تیری۔ پگلی! تیرے علاوہ میرا ہے ہی کون اس دنیا میں ماسوائے اللہ کے۔" بولتے بولتے آواز بھرا گئی۔ پٹکے سے آنکھوں کو صاف کرنے لگے تھے۔

"آپ کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہیں' بس رات کو نجانے کیوں زیادہ ہو جاتی ہے۔ دن کو تو ٹھیک ٹھاک رہتی ہے۔" سیرپ کا ایک چمچہ پھر پانی کے چند مزید گھونٹ لے کر وہ دوبارہ سے چارپائی پر لیٹ گئیں۔

"صبح میرے ساتھ چلنا ہے۔ چیک اپ کے لیے بس مجھے کچھ اور نہیں سننا۔"

"ہاں۔ ہاں ضرور۔ کسی سرکاری ہسپتال کی پرچی بنوالیں۔ میں بھی چلی چلوں گی۔"

"ارے نہیں! سرکاری ہسپتال میں کیوں؟ اپنے باؤ خالد کے کلینک چلیں گے صبح۔ بڑا ہی پیارا بچہ ہے اللہ خوش رکھے۔"

"ہاں' جب وہ پیارا بچہ ٹیسٹوں کی لمبی لسٹ پکڑائے گا تو مولوی صاحب کو لگ پتا جائے گا۔" وہ جب غصے میں ہوتیں تو یونہی مولوی صاحب کہہ کر پکارتی تھیں اور ان کو تو جیسے یہ انداز دل سے پسند تھا۔

"تو کیا ہوا' کرالیں گے ٹیسٹ بھی۔ پریشان کیوں ہوتی ہے میری بیساکھی!" پنکھا دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے وہ ایک بار شریر ہوئے۔

"مگر میں پیسے نہیں دوں گی۔" وہ اعلان کرتے ہوئے بولیں۔

"کیوں؟ دوسروں سے مانگتا اچھا لگوں گا؟" انہوں نے شرم دلائی۔

"مجھے پتا ہے' آپ کبھی نہیں مانگیں گے۔ یہ آپ کی سرشت میں نہیں ہے۔"

"تمہیں پتا ہے' تم آج بھی پچیس سال کی نظر آتی ہو۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولے۔

"میں پھر بھی نہیں دوں گی۔"

"مگر کیوں؟ تم ایسی تو نہ تھیں۔ کبھی منتیں نہیں کروائیں۔" وہ حیرانی سے بولے۔

"وہ پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔" سر جھکا کے قدرے شرمندگی سے بولیں۔

"نہیں! اکٹھے پندرہ سو خرچ کر ڈالے؟ بیوی! اس عمر میں اتنا مہنگا کیا خرید لائیں؟"

"بس تھا کچھ۔ آپ مت پوچھیں۔"

"چل کوئی نہیں۔ خیر ہے۔ تم گھبراؤ مت۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اور پھر شکر ادا کر۔ اس سوہنے رب کا جس نے ہمیں دینے والوں میں چنا ہے' لینے والوں میں سے نہیں۔"

پیسے کہاں خرچ ہو گئے تھے وہ جان گئے تھے۔ وہ یہ جان گئے تھے کہ بیوی نے ان کے اپنوں کا پردہ رکھا ہے' وہ اپنے جو مشکل وقت میں کام آئے تھے۔ اپنے بستر کی جانب بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"عابدہ بیٹی! کہاں ہو؟" میاں کو دفتر رخصت کرنے کے بعد وہ بغیر ناشتا کے برتن دھوئے سونے کی تیاریوں میں تھی۔ گھر کی صفائی تو دور جھاڑو بھی نہ لگائی تھی جب اس نے رضیہ بیگم کے پکارنے کی آواز سنی۔ اسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ جوڑوں کے درد کی وجہ سے وہ گھر سے نکلنا موخر کر چکی تھیں۔ آج مہینوں بعد اس گھر کے در و دیوار نے ان کی آواز سنی تھی۔

"ہاں خالہ! ادھر ہوں۔" وہ صحن میں تھیں' جبکہ عابدہ واکل کے کپڑوں میں بنا چادر' بکھرے بالوں کے برآمدے میں چلی آئی۔

"راشد بیٹا کہاں ہے؟" انہوں نے جلدی سے اس کے میاں کا پوچھا۔

"خیر تو ہے نا خالہ! وہ تو دفتر چلے گئے۔" قدرے پریشانی سے وہ وہیں صحن میں چلی آئی اور چارپائی سے فالتو کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر سائیڈ پر کیا۔ وہیں سے ایک عدد دوپٹا برآمد کیا اور کندھے پر ڈال لیا۔

"خیر کہاں ہے' تیرے چاچے کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" وہ یونہی کھڑے کھڑے رو دینے کو تھیں۔

"اچھا میں ابھی فون کر کے بلاتی ہوں ان کو۔" چپل پہن کر اس نے اندر سے قدرے ڈھنگ کی چادر نکال کر اوڑھی اور گیٹ پار کر گئی۔ دو گلی چھوڑ کر پی سی او تھا۔ اس کو وہیں سے فون کرنا تھا اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ سارے خرچے کا تخمینہ لگا چکی تھی' جو راشد علی کے اس وقت ساتھ چلنے پر ممکنہ تھا۔ بعد کی بات اور تھی۔

بعض لوگوں کے دل ان کے ذہن کی طرح چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ "میں" سے لے کر "میں" تک ہی رہتے ہیں' کبھی اپنے مدار سے نہیں نکلتے۔ حقوق العباد سے نابلد۔ وہ الٹے پاؤں لوٹ آئی۔

"وہ خالہ! ان کو چھٹی نہیں مل رہی۔ لنچ ٹائم تک مل جائے گی۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔ ابھی ہمیں پرائیویٹ کلینک میں لے چلتے ہیں۔ پھر شام کو دیکھیں گے۔ پیسے تو ہوں گے نا آپ کے پاس' میرے ہاتھ میں جیسے سوراخ ہے' پیسے پاس آتے نہیں اور خرچوں کا آسیب پہلے منہ پھاڑے کھڑا ہوتا ہے۔"

وہ تیزی سے بول کر تقریباً" کھینچتے ہوئے گھر سے لے گئی کہ وہ کہہ ہی نہ سکیں کہ "مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔"

بھلا ہو حاجی صاحب کے شاگردوں کا' ان کو مسجد میں نہ پا کر وہ ان کے گھر چلے آئے۔ پانچ سالوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ حاجی صاحب مسجد سے غیر حاضر تھے۔ دروازے کھلے ہوئے تھے کسی انہونی کے احساس تلے وہ اندر چلے آئے اور فوراً" حاجی صاحب کو سرکاری اسپتال میں لے گئے۔ مگر رضیہ بیگم کے لیے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس واقعہ کے بعد گڈو نے کچھ مانگنا چھوڑ دیا تھا۔ عابدہ بھی نظریں جھکا کر ملتی تھی۔

وہ ان کو کبھی نہ بتا پائی کہ جس دن حاجی صاحب اسپتال گئے تھے۔ اس سے اگلے دن جن تین گھروں میں چوری ہوئی تھی' اس میں ایک اس کا گھر بھی شامل تھا۔ اس کی کمیٹی کے پورے ساڑھے تین ہزار چور لے اڑے تھے۔

فائزہ افتخار

آئی سنڈریلا

اس کی گندمی رنگت والے چہرے پہ لیمپ سے پھوٹتی کاسنی شعاعیں پڑ رہی تھیں جس سے اس کی رنگت ہلکی سی سنولا رہی تھی اور لانبی لانبی گھنی پلکوں کا لرزتا ہوا سایہ جو آدھے سے زیادہ رخساروں پہ پھیلا ہوا تھا وہ بھی اس کو مزید گہرا کر رہا تھا۔

گیلے گیلے ہونٹوں پہ ٹھہری مسکراہٹ۔

دائیں رخسار پہ پڑتا ڈمپل۔

گھنے ابرو جو درمیان سے ہلکا سا مل رہے تھے۔ ان میں بار بار اتار چڑھاؤ آ رہا تھا۔

سانس کا ہلکا سا سرگوشیانہ انداز۔

وہ سوتے ہوئے اتنی ہی پیاری لگ رہی تھی جتنی کہ کوئی بھی نو سال کی بچی لگ سکتی ہے۔

اور اس کے خوابوں میں ستارے زمین پہ ایسے ہی اتر رہے تھے جیسے کسی بھی نو سال کی بچی کے خوابوں میں اتر سکتے ہیں۔

وہاں ستارے تھے جو دن کے اجالے میں بھی دمک رہے تھے۔ وہاں چاند تھا جو بادلوں کی روئی میں پھنسا ہوا تھا۔ وہاں پھول تھے جو برف سے ڈھکی زمین کے اندر

سے سر اٹھا کے جھانک رہے تھے۔ وہاں کنیزیں تھیں جو ہاتھوں میں سونے چاندی کے بڑے سے تھال اٹھائے ہوئے منتظر تھیں۔ وہ تھال جو پھولوں سے بھرے تھے۔ پھلوں سے بھرے تھے اور چاکلیٹس سے بھرے تھے۔

اور وہ منتظر تھیں اس بائی جیسے چاند کی جو بادلوں کی گود سے دھیرے دھیرے اتر کے برف کے میدان پہ پاؤں دھر رہا تھا۔

وہی گندمی رنگت جو سفید بادلوں' سفید چاند اور سفید لبادے میں ہونے کی وجہ سے ذرا سی دب رہی تھی اور سنولاہٹ کو چھو رہی تھی۔

وہی لانبی پلکیں جو اس وقت اٹھی ہوئی تھیں اور ان میں سے جھانکتی سحر زدہ آنکھیں۔

چاند کی بائی پھسل کے برف کے فرش سے دو بالشت اوپر رہ گئی تھی جب یشا نے اپنا کبوتر کے انڈے جیسی گدلی سی رنگت والا پیر نیچے اتارا۔

مگر اس سے پہلے کہ اس کے تلوے سے لگی مٹی برف پہ دھبہ سے بنا دیتی' ایک کنیز نے آگے بڑھ کے اس گندے پیر کے نیچے اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ دوسری نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا۔۔۔ تیسری نے آگے بڑھ کے پھلوں سے بھرا تھال پیش کیا' جس میں سے یشا نے بڑے بڑے رس بھرے عنابی دانوں والا انگور کا گچھا اٹھا لیا۔

✡ ✡ ✡

"مہر! تم اپنی بے کار کی ضد سے چار چار زندگیاں داؤ پہ لگا رہی ہو۔"

رات کے اس پہر جب سیف کاٹیج کے دو مکین گہری نیند سو رہے تھے تو تیسرا مکین سیف اللہ جاگ رہا تھا اور وہ شاید پچھلے دو سال سے جاگ ہی رہا تھا۔ اس نے کریم کلر کے شلوار سوٹ پہ گہرے بھورے رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ کنپٹیوں سے سفید ہوتے بال' آنکھوں کے نیچے تفکر سے پڑی سلوٹیں اور کمزور پڑتی آواز' اسے اس کی اصل عمر سے دس سال آگے ظاہر کر رہے تھے۔ حالانکہ ابھی اس نے اپنی عمر کی بتیس بہاریں اور سات خزائیں دیکھی تھیں۔

سات خزائیں اس کی زندگی میں شادی کے تین سال بعد ہی آگئی تھیں۔

آتش دان میں تڑختی لکڑیاں' آگ کے لپکوں کے دیوار پہ ناچتے سائے۔

مغربی دیوار پہ بنی بڑی سی کھڑکی کے شیشے پہ تڑتڑ برستے بارش کے موٹے موٹے قطرے' کہیں کہیں زور سے گرتے اولے۔

بجلی کے چمکنے اور بادلوں کے گرجنے کے ساتھ ساتھ سیف اللہ کے گڑگڑانے کی آواز نے ماحول میں وحشت سی پھیلا رکھی تھی۔

"بہت ہو گیا مہر! ضد چھوڑ دو اور گھر واپس آجاؤ۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے' تم نے مجھے میری بچیوں کی شکل تک نہیں دیکھنے دی۔"

✡ ✡ ✡

یشا نے مسکراتے ہوئے کروٹ بدلی۔

اس کے گیلے گیلے ہونٹ کچھ اور بھیگے ہوئے تھے۔ سوتے میں منہ ایسے چل رہا تھا' جیسے وہ مزے لے لے کر کچھ کھا رہی ہو' پھر اس نے نیند کی حالت میں ہی ہاتھ کی پشت سے اپنے ہونٹ صاف کیے اور خوابیدہ آواز میں کہا۔

"ہم مم م۔۔۔ مزے دار۔۔۔"

اس کی نیند میں ڈوبی بھاری بھاری سی آواز میں بھی سرشاری اتنی نمایاں تھی کہ عقبی دیوار پہ بنی سنڈریلا کی قد آدم شبیہہ کے ہونٹ بھی کچھ اور کھل اٹھے۔۔۔ لیمپ کی کاسنی شعاعوں اور کھڑکی کی سفید جالی کے پردوں سے چھن کے آتی چاندنی میں اس دیوار پہ پینٹ ہوا وہ منظر بے حد واضح ہو رہا تھا۔

سفید پھولے پھولے سے لباس میں ملبوس سنہرے گھنگھریالے بالوں' نیلی آنکھوں اور دودھیا رنگت والی سنڈریلا ذرا سی جھک کر اپنے نازک سفید پیروں میں شیشے کی سینڈل پہن رہی تھی۔ اس کے نیم وا سرخ ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ ایسے پھوٹی پڑ رہی تھی کہ مصور کے فن کی داد نہ دینا زیادتی کہلاتا۔

اس کے ایک طرف نقرئی بگھی اور اس میں جتے چار سفید چست گھوڑے اس کے منتظر تھے اور ایک ایسا بگھی بان جس کا چہرہ تنکوں والے ہیٹ کی اوٹ میں چھپا تھا۔ نیلے آسماں پہ ٹمٹماتے ستارے' پیروں کے نیچے بچھی مخملیں گھاس۔۔۔۔

یشا کو سونے کے لیے کبھی کسی کی لوری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی' وہ اپنی آنکھوں میں اس منظر کو سمو لیتی اور اس کی چھتنار پلکیں دھیرے دھیرے ایک دوسرے میں ہم آغوش ہو کر اس منظر کو اس کی پتلیوں میں قید کر دیتیں۔

یشا نے ایک بار پھر کروٹ بدلی۔

✡ ✡ ✡

"میں تمہیں کہہ چکا ہوں' یہ نہیں ہو سکتا مہر! کبھی بھی نہیں۔۔۔ میں نے جو عہد کیا ہے' وہ مجھے ہر حال میں نبھانا ہے۔ تمہیں بغیر کسی شرط کے واپس آنا ہو گا۔" سیف اللہ کی التجائیں اب سرزنش میں بدل چکی تھیں۔

"جس بلت کے لیے میرے پاس دو سال پہلے انکار تھا۔ اب بھی انکار ہی ہے۔ اس لیے ایسی شرطیں مت رکھو۔ لوٹ آؤ مہر! لوٹ آؤ۔۔۔ میں اپنی بچیوں کے لیے ترس کے رہ گیا ہوں۔"

بجلی ایک بار پھر بہت زور سے کڑکی تھی۔ بات کرتے کرتے سیف اللہ نے چونک کر کھڑکی کے شیشے پہ نظر ڈالی تھی۔ باہر سب جل تھل ہو رہا تھا اور شاید۔۔۔ شاید اندر بھی۔

✡ ✡ ✡

کروٹ بدلتے ہی اس کا خواب بھی بدل گیا تھا اور منہ کا ذائقہ بھی۔

اب انگور کے رس کے بجائے ریت کی کرکراہٹ محسوس رہی تھی دانتوں تلے۔ پیروں کے نیچے برف کی ٹھنڈک اور پھولوں کی نرمی کی بجائے تپش محسوس ہو رہی تھی۔ کہیں شاید کوئی خار بھی چبھ گیا تھا' تب ہی بھاگتے ہوئے دایاں پاؤں پوری طرح زمین پہ اٹکا بھی نہیں پا رہی تھی۔

ہاں وہ بھاگ رہی تھی۔

سرپٹ۔

اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا شور' مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا' جیسے بہت سے لوگوں کی مدھم سرگوشیاں آپس میں مدغم ہو رہی تھیں اور دور کہیں کسی کے رونے کی آواز ماحول کو ماتم زدہ بنا رہی تھی۔

بھاگتے بھاگتے وہ شرابور ہو گئی۔

آنکھوں کے آگے موسلا دھار بارش نے پردہ سا تان دیا تھا اور پیر اب کیچڑ میں دھنسنے لگے تھے۔

مدھم سرگوشیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔۔۔ اور گریہ زاری بھی۔

بادل کے گرجنے کی ہولناک آواز پہ وہ لرز کے اٹھ

گئی۔ اس کا ننھا سا نازک وجود ہچکیاں لے رہا تھا.... آنکھوں میں ہراس بھرا تھا اور جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔
وہ ننگے پیر ہی بیڈ سے اتر کے باہر کی جانب بھاگتی پکاری۔
"گرینی...."

✡ ✡ ✡

"مہرا! میں سچ کہہ رہا ہوں' میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ پتا نہیں کب میں۔" بجلی کی کڑک نے سیف اللہ کا باقی کا فقرہ دبا لیا تھا۔
"ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مہرا خدا کے لیے اپنی چھوڑ دو ضد.... میں زندگی کے یہ آخری دن امی اور زینی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں ہاں اور' اور تمہارے ساتھ بھی۔"

✡ ✡ ✡

سیاہ پتھر کی سیڑھیوں پہ میشا کے گھرے گدلے رنگ کے پیر بھی اجلے اجلے لگ رہے تھے۔ رات کے اس پہر پتھر پہ پڑنے والے اس کے تلووں کی ہلکی سی دھمک بھی گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
"گرینی...."
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ مسلسل پکارتی جا رہی تھی۔
اس کے گھنگھریالے بال ہمیشہ کی طرح بے ہنگم انداز میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کا پسندیدہ نائٹ سوٹ.... سلک کا سفید پاجامہ شرٹ جو حسب عادت جی بھر کے کروٹیں بدلنے کی وجہ سے سلوٹوں سے چڑمڑ ہو رہا تھا۔
گہرے آبنوسی رنگت والے بھاری دروازے کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھول کے وہ اندر داخل ہوئی تو اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔
"گرینی۔"
پرشکوہ خانم کی ہلکی نیند ویسے ہی دروازہ کھلنے سے اچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ سائیڈ ٹیبل سے اپنا چشمہ ٹٹول رہی تھیں' جب میشا کے روتے ہوئے پکارنے پہ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔
"پھر سے؟"
میشا ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بھاگ کے ان کی گود میں آ گری۔ اب اس کا پورا وجود کسی زخمی چڑیا کی طرح کپکپا رہا تھا۔
"میشا.... میری جان!"
پرشکوہ خانم نے اس کے گھنگھریالے بالوں میں تقریباً" چھپے ہوئے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر محبت سے پکارا۔ ویسے جب بھی وہ اس انداز میں اس سے محبت کا اظہار کرتی تھیں' وہ گھبرا جاتی تھی۔ ان کے محبت بھرے لمس سے نہیں۔ ان کی انگلیوں میں موجود ان بھاری بھرکم انگوٹھیوں اور ان میں جڑے گندے سے رنگوں والے پتھروں سے' جو اسے اپنے گالوں میں چبھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے لیکن آج اس نے اپنا چہرہ ان ہاتھوں میں چھپا لیا۔
"مجھے ڈر لگ رہا ہے گرینی!"
"پھر سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا!"
"خواب۔" وہ بڑبڑائی اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنا پہلا والا خواب یاد آ گیا۔
وہ چاند کی سواری
وہ ستاروں کی پالکی
وہ برف اور پھولوں والا فرش
وہ کنیزیں
اور وہ رسیلے پھل....
ان سب کے یاد آتے ہی اس کے چہرے پہ سے خوف کی پرچھائیاں جیسے چھٹ سی گئیں اور ان کی جگہ ایک دھیمی سی آسودہ مسکراہٹ نے لے لی۔ اس کے گالوں پہ اگرچہ ابھی بھی آنسوؤں کے خشک ہوتے دھبے پڑے تھے مگر آنکھوں کی پتلیوں میں شرارت چمکنے لگی تھی۔
"نہیں گرینی! خواب تو ڈراؤنا نہیں تھا۔ وہ تو بہت سویٹ تھا۔ اتنا پیارا خواب' اس میں' میں نے چاند کی سیر کی تھی اور بہت مزے کے میٹھے میٹھے کریپس بھی کھائے تھے۔ یہ بڑے بڑے' مجھے میری کنیزوں نے

دیے تھے۔"
"کنیزیں۔" پرشکوہ خانم نے اپنی مسکراہٹ روکی۔
"جی' میں پرنسس تھی ناں۔"
"تو ڈر کیوں لگ رہا ہے پھر....؟"
اس سوال کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے شرارت اور لبوں سے مسکراہٹ اڑن چھو ہو گئی۔ نین کٹوروں میں کھارا پانی بھر گیا۔ وہ پھر سے پرشکوہ خانم کی گود میں چھپ گئی۔
"میں نے کہا ناں گرینی.... وہ خواب نہیں تھا۔ وہ خواب تھا ہی نہیں.... میں جاگ رہی تھی اور' اور...." اس نے تھوک نگل کے اپنا خشک ہوتا حلق تر کرنا چاہا۔
"اور کیا بولو میشا کیا دیکھا تم نے؟"
"دیکھا نہیں.... سنا۔" حلق میں پھنسے کسی نامعلوم سے گولے کو اندر دھکیل کے اس نے سرگوشی کی۔
"ہاں وہی' کیا سنا؟"
"میں نے بہت سے لوگوں کا شور سنا۔ وہ.... وہ سب آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ بارش کی آواز بھی تھی اور.... اور کسی کے رونے کی بھی۔ پتا نہیں کسی ایک کے رونے کی یا بہت سے لوگوں کی۔"
اس نے پرشکوہ خانم کی گود میں منہ چھپا کے سرگوشی میں بتایا' جسے سن کے ان کے چہرے پر تفکر پھیل گیا۔ وہ میشا کے بالوں میں انگلیاں پھنسائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں جہاں سے بجلی چمکتی نظر آ رہی تھی۔
انہوں نے خوفزدہ ہو کر میشا کو زور سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔
"یا اللہ خیر! یہ جو سوچتی ہے۔ جو کہتی ہے وہ اکثر و بیشتر سچ ثابت ہو جاتا ہے۔ جیسے یہ بارش۔ اب اللہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔"

✡ ✡ ✡

"نہیں مہرا میرا جواب اب بھی وہی ہے.... ہاں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہاں میں زینی اور امی کے بنا نہیں رہ پا رہا.... ہاں میں یہ چند دن تم لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں مگر اس کی خاطر میں اسے یہاں سے نہیں بھیج سکتا۔ تمہیں لوٹنا ہو گا مہرا اس کے لیے دل بڑا کر کے۔"
سیف اللہ کے ماتھے سے پسینے کے فوارے پھوٹ پڑ رہے تھے۔ پورا چہرہ زردی سے کھنڈ گیا تھا۔
"میں تم سے...." اس کے آگے شاید اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی.... ریسیور اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گرا تھا۔ اس کی شال کاندھوں سے سرک کر نیچے آ رہی تھی' دل پہ ہاتھ رکھے تکلیف و اذیت کی حکایتیں چہرے پہ رقم کیے وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بیڈ کی جانب بڑھنے لگا مگر اپنی ہی شال میں پاؤں کے اٹک جانے کے باعث اوندھے منہ نیچے جا گرا اور گرتے گرتے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا وہ سیاہ ٹیبل کلاک بھی لے گرا' جو پرشکوہ خانم نے سولہ سال پہلے اسے سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا اور جسے وہ بے حد عزیز رکھتا تھا۔

✡ ✡ ✡

چھناکے کی آواز پہ میشا نے چونک کر پرشکوہ خانم کی گود سے سر اٹھایا۔ وہ پریشانی سے انہیں دیکھنے لگی جو خود بھی ٹھٹک سی گئی تھیں۔
"یہ کیسی آواز تھی' کیا کچھ گرا ہے؟"
میشا کی آنکھوں کی پتلیاں ایک جگہ ٹھہر سی گئیں اور کھوئے کھوئے انداز میں اس کے لبوں سے معصوم سی سرگوشی ابھری۔
"ٹیبل کلاک.... بابا کے روم میں ٹیبل کلاک گرا ہے۔ ان کا فیورٹ بلیک ٹیبل کلاک۔"
"مگر تمہیں کیسے...."
حیرت سے سوال کرتے کرتے وہ رکیں اور اسے اپنی گود سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے روم سے نکلیں۔

✡ ✡ ✡

پرشکوہ خانم کے قدم لمحے بھر کے لیے دروازے پہ ہی ٹھٹک کے رک گئے تھے' جب انہوں نے سیف

کے لیے تڑپتے وجود کو زمین پہ چت اور بے حس و حرکت گرے دیکھا تھا، پھر وہ پکارتی ہوئی آگے بڑھیں۔

"سیف اللہ... سیف اللہ کیا ہوا بیٹا!"

وہ اب اسے سیدھا کر رہی تھیں۔ سیف اللہ کی سانس کسی آری کی طرح رفتہ رفتہ چلتا اس کی زندگی کی ڈور کو کاٹ رہا تھا۔

بیشا کے قدم دروازے کے پاس ہی پتھر بن کے جم گئے تھے۔ اس کی دہشت زدہ آنکھیں سیف اللہ کے آخری ہچکیاں لیتے وجود پہ جمی تھیں۔

"سیف اللہ اٹھو بیٹا! تمہیں ہسپتال لے کر جاتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ماں! بس مجھے یہ یقین..."

اس سے اور کچھ نہ کہا گیا تو اس نے اپنی آنکھیں دروازے کے پاس سمٹی سہمی کھڑی بیشا پہ جما دیں۔ اس کی رفتہ رفتہ زندگی کی جوت کھوتی آنکھوں میں جو التجا رقم تھی وہ پرشکوہ خانم نے بھانپ لیا۔

"ہاں سیف اللہ! یقین کرو... اطمینان رکھو... بیشا کو میں اپنی جان سے زیادہ..."

مگر سیف اللہ کے لیے اتنا ہی دلاسا بہت تھا۔ اس نے بہت سکون سے ماں کی گود میں سر رکھ کے آنکھیں موند لی تھیں۔

بیشا نے اپنا سر دروازے کے ساتھ ٹیک دیا۔ پرشکوہ خانم کے بین اس کے دل کو چیرے جا رہے تھے اور اس کی ٹانگوں نے کپکپاتے ہوئے اس کا وزن مزید سہارنے سے انکار کر دیا تو وہ دروازے کے ساتھ چپکی نیچے پھسل کر بے جان انداز میں ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

پرشکوہ خانم سفید ساڑھی کا آنچل سر پہ لیے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانوں کے گرنے اور آنکھوں سے ٹپکتے نمکین پانی کے قطروں کے گرنے میں ایک عجیب سا تسلسل تھا۔

سیف اللہ کی زندگی کے بتیس سال ان کی سرمئی آنکھوں کے سامنے پنکھ لگا کے اڑ رہے تھے اور وہ باوجود چاہنے کے کسی ایک بھی پنکھ کو اپنی مٹھی میں نہیں بھر سکتی تھیں۔ روک نہیں سکتی تھیں۔

اس چھوٹے سے قصبے کے تقریباً سب ہی لوگ سیف اللہ کی آخری رسومات کے لیے یہاں موجود تھے اس سیف اللہ کے لیے جو ان میں سے ایک نہیں تھا مگر پچھلے دس گیارہ سال سے ان کے ساتھ رہتے رہتے وہ ساری اجنبیت ختم ہو چکی تھی جو دو مختلف قومیت، مختلف مذہب اور مختلف نسل کے لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔

پرشکوہ خانم نے سوگوار انداز میں بیٹھی ان سب عورتوں پہ نظر ڈالی۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اس جواں مرگ پہ پرنم نہ ہو۔ ہلکی ہلکی سسکیاں، گھٹی گھٹی آہیں اور سرگوشیاں، جو مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ماحول کے سکوت پہ جالا سا بن رہی تھیں۔

پرشکوہ خانم نے سوچتی آنکھوں سے بیشا کو دیکھا جو ہال کے وسط میں رکھی سیف اللہ کی میت کے سرہانے نڈھال انداز میں پڑی تھی۔

"میں نے بہت سے لوگوں کا شور سنا ہے گرینی! وہ سب آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور بارش کی آواز بھی تھی اور... اور کسی کے رونے کی بھی۔" بیشا کی بات یاد آتے ہی وہ پریشان ہو اٹھیں۔

"تو یہ تھی اس خواب کی تعبیر بیشا جو تم نے جاگتے میں دیکھا۔" مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں کچھ اضافہ ہوتے پہ انہوں نے تعزیت کے لیے آئی عورتوں کی نظر کے تعاقب میں ہال کے مرکزی دروازے کی جانب نظر اٹھائی۔

سیاہ ساڑھی میں مہر اپنی تمام تر سرو قامتی اور تمکنت کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے چہرے کا دکھ بھی اس کے نقوش سے جھلکتی ناراضی اور غصے پہ حاوی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ ایمی اور زینی کی انگلیاں تھامے بت بنی کھڑی سیف اللہ کا سفید چادر میں ڈھکا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

کچھ گزرے لمحوں کا عکس لہرایا اور وہ اپنی ناراضی کو

چھپائے بے قراری سے چند قدم آگے بڑھی مگر اس کے میت کے سرہانے ٹیک لگائے بیٹھی بیشا نے سر اٹھا کے اس کی جانب دیکھا تو مہر کے قدم تھم گئے۔

اس کی نگاہوں میں بیشا کے لیے شدید نفرت تھی اور بیشا کی نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح اس کے حسن کے آگے بے پناہ مرعوبیت۔

☆ ☆ ☆

وہ تقریباً دو سال کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ کمرا جو کبھی اس کا اور سیف اللہ کا تھا۔

تقریباً سب ہی کچھ وہی تھا۔

وہی اونچی دیواریں... وہی منقش دروازے۔

وہی کاہی رنگ کا قالین جو اب خاصا بوسیدہ ہو رہا تھا اور بارش کے بعد اٹھنے والی سیلن زدہ مہک پھیلا رہا تھا۔

وہی اخروٹ کی لکڑی کی بھاری بھرکم پرانی طرز کی مسہری۔

وہی سیف اللہ کی رائٹنگ ٹیبل۔

اور وہی مغربی دیوار پہ لگی ان دونوں کی شادی کی تصویر۔

مہر تصویر کے سامنے دیر تک لب بستہ کھڑی رہی۔ یہ وہ دور تھا جب مہر کا حسن اور سیف اللہ کا اس کے لیے جنون دونوں زوروں پہ تھا۔

مہر کے ابا ان دنوں بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے سری لنکا میں بطور سفارت کار تعینات تھے۔ مہر کے ابا کا تعلق بنگال سے اور اماں کا تعلق لکھنؤ سے تھا اور اس نے دونوں کے حسن کے رنگ چرا کے کمال کا روپ پایا تھا۔

سرو قامت... آہو چشم
یاقوتی لب... دراز سیاہ گیسو
سبک سے ہاتھ پیر... تراشا ہوا سراپا

اس پہ ایک باوقار سا شاہانہ انداز جو لہجہ سے لے کر انداز نشست و برخاست تک سے جھلکتا تھا۔

سارک ممالک کے ایک سفارتی عشائیہ کے موقع پہ سیف اللہ کی ملاقات مہر سے ہوئی اور وہ اس کے حسن جہاں سوز کے آگے دل ہار بیٹھا۔ وہ حال ہی میں بھوٹان میں بطور سفیر تعینات ہوا تھا۔ راہ و رسم بڑھی۔ التفات میں اضافہ ہوا۔ وہ مہر جس نے بائیس سال تک کسی کو اس قابل نہ سمجھا تھا، وہ سیف اللہ کو دل میں بسا بیٹھی... اس کے اماں ابا کو تو سیف اللہ جیسے داماد پہ کیا اعتراض ہونا تھا۔ وہ ہر صورت میں ایسا تھا کہ کوئی بھی اسے اپنی بیٹی کا مقدر بنانے میں فخر محسوس کرتا... مگر سیف اللہ کے معاملے میں ایک قباحت ضرور تھی۔

اور وہ تھی کارا۔ سیف اللہ کی منگیتر۔

سیف اللہ کی والدہ پرشکوہ خانم کی منہ بولی بیٹی۔

جس سے انہوں نے حال ہی میں سیف اللہ کی نسبت طے کی تھی اور سیف اللہ کی رضامندی سے ہی کی تھی۔

بے شک... سیف اللہ نے کارا سے کوئی عہد و پیمان نہیں کیے تھے... بے شک یہ منگنی صرف اور صرف پرشکوہ خانم کی ذاتی پسند ناپسند کی بنیاد پہ ہوئی تھی مگر بہرحال ہوئی تو تھی۔

کارا کا تعلق بھوٹان کے شہر Thimphu کے ایک نامی گرامی خاندان سے تھا، جہاں سیف اللہ رہائش پذیر تھا۔ اس کے ساتھ دھوم دھام سے منگنی کرنے کے بعد کسی اور سے شادی کا فیصلہ کر لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر ایک تو کارا سمجھ دار تھی، دل پہ داغ لینے کے باوجود اس نے اسے انا کا مسئلہ نہیں بنایا... اور نہ اپنے باپ کو کوئی سخت قدم اٹھانے دیا دوسرے وہ جانتی تھی کہ زبردستی رشتہ جوڑ لینے سے وہ کیا پالے گی۔

اور پھر جب سیف اللہ، مہر کو بیاہ کے لایا تو اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے بعد کارا نے دل ہی دل میں خود کو اس فیصلے کی داد دی۔ کیونکہ وہ کچھ بھی کر لیتی مہر کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ سیف اللہ کو مجبور کر کے یا اپنی منہ بولی آنٹی پرشکوہ خانم سے جذباتی بلیک میلنگ کروا کے شادی کر بھی لیتی تو کیا اس حسن کی

شبیہہ سیف اللہ کے دل سے مٹا سکتی تھی؟

وہ تو اپنی شکست تسلیم کرکے اپنے کزن سے شادی کرنے کے بعد پیرس چلی گئی مگر یہ شکوہ خانم کے دل سے ملال نہ گیا اور مہر نے اس ملال کو دھونے یا ان کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی وہ سیف اللہ کے دل پہ راج کرکے ہی خوش تھی اور پھر ان کی زندگی میں یکے بعد دیگرے ایمی اور زینی نے آ کے نئے رنگ بھر دیے۔

مہر نے افسردگی سے اپنی اور سیف اللہ کی شادی کی تصویر پہ ہاتھ پھیرا۔

"تو ایسا اور کون سا رنگ رہ گیا تھا سیف اللہ! تمہاری زندگی میں جو تم نے کسی اور کے وجود سے بھرنا چاہا اور میری زندگی کو بے رنگ کرکے رکھ دیا۔"

دو آنسو اس کی آنکھوں سے شکوہ کرتے رخساروں پہ ڈھلک گئے۔ اس نے گردن موڑ کے کھڑکی کے دائیں جانب قد آدم الماری کو دیکھا' جس میں سیف اللہ کے کپڑے اور دوسرا سامان ہوا کرتا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ وہ عکس جھلملانے لگا' جب سیف اللہ نیپال کے سفارتی دورے پہ جانے والا تھا۔ ان دونوں کے درمیان تلخی عروج پہ تھی اور مہر کو اس کی ہر حرکت پہ شبہ ظاہر کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

"کھل کے بتاتے کیوں نہیں؟"

وہ ماتھے پہ چتون لیے اسے پیکنگ کرتے دیکھ رہی تھی۔

"بتایا تو ہے آفیشل وزٹ ہے۔"

سیف اللہ نے حتی الامکان اپنے لہجے کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی اور یہ اس کی کوششیں ہی تھیں جو گزرے کچھ سالوں میں بڑھنے والی کشیدگی نے اب تک کوئی خطرناک رخ اختیار نہیں کیا تھا۔

"تمہارے آفیشل وزٹ بڑھتے ہی جا رہے ہیں اور وہ بھی اتنے کم وقفے کے بعد اور لمبے لمبے عرصے کے لیے۔"

"مجبوری ہے مہر۔"

"مجبوری تمہارے چہرے سے تو نظر نہیں آ رہی ..... بہت خوش خوش بھاگے جاتے ہو ہر بار..... جیسے کوئی خزانہ ملنے والا ہو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو مہر!" سیف نے مسکرا کر اس کی بات ہنسی میں ٹالنا چاہی۔

"میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو روتے روتے اسکول جاؤں گا..... جاب ہے میری۔"

"سچ سچ بتاؤ..... نیپال جا رہے ہو یا پیرس؟"

اس بار وہ حقیقتاً "چڑ گیا۔

"تم چاہو تو میرا پاسپورٹ اور ویزا چیک کر سکتی ہو۔"

جب سے کارا کے شوہر کی وفات ہوئی تھی اور جب سے اس کا ربط پر شکوہ خانم کے ساتھ پھر سے بڑھ گیا تھا اور جس دن سے مہر نے خود اپنی ساس کو کارا سے کہتے سنا تھا کہ اسے اپنی جوانی بیوگی کی نذر کرنے کی بجائے دوسری شادی کرکے نئی زندگی کا آغاز کر لینا چاہیے تب سے کارا کا وجود مہر کے دل میں خار بن کے چبھ رہا تھا۔ آئے دن دونوں کے درمیان کارا کی وجہ سے تنازعہ پیدا ہوتا رہتا۔ اول اول دنوں کی وہ محبت اب خواب ہو چلی تھی۔

"ٹھیک ہے' زینی اور ایمی کی چھٹیاں ہیں' ہم بھی ساتھ چلتے ہیں؟"

"وہ بہت بور جگہ ہے۔ تم لوگ تنگ آ جاؤ گے۔"

"کیا خوب بہانہ ہے ساتھ نہ لے جانے کا۔"

"اگر سچ سننا چاہتی ہو تو سنو مہر! تمہارا ساتھ اب مجھے سوائے ذہنی اذیت کے اور کوفت کے اور کچھ نہیں دیتا۔ جس طرح تم میرے ہر قدم کو شک بھری نظر سے دیکھتی ہو۔ میرا خود اپنے اوپر اعتماد ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے میں وہاں ایک بہت ضروری اور اہم سیمینار میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔ مجھے ذہنی یکسوئی چاہیے مہر! جو تمہاری موجودگی میں محال ہے۔"

وہ بیگ اٹھا کے دروازے تک بڑھا اور پھر پیچھے مڑ کر تلملاتی ہوئی مہر پہ ایک نظر ڈال کے قدرے نرمی سے کہا۔

"میں جلدی آ جاؤں گا۔"

مہر کی آنکھیں جھلملا اٹھیں..... وہ اداسی سے الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں تم آئے تو جلدی مگر..... مگر اکیلے نہیں۔"

☆ ☆ ☆

"گرینی..... یہ ماما ہیں؟"

میشا کے سوال پہ ان کی انگلیاں اس کے بالوں کے کنڈلوں میں پھنس گئیں۔

"ہوں۔" خاصے توقف کے بعد وہ بس اتنا ہی جواب دے پائیں۔

"رئیل والی؟" اس بار وہ جواب دینے کی ہمت نہ کر پائیں۔

"بتائیں ناں گرینی..... رئیل والی ماما؟"

"ماما تو ماما ہوتی ہیں میشا ریئل ہو یا۔" اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ پائیں۔

"نہیں گرینی..... ماما رئیل بھی ہوتی ہیں اور دوسری بھی ہوتی ہیں' جیسی سنڈریلا کی تھیں۔ جیسی سلیپنگ بیوٹی کی تھیں۔ جیسی ہینسل اینڈ گریٹل کی تھیں اسٹیپ مام۔"

اسے گرینی سے سنی وہ ساری کہانیاں یاد آ گئیں۔ دونوں کا ایک ہی تو مشغلہ تھا..... ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی کہانیاں بانٹنے کا۔

"بتائیں ناں گرینی..... کیا یہ میری اسٹیپ مام ہیں؟"

"ہاں۔"

ایک گہرا سانس بھر کے بہر حال انہوں نے وہ جواب دے ہی دیا جو آج نہیں تو کل دینا ہی پڑتا۔

"بابا نے میری مام کی ڈیتھ کے بعد ان سے شادی کی تھی؟"

"میشا! تمہارے سوال اب بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔" وہ جھنجھلا اٹھیں۔

"مگر ایمی تو مجھ سے بڑی ہے..... وہ کیسے گرینی؟"

"بس میشا! بہت رات ہو گئی۔ اب سو جاؤ تم۔" انہوں نے اسے گھرک کر کمبل کے اندر گھسایا۔

اس نے آنکھیں موند لیں مگر بند پپوٹوں کے پیچھے ایک نیا جہاں آباد ہو چکا تھا۔

بہت سے کردار سانس لینے لگے تھے۔

کبھی ہینسل اینڈ گریٹل راستہ بھٹک کے جنگل میں دربدر ہو رہے تھے۔

کہیں سلیپنگ بیوٹی ایک شیشے کے تابوت میں قید تھی اور اس کی سوتیلی ماں آئینے کے سامنے اترا کے کہہ رہی تھی۔

"آئینہ' آئینہ..... بتا سب سے حسین کون؟"

اور کہیں سنڈریلا رتھ پہ سوار چاندنی رات میں کسی انجانی راہ گزر پہ بڑھتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ماما! یہ لڑکی کون ہے؟" زینی پیر پٹختے ہوئے مہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آپ نے تو کہا تھا ہم بابا کے گھر واپس جا رہے ہیں اور ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں..... لیکن یہ بابا کا گھر تو نہیں ہے۔ یہاں بابا تو ہیں ہی نہیں اور کوئی ہے تو صرف مینڈکی..... پیلی مینڈکی۔"

"ماما..... یہ ہماری بہن ہے؟" ایمی نے چاکلیٹ سے سنی انگلیاں چوستے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" مہر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"تو پھر وہ ہمارے بابا کو بابا اور ہماری گرینی کو گرینی کیوں کہتی ہے؟"

"گرینی تو اسے پیار بھی ہم دونوں سے زیادہ کرتی ہیں۔"

"ہاں ایمی! اور تم نے دیکھا اس کے پاس وہی روم ہے' جو پہلے ہمارا تھا۔ لیکن اب اس روم کی حالت دیکھو ذرا۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے کسی پرنسس کا ہو۔"

"پلیز ماما..... بتائیں ناں کون ہے یہ؟"

بچیوں کے سوالوں سے تنگ آ کے مہر نے آنکھیں موند کر سر تکیے سے ٹکا دیا۔

دونوں ماں کے مزاج کے ایک ایک رنگ سے واقف تھیں۔ اس لیے نظروں ہی نظروں میں ایک

دوسرے کو اشارہ کر کے کمرے سے نکل گئیں۔ مہران کے سوالوں کے جواب کیا دیتی؟ اس کا تسلی بخش جواب تو خود اسے بھی کبھی نہ مل پایا تھا سیف اللہ سے۔

☼ ☼ ☼

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
مہر نے ایک نظر اس زرد رو سوکھی سڑی سات سالہ بچی پہ ڈالی جو سیف اللہ کی انگلی تھامے پورے گھر کا جائزہ اپنی حیران آنکھوں سے لے رہی تھی اور دوسری بے اعتبار سی نظر سیف اللہ پہ ڈالی' جو اسے ایک ایسی کہانی سنا رہا تھا۔ جس کے کسی ایک حرف کو بھی وہ سچا نہ جان رہی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں مہر! یہ میرے ایک عزیز دوست کی بیٹی ہے۔ اس کا اور اس کی بیوی کا انتقال کسی حادثے میں ہو گیا ہے' اس وجہ سے اسے میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔"

"تو کیا ان دونوں کا کوئی اور عزیز' رشتے دار' خاندان وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا جو اس کی ذمے داری لیتے۔ آسمان سے ٹپکے تھے کیا دونوں؟"

"یہی سمجھ لو۔" سیف اللہ کا جواب واضح طور پہ اتنا ٹالنے والا تھا کہ مہر کے طیش کو اور ہوا دے گیا۔

"سیف اللہ! تم سمجھتے ہو میں تمہاری اس بیہودی کہانی پہ ایمان لے آؤں گی؟ تمہاری اس خدا ترسی کی داد دوں گی؟ تمہارے اس انجان دوست کی ناگہانی وفات پہ تمہارے ساتھ تعزیت کروں گی؟ تم پہلی بار ... زندگی میں پہلی بار نیپال گئے تھے۔ وہاں تمہیں ایسا کون سا دوست مل گیا تھا جس نے مرتے ہوئے اپنی بیٹی کی ذمے داری کسی اور کے نہیں' صرف تمہارے سپرد کی۔ بولو۔"

سیف اللہ کی خاموشی نے مہر کے شک کو زبان دے دی۔

"سچ تو یہ ہے کہ یہ تمہاری کسی عیاشی کا نتیجہ ہے۔ تمہارے کسی گناہ کا پھل۔"

"یہ ایک معصوم بچی ہے مہر!"

"مگر تم معصوم نہیں ہو۔ اسی لیے اتنی بے تابی سے بھاگے تھے نیپال اور مجھے ساتھ لے جانے سے بھی صاف منع کر دیا تھا۔ اب پتا چلا تم نے وہاں اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی تھی۔"

"تمہاری یہ غلط فہمیاں وقت دور کرے گا ... میں نہیں۔"

"یہ یہاں میرے سامنے رہے گی تو غلط فہمیاں دور نہیں ہوں گی ... بڑھیں گی۔ اسے یہاں سے کہیں اور بھیجو۔"

"یہ اب یہیں رہے گی میں نے عہد کیا ہے۔" سیف اللہ کے لہجے میں پختگی تھی۔

"کس سے کیا ہے عہد؟ اس کی ماں سے؟ اپنی معشوقہ سے؟ اس کے پیچھے پیچھے وہ کب آئے گی یہاں؟"

"اس کی ماں مر چکی ہے اور میں نہیں جانتا وہ کون تھی۔ بلاوجہ کسی ایسی عورت پہ بہتان مت باندھو جو اب اس دنیا میں نہیں رہتی۔"

"بہت خوب۔ تم اسے جانتے نہیں تھے؟ یعنی کوئی راہ چلتی عورت تھی جسے تم نے اپنی عیاشی ..."

"بس مہر! بچی کے سامنے ایسی باتیں مت کرو۔ وہ تمہاری زبان نہیں سمجھتی' مگر تمہارے لہجے کی تپش تمہاری نظروں کی نفرت اسے خوف زدہ کر رہی ہے۔"

"بڑا دل دکھ رہا ہے تمہارا اس کے لیے پھر بھی کہتے ہو کہ یہ تمہاری اولاد نہیں ہے؟"

"ہاں' نہیں ہے۔"

"اگر یہ واقعی تمہاری اولاد نہیں ہے۔ تمہارا اس سے خون کا رشتہ نہیں ہے تو کیوں اسے زبردستی میرے سر پر بٹھا رہے ہو؟ تمہیں اس سے صرف ہمدردی ہے نا' تمہیں نیکی اور ثواب کمانے کا شوق ہے ناں تو ٹھیک ہے اسے کسی یتیم خانے میں ڈال دو۔"

"نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی کرنا ہوتا تو اسے اپنے ساتھ کیوں لاتا؟ ایسی زندگی تو یہ وہاں بھی جی لیتی۔"

"اتنی وابستگی ... اور اس پہ بھی تمہارا دعوا ہے کہ میں غلط سمجھ رہی ہوں۔ سیف اللہ! اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری من گھڑت کہانی پہ یقین کر لوں تو اسے اس گھر سے دور کر دو ... پل جائے گی یہ کہیں نہ کہیں۔"

سیف اللہ نے ایک گہری سانس بھری اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

"ہاں' ہے یہ میری اولاد ... میری بیٹی اور یہ ہمیشہ میرے ساتھ اس گھر میں رہے گی۔"

"سچ آ گیا ناں زبان پہ ... اب یاد رکھو۔ اس گھر میں یہ رہے گی یا میں۔"

☼ ☼ ☼

"اور تم نے اس کا انتخاب کیا تھا سیف اللہ!" مہر نے ایک بار پھر خود کو اسی کرب سے گزرتا محسوس کیا تھا۔

"ڈیڑھ سال تک تم مجھ سے اور اپنی بچیوں سے دور رہے اور تمہارے آخری وقت میں یہ تمہارے ساتھ تھی' ہم نہیں ... یہ ... جس نے ہمیں الگ کیا۔"

وہ پھر کے اٹھی اور کمرے سے نکلی ... اس کا رخ میشا کے کمرے کی جانب تھا' جو دو سال پہلے تک زینی اور ایمی کا کمرا تھا۔

میشا کمرے میں نہیں تھی۔ مگر ایک ایک چیز پہ وہ نقش تھی۔ دیواروں پہ اس کی تصویریں تھیں' اس کے کھلونے اس کی کتابیں جابجا پھیلی تھیں ... ایسا لگتا تھا کسی نے بہت محبت اور دھیان کے ساتھ یہ کمرا اس کے لیے سیٹ کیا تھا۔

اور جس وقت وہ دیوار پہ بنی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جس میں سنڈریلا کا وہ سارا تخیلاتی منظر رنگوں کی مدد سے اتارا گیا تھا تو میشا اپنے پوہ کو سینے سے لگائے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ سنڈریلا ہے۔" میشا کے تعارف کرانے پہ مہر نے اسے سرد بھرپور نظر سے دیکھا۔

دو سال پہلے اس کے چہرے پہ جتنی زردی کھنڈی تھی۔ اب اتنی نہیں تھی ... مگر اس کا گندمی چہرہ اب بھی ایمی اور زینی کے مقابلے میں بے کشش اور پھیکا تھا' جن کے گال کشمیری سیب کی مانند لہو چھلکاتے تھے اور لب انار کے دانوں کی طرح دہکتے رہتے تھے۔

پہلے کی نسبت اس کا سراپا کچھ گداز بھی ہو چکا تھا اور وہ جو چہرے پہ ایک لاچاری اور مسکینی کی چھاپ تھی' وہ اب ندارد تھی۔ ایک اعتماد اس کے ہر نقش میں بول رہا تھا' جو یقیناً سیف اللہ کا بخشا ہوا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟" ہلکی سی ناگوار شکن ماتھے پہ لیے وہ بے خوفی سے اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ اسے مہر کا یوں گھورنا بالکل پسند نہیں آ رہا۔

"یہ کمرا خالی کر دو۔" مہر نے تلملا کے کہا۔

"جی؟"

"سنا نہیں تم نے ... یہ روم خالی کر دو۔ یہ ایمی اور زینی کا روم ہے۔"

"نہیں' یہ میرا روم ہے ... میشا کا روم۔ بابا نے میرے لیے اتنے پیار سے سیٹ کیا تھا اسے۔"

"یہ روم پہلے بھی ایمی اور زینی کا تھا' اب ان کے واپس آنے کے بعد بھی ان ہی کا ہو گا' سمجھیں؟"

"جی نہیں' کسی کا نہیں ہے یہ روم۔ یہاں ہمیشہ سے میں ہی رہتی آئی ہوں۔"

"ہمیشہ سے؟ تم کسی ناگہانی آفت کی طرح اور کسی وبائی مرض کی طرح نازل ہوئی ہو' میری زندگی پہ بھی اور اس گھر پہ بھی۔ اٹھاؤ اپنا یہ کچرا گھر اور کسی اور کمرے میں دفع ہو جاؤ۔ شام تک مجھے یہ کمرا خالی چاہیے۔"

مہر بہت سخت الفاظ اور کڑے انداز میں تنبیہ کر کے کمرے سے نکلی تھی مگر میشا اس کے رعب کو قطعی خاطر میں نہ لائی اور اس کے نکلتے ہی منہ بگاڑ کے نقلیں اتارنے لگی۔

"آہا' ہا' ہا' شام تک روم خالی چاہیے۔ یہ میرا روم ہے اور میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ کہیں بھی نہیں' کبھی بھی نہیں۔"

اس پہ بھی بھڑاس نہ نکلی تو تکیہ اٹھا کے اسے زور زور سے نوچتے ہوئے اپنا غصہ نکالنے لگی۔

"آئیں بڑی مجھے روم سے نکالنے والی۔"

تکیے سے روئی اڑا اڑ کے فضا میں بکھرنے لگی تو وہ غصہ بھول بھال کے معصوم سی مسکراہٹ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پہ سجا کر یہ منظر تکنے لگی۔ پھر اس کی چکنی ہتھیلیاں دعا کے سے انداز میں پھیل گئیں۔ سنبل کے ان ذروں کو مٹھی میں بند کرنے کے لیے۔

"آہا..... سنوفال۔"

چندھی چندھی آنکھیں بنا کے وہ ہتھیلیاں پھیلائے کمرے میں گول گول گھومنے لگی۔ اس کے بالوں میں جگہ جگہ سنبل کی روئی اٹکی تھی۔ اوپر کو اٹھے چہرے پہ ایک دو جگہ سنبل ایسے گری تھی کہ اسے گدگداہٹ سی محسوس ہو رہی تھی' جہاں دور دور تک منظر سفیدی میں ڈھکے تھے اور پیروں کے نیچے خون جما دینے والی خنکی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ بہتی ناک' گلے کی سوزش' سرخ آنکھیں اور مسلسل چھینکیں۔

"تمہیں تو فلو کے ساتھ ساتھ بخار بھی ہے۔"

"گرینی! مجھے سردی لگ گئی ہے۔"

"کوئی وائرل انفیکشن ہوگا میری جان!" ییشا کی خود تشخیصی پہ انہیں ہنسی آگئی۔

"اتنی گرمی میں سردی کیسے لگ سکتی ہے بھلا؟"

"وہ ایسے گرینی کہ میں بنا گرم کپڑوں کے ہی سنو فال میں کھیل رہی تھی اس لیے۔"

"سنوفال؟" ایک لمحے کے لیے انہیں اچنبھا ہوا مگر پھر ییشا کے کہانی ساز ذہن کے کچھ سابقہ کارنامے یاد آئے تو مسکرا دیں۔

"اوہ..... سنوفال۔"

"ہوں' وہ بھی میرے روم میں۔"

"تم بھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو ییشا بھلا روم کے اندر سنوفال۔ وہ بھی اس سیزن میں؟"

"ہاں! مجھے غصہ آیا تھا ناں' میں نے pillow (تکیہ) پھاڑا اور سنوفال شروع۔"

پرشکوہ خانم کو اس کے فقرے میں صرف پہلا حصہ قابل توجہ لگا۔

"غصہ کیوں آیا تھا اور کس پہ آیا تھا؟"

"مہاما نے مجھے روم سے جانے کا کہا۔ وہ یہ روم زینی اور رامی کو دے دیں گی۔ گرینی! یہ روم تو میرا ہے ناں؟"

"ہاں! اگر سیف اللہ نے کہا تھا کہ یہ روم تمہارا ہے تو یہ روم تمہارا ہے۔"

"مگر کہتی ہیں کہ یہ روم پہلے زینی اور رامی کا تھا۔ میں تو بعد میں آئی تھی۔" اتنا کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

"میں بعد میں کیوں آئی تھی گرینی! اور کہاں سے آئی تھی؟"

"جنت سے۔" پرشکوہ خانم نے اس کے بخار کی حدت سے تمتماتے ماتھے کو محبت سے سہلایا۔

"جنت یعنی ہیون؟"

"ہاں' سب بچے پہلے جنت میں رہتے ہیں پھر اللہ ان کو ان کے پیرنٹس کے پاس بھیجتا ہے۔"

"مگر گرینی! وہ تو بہت چھوٹے سے بے بیز ہوتے ہیں..... جیسے نیازی انکل کے ہاں بے بی آیا تھا اور ہم دیکھنے گئے تھے میں تو بہت بڑی ہو کے یہاں آئی تھی۔"

اس کے سوال پہ سوال انہیں زچ کیے دے رہے تھے عمر کا تقاضا جو ہوا کہاں سے لائیں اتنا تحمل مگر لانا پڑا' جانتی تھیں کہ یہ سوال ییشا کی عمر کا تقاضا ہے اور اگر جواب دے کر اس کی تسلی نہ کی گئی تو وہ کہیں خود سے ان سوالوں کے جواب نہ تلاشنے لگ جائے۔

"تم اللہ کی بہت فیورٹ ہو ناں اور شاید جنت کے سب فرشتوں کی بھی' ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا تمہیں دنیا میں بھیجنے کا' اس لیے اتنا عرصہ اپنے پاس ہی رکھا اور تم وہاں رہتے رہتے بڑی ہو گئیں۔ وہ تو بعد میں میں نے بہت دعا کی تو تمہیں یہاں بھیجا گیا۔"

"تو جہاں میں رہتی تھی وہ جگہ جنت تھی؟" وہ یکدم بے حد خوش ہو گئی۔ بخار کی تمازت بشاشت میں بدل گئی۔

"آف کورس۔" انہوں نے ییشا کا ماتھا چوما' جہاں انہیں ہر وقت ایک چاندنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

"ہاں یاد آگیا۔ وہ واقعی جنت تھی اور میں وہاں کی پرنسس۔"

"اچھا.....؟" وہ ہنس دیں۔

"ہاں! تب ہی تو سب میرے آگے سر جھکائے ہوئے تھے' میرے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے رہتے تھے۔" ییشا کی بات نے پرشکوہ خانم کے لبوں سے مسکراہٹ چھین لی۔

"سو جاؤ ییشا! رات بھر بخار سے جاگتی رہی ہو۔" ان کا لہجہ ایک دم ہی سے سخت ہو گیا۔

"میرے سر پہ تاج بھی ہوتا تھا گرینی!"

"منہ کھولو' یہ سیرپ پی لو۔" وہ اس کی بات کو نظر انداز کر رہی تھیں۔

"میں وہاں بھی اپنے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں کھاتی پیتی تھی۔ مجھے کوئی نہ کوئی کھلاتا تھا۔" وہ ان کے ہاتھ میں موجود چمچے کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

پرشکوہ خانم کو اس کی باتوں سے عجیب خوف سا محسوس ہوا۔ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کے زور سے جھنجھوڑا اور چمچہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

"میں کہہ رہی ہوں ییشا! منہ کھولو۔"

وہ جیسے ہڑبڑا کے ہوش میں آئی۔ مگر ہوش شاید اتنا بھی ہوش مند نہیں تھا۔ تب ہی تو اسے دوا کے کڑوے ہونے کی شکایت کرنا بھی یاد نہ رہا۔

☆ ☆ ☆

"جو روم سیف اللہ نے ییشا کو دے دیا تھا۔ وہ تم اس سے خالی کیسے کروا سکتی ہو مہر؟" کچھ ہی دیر بعد وہ مہر سے جواب طلبی کر رہی تھیں۔

"مت بھولو کہ تم نے اس گھر سے جا کے اپنی جگہ خود خالی کی تھی۔"

"مگر اب میں واپس آگئی ہوں۔"

"واپسی پہ تمہیں اس گھر کے دروازے کھلے ملے۔ وہ ایک الگ بات ہے مگر تم ییشا پہ کوئی روا، بد' نہیں کر سکتیں۔"

"میں چاہوں تو اسے اس گھر سے بھی نکال سکتی ہوں۔" مہر کو ساس کا حکمیہ انداز تاؤ دلا گیا۔ "کون روکے گا مجھے؟"

"میں۔"

پرشکوہ خانم نے اسے تنفر سے گھور کے کہا۔ جو انہیں اول روز سے ہی پسند نہیں آئی تھی۔ سیف اللہ کی زندگی میں وہ اسے طوعاً کرہاً برداشت کرنے پہ مجبور تھیں۔ اب ایسا کون سا بھرم رہ گیا تھا جو وہ اس سے دبتیں۔

"میں روکوں گی مہر! کیونکہ سیف اللہ نے یہ گھر میرے نام کیا ہے۔"

"کیا؟ آپ کے نام' یہ گھر سیف کا نہیں؟" مہر کے پیروں تلے جیسے زمین ہی کھسکا لی کسی نے۔

"ہاں اور یہ اختیار صرف مجھے ہے کہ اس گھر میں کون رہ سکتا ہے اور کون نہیں۔ اگر تم بھی یہاں رہ رہی ہو تو اسے میرا احسان سمجھو ورنہ تم نے بھی ایک بہو کی حیثیت سے میرے دل میں کبھی بھی جگہ پانے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ اتنا کہہ کے رکی نہیں ورنہ دیکھ لیتیں کہ ان کے انکشاف نے مہر کے نقوش کو نفرت تلے مسل ڈالا تھا ان مسلے کچلے ہوئے نقوش کو دیکھ کے شاید وہ بخوبی اندازہ لگا پاتیں کہ وہ سارا عتاب ییشا پہ گرانے والی ہے۔

☆ ☆ ☆

ییشا کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کے رکی تھی۔ کیونکہ اندر رامی اور زینی نے حشر بپا کر رکھا تھا۔

رامی موٹی بیڈ پہ چڑھی ایک ہاتھ میں جوس کا پیکٹ پکڑے دوسرے ہاتھ میں سینڈوچ لیے ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے ہی وہ ایک لقمہ سینڈوچ کا لیتی ایک گھونٹ جوس کا بھرتی۔ کبھی سینڈوچ سے کیچپ ٹپک کے گرتا' کبھی بیڈ کے ذرے جھڑ جاتے تو کبھی جوس

چھلک کے نیچے جا گرتا اور پرے اس کے گندے میلے پیر۔ ہلکی گلابی چادر پہ کتنی ہی چیزوں کے بدنما داغ لگے تھے۔

اور زینی پنسل ہاتھ میں لیے دیوار پہ بنی سنڈریلا کے پھولے پھولے فراک پہ کچھ گل بوٹوں کا اضافہ کر رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو میشا کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ اپنے بستر کی چادر خراب ہونے پہ پہلے چیخے یا اپنی دیوار پہ بنے اس منظر کو تباہ ہوتے دیکھ کے چلائے جس کو نظروں میں سموئے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی رات کو۔

"یہ کیا کر رہی ہو موٹی؟ اترو میرے بیڈ سے گندے پاؤں لے کر چڑھ رہی ہو ساری مٹی لگا دی۔ نیچے اترو کے ناچو۔ تو ڑو گی کیا؟"

پھر وہ زینی کی جانب بڑھی اور اسے پورا زور لگا کے پرے کھینچنے لگی۔

"میری فیورٹ پینٹنگ خراب کر دی تم نے گندی چھپکلی!"

"چھپکلی تم ہو۔ تمہارا رنگ بھی چھپکلی جیسا ہے اور شکل بھی۔ آنکھیں دیکھو اپنی اور یہ ہونٹ الگ۔" زینی نے اسے پرے دھکا دیا۔

میشا کون سا کم تھی۔ خود کو چھپکلی کہلوائے جانے یا دھکا پڑنے سے زیادہ غصہ اسے دیوار خراب کرنے پہ آ رہا تھا۔ وہ زینی کے بال نوچنے لگی۔

"نکلو میرے روم سے آئی بڑی۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" مہر نے اندر داخل ہوتے ہی انہیں ہاتھا پائی کرتے دیکھا تو فوراً آگے بڑھ کے انہیں چھڑانے لگی۔

"بدتمیز۔ جنگلی لڑکی چھوڑو میری بیٹی کے بال۔"

"پہلے اس سے کہیں میری فراک چھوڑے پھٹ جائے گی۔"

میشا نے اب زینی کے گورے سڈول بازو پہ ناخن سے ایک لمبی لکیر کھینچ دی۔ زینی کے چلانے پہ مہر نے میشا کو زور کا تھپڑ دے مارا۔ وہ یکدم سن ہو کے رہ گئی مٹھی میں زینی کے اخروٹی رنگت والے بالوں کے ریشمی گچھے پھنسائے۔ گال پہ مہر کی انگلیوں کے سرخ نشان لیے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہیں ساکت ہو گئی۔

اس کے ہوش میں یہ پہلا تھپڑ تھا جو اسے لگا۔

"بالکل جنگلی ہے۔ گنوار وحشی! بازو چھیل کے رکھ دیا۔" مہر نے حلق پھاڑ کے چلاتی زینی کے بازو کو سہلایا۔

"یہ۔ یہ میرے روم کی وال خراب کر رہی تھی۔"

اس بار میشا کے حلق سے بڑی گھٹی گھٹی سی فریاد نکلی اور دانستہ وہ دو قدم پیچھے بھی ہٹ گئی تھی۔

"یہ کیا میرا روم۔ میرا روم لگا رکھا ہے؟ بہت اکڑ ہے ناں تمہیں اپنے اس روم کی اور بڑا زعم ہے اپنی گرینی پہ تو ٹھیک ہے آج کے بعد اسی کمرے میں رہنا یہیں تک محدود رہنا۔ خبردار! جو باہر نکلیں یا میں نے تمہیں اس کمرے کے علاوہ کہیں اور دندناتے ہوئے دیکھا تو۔ اور اپنی گرینی کے علاوہ اس گھر کے کسی بھی فرد کے پاس پھٹکنے تک کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پہ میری بیٹیوں کی طرف تو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

میشا سہم کے دیوار کے ساتھ لگی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ مہر کو غضب برساتے دیکھ رہی تھی۔ امی اور زینی کے ہونٹوں پہ موجود ہلکی ہلکی طنزیہ مسکراہٹ اسے زمین میں دھنسا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مہر ماما بہت بری ہیں سنڈریلا! انہوں نے زینی کو کچھ نہیں کہا، جس نے تمہارا ڈریس خراب کیا۔ انہوں نے امی کو بھی نہیں ڈانٹا جس نے میرا بیڈ گندا کیا، بس مجھے ہی جھاڑ پلائی۔ تھپڑ بھی مارا۔ تمہاری اسٹیپ مام بھی تمہیں مارتی تھیں ناں؟ کتنا برا لگتا ہے جب کوئی تھپڑ مارے۔ درد ہوتا ہے اور رونا بھی آتا ہے۔"

میشا کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ہتھیلی کی پشت باری باری دونوں آنکھوں پہ رگڑی اور اسکول بیگ اٹھا کے کمرے سے نکلی۔

"امی زینی! جلدی کرو، اسکول کا ٹائم ہو رہا ہے۔ پہلا دن ہے، آج دیر سے نہیں جانا۔ ہری اپ۔" مہران دونوں کے بستوں میں لنچ باکسز رکھتے ہوئے پکار رہی تھی۔

میشا نے بڑی آس سے ڈھونڈنا چاہا مگر ٹیبل پہ کوئی تیسرا لنچ باکس نہ تھا۔ اس نے کچن کی طرف رخ کر کے ملازمہ کو آواز دی۔

"سبحاں۔ میرا ملک شیک اور لنچ باکس۔"

"سبحا نہیں ہے اب نہیں آئے گی وہ۔" مہر نے بستوں کی زپ بند کرتے ہوئے بغیر اسے دیکھے اطلاع دی۔

"نہیں آئے گی کیوں؟"

"میں نے نکال دیا ہے۔ فضول میں اتنی تنخواہیں نہیں دے سکتی میں۔ تمہاری گرینی تو گھر اپنے نام کرا کے اور تمہیں میرے سر پہ سوار کرا کے بہت خوش ہیں ناں۔ گھر تو میں نے چلانا ہے۔ یہ درد سر تو میرا ہے کہ پیسے کہاں سے آنے ہیں اور کہاں خرچ کرنے ہیں۔"

"تو کام کون کرے گا گھر کے؟"

میشا کے معصوم سے سوال نے مہر کو مزید سلگا دیا۔

"ظاہر ہے میں اور کون؟ تمہیں تو ہاتھ نہیں لگانے دینا ماما نے اور خود وہ بیمار بن کے بیٹھ گئی ہیں۔ میں ہی رہ جاتی ہوں اندر باہر کے کام نمٹانے کو۔"

"او کے پھر مجھے ملک شیک بنا دیں سٹرابیری کا۔ آئس نہیں ڈالنی اور لنچ میں۔۔۔"

"میں۔۔۔ میں تمہارے لیے ناشتا بناؤں گی؟ یہ خوش فہمی کس لیے ہے تمہیں۔ جاؤ! جا کے اپنی گرینی سے کہو یا خود بناؤ۔"

"خود؟ میں سکول سے لیٹ ہو جاؤں گی۔"

"کون سا اسکول؟ کیا اسکول؟ تم کوئی اسکول وغیرہ نہیں جاؤ گی۔"

"مہر! تم میشا کو اسکول جانے سے روک نہیں سکتیں۔"

پرشکوہ خانم نے وہاں آتے ہوئے کہا مگر اس بار ان کی آواز میں جلال کی بجائے نقاہت غالب تھی۔ اسی وجہ سے مہر اس بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولی۔

"مگر میں اسکول نہیں بھیج سکتی۔ مت بھولیں کہ جیسے یہ گھر سیف اللہ نے آپ کے نام کیا ہے ویسے ہی فارم میرے نام کیا ہے۔ اس گھر میں کسے رہنا ہے یہ آپ ضرور طے کر سکتی ہیں مگر اس گھر کو چلانا کیسے ہے یہ میرا کام ہے اور اس لڑکی پہ میں ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کرنے والی۔ یہ تو طے ہے یہ اسکول نہیں جائے گی۔"

وہ امی اور زینی کی انگلی تھامے ان کے بستے اٹھائے باہر نکل گئی اور پرشکوہ خانم کو گہری سوچوں میں دھکیل گئی۔ میشا آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کو باہر جاتے اور سکول وین میں بچیوں کو سوار کراتے دیکھتی رہی پھر اس نے پرشکوہ خانم کی ساڑھی کا پلو جھٹکتے ہوئے فریاد کی۔

"گرینی۔"

مگر کوئی جواب نہ ملنے پہ پیر پٹختے ہوئے روتی دھوتی اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے پائی پائی کا حساب جوڑ لیا تھا۔ جو جمع جتھا تھا، سامنے رکھ کے دیکھ لیا تھا۔ آنے والے ماہ و سال کو شمار کرتے ہوئے بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ اگر وہ اس رقم کو میشا کے اسکول اور دیگر اخراجات یا اس کی فرمائشیں پوری کرنے میں خرچ کریں گی تو زیادہ سے زیادہ چھ سات سال نکل پائیں گے جبکہ ان کی صحت جس تیزی سے گر رہی تھی انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ پتا نہیں وہ اتنا عرصہ جی بھی پائیں گی یا نہیں۔ سیف اللہ کی اچانک اور بے وقت موت نے انہیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔

"نہیں! اس وقت میشا کے آنسو نہیں، اس کا تحفظ

زیادہ ضروری ہے۔ اس کی فرمائشوں سے زیادہ اس کا مستقبل عزیز ہونا چاہیے مجھے۔ یہ سب جمع جتھا مجھے بہت دھیان سے خرچ کرنا ہوگا تاکہ ہیشا کے سمجھ دار ہونے سے پہلے ہی میرا بلاوا آگیا تو میرے پاس کچھ تو ہو اس کے لیے چھوڑنے کو۔"

اسی سوچ کے ساتھ انہوں نے ہیشا کو منانے کی کوشش کی کہ وہ اسکول جانے کی ضد چھوڑ دے۔

"نہیں! نہیں۔ میں جاؤں گی اسکول' اچھے اسی اسکول جہاں اب ابی اور زینی جاتی ہیں۔"

"جانے دو انہیں۔۔۔ میں خود پڑھاؤں گی اپنی ہیشا کو اور وہ کچھ پڑھاؤں گی جو ابی اور زینی کو اسکول میں بھی نہیں پڑھایا جاتا۔"

"مگر مجھے اسکول ہی جانا ہے۔"

"سمجھو! یہ اسکول ہی ہے۔"

"نہیں یہ اسکول نہیں ہے۔ یہ آپ کا روم ہے اور آپ ٹیچر نہیں ہیں' گرینی ہیں۔" ہیشا نے چڑچڑے پن کے ساتھ دونوں بازو سینے پہ باندھ کے منہ پھیر لیا۔

ہمیشہ کی طرح اس کی اس ادا پہ انہیں جی بھر کے پیار آیا۔

"اوکے کلوز یور آئیز۔"

انہوں نے اس کی پیشانی چومی' جو اس کے وجود کا سب سے پسندیدہ حصہ تھی ان کے لیے۔

"وائے ؟" ہیشا نے اپنی ننھی سی ناک سکوڑی۔

"ہم ایک کہانی بنتے ہیں۔"

"بنتے ہیں ؟" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ تجسس نے ساری ناراضی کو دبا لیا تھا۔

"ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو سنائی جاتی ہے اور ایک کہانی وہ ہوتی ہے جو آنکھیں بند کرکے تصور کی جاتی ہے تو چلو! بند کرو آنکھیں۔"

ہیشا نے فوراً" زور سے آنکھیں میچ لیں۔ گندمی سک سے چہرے پہ اب صرف پلکوں کی ہلکی ہلکی لکیر نظر آرہی تھی۔ پپوٹوں کی سبز رگیں ابھر آئی تھیں۔ انہیں ہنسی آگئی۔

"آنکھیں بند کرنے کو کہا تھا۔ غائب کرنے کو نہیں۔ اتنی زور سے کیوں میچ رہی ہو۔ ایسے بند کرو جیسے سوتے میں کرتے ہیں۔"

ہیشا نے فوراً" ہدایت پہ عمل کیا مگر پپوٹوں کی ہلکی ہلکی لرزش اس کے ہیجان خیز تجسس کو ظاہر کررہی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے آخر۔

"اب سوچو۔۔۔ یہ ہیشا کا اسکول ہے' دنیا کا سب سے اچھا اسکول' یہاں اس کے سب کلاس فیلوز پتا ہے کون ہیں؟ اس کے سارے ٹوائز' پوہ' پنک پینتھر' ڈورا' تھی ہاؤس۔۔۔"

ہیشا نے بند پلکوں کے پار خود کو ایک بڑے سے روشن کلاس روم میں محسوس کیا۔ جو بالکل گرینی کے کمرے جیسا تھا مگر ویسا نہیں تھا۔ وہاں اب ڈریسنگ ٹیبل کی جگہ بلیک بورڈ تھا۔ جہاں خاندانی تصویریں لگی تھیں' وہاں اب کچھ چارٹ چسپاں تھے جن میں سے ایک پہ کوئی نظم لکھی تھی۔ ایک پہ بہت خوب صورت منظر کشی تھی اور ایک پہ مختلف جانوروں کی تصاویر کے ساتھ ان کے نام لکھے تھے۔ وہ اپنے سارے پسندیدہ اسٹفڈ ٹوائز کے ساتھ بیٹھی پڑھ رہی ہے۔ اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی خوشی سے سرشار ہوکے تالیاں پیٹیں۔

واؤ۔۔۔ گرینی کی کلاس روم۔"

"اور تمہاری ٹیچر میں۔ یعنی تمہاری گرینی اور تمہارا یونیفارم وہ بورنگ سا وائٹ یا گرے نہیں ہے بلکہ تمہارے فیورٹ پنک کلر کا فراک ہے۔ شوز بھی بلیک نہیں' بلکہ سلور سینڈلز ہیں۔" انہوں نے ہیشا کے لباس کو دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھیں۔ کھلتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہننا' بننا سنورنا' ٹک سک سے درست رہنا ہیشا کی کمزوری ہے۔

"اور ہمیں بورنگ قسم کی اسکول بکس کی بجائے فیری ٹیلز پڑھنے کو ملتی ہیں۔"

"Yuppy۔" وہ اچھل ہی پڑی۔

"اور اب گرینی ٹیچر پڑھائیں گی سنڈریلا کی اسٹوری۔" انہوں نے کتاب کھولی۔

"مگر گرینی!"

"ہوں ہوں۔ اسکول میں گرینی نہیں صرف ٹیچر۔"

"اوکے ٹیچر! سنڈریلا کی اسٹوری تو سنائی جاتی ہے۔ پڑھائی نہیں جاتی۔"

"کلوز یور آئیز۔" وہ پھر سے مسکرائیں۔

"واؤ" اسٹوری کے اندر ایک اور اسٹوری۔" ہیشا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کہانیوں کا تو ہوکا تھا اسے۔

"ہوں' اسی لیے تو میں اسے کہانی بننا کہہ رہی ہوں۔ کہانی کے اندر ایک اور کہانی بنتے جاؤ' بنتے چلے جاؤ۔"

ہیشا نے مسکرا کے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ایک شرارتی مگر مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ تھی اور پلکیں لرز رہی تھیں شاید ان کی اوٹ میں جو خواب پل رہا تھا' وہ سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ وہ خواب جس میں گرینی کی سنی کہانی کے سب ہی کردار تھے مگر وہ سب ان چہروں کے ساتھ تھے جو چہرے وہ روز اپنے ارد گرد دیکھا کرتی تھی اور ان چہروں میں سے ایک چہرہ اس کا بھی تھا۔ سب سے نمایاں سب سے من چاہے کردار میں۔

☆ ☆ ☆

اور خود کو اس کردار میں سموتے اور کبھی اس کردار کو خود میں سموتے سموتے اس نے زندگی کے دس سال اور گزار دیے۔

اب بھی بند پلکوں کے پیچھے وہ ایک جہاں آباد رکھتی ہے۔۔۔ یہ الگ بات کہ پلکیں کھولنے کے بعد بھی اکثر اپنا آپ وہیں اندر بسے کسی الگ جہان میں چھوڑ آتی تھی۔

اب وہ زیادہ تر خواب کھلی آنکھوں کے ساتھ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھنے کی عادی ہوگئی تھی' مگر کچھ خواب ایسے تھے جو بچپن سے لے کر اب تک اس کی نیندوں میں گھات لگا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس کی نیندیں گہری ہوتیں' وہ موقع پاتے ہی آن دھمکتے۔ جیسے اس وقت ہوا۔

وہی کمرا تھا اس کا۔ بیضوی اور اونچی چھت والا۔

پچھلے دس سالوں سے ان دیواروں کو رنگ و روغن نصیب نہیں ہوا تھا۔ دیواروں کی ہلکی گلابی اور چھت کی گہری بادامی قلعی جگہ جگہ سے جھڑ چکی تھی اور جو باقی تھی وہ پھیکی پڑ چکی تھی۔

دیوار پہ بنی سنڈریلا کی تصویر کے رنگ بھی مدھم ہو چکے تھے۔ چاند اتنا روشن نہ لگتا تھا۔ گھاس اب اتنی مخملیں نہ لگتی تھی۔ ہاں مگر اس تصویر میں اور ہیشا کی نیندوں میں وہی رشتہ اب بھی قائم تھا۔ اس منظر کو نظر میں سموئے بغیر وہ نیند کی وادی میں قدم نہیں رکھتی تھی۔

کھلونے اب بھی وہی تھے۔ کتابیں بھی وہی۔۔۔ وہی تکیے' وہی چادریں' وہی ہیشا اور وہی اس کا بچپن کا ساتھی وہ بھیانک خواب' جو آج بھی اسے سہا دیا کرتا ہے۔

وہ دہشت زدہ سی ہو کر چیختے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ سانس پھولا ہوا تھا۔

ذہن میں ابھی تک اس نامعلوم اور انجان زبان کے منتر گونج رہے تھے' جن کا ورد وہ خواب میں سنا کرتی تھی۔

اس نے سہم کر نیم تاریک کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ لیمپ کا بلب فیوز ہوئے مہینے ہو رہے تھے۔ جالی کے مہین پردوں سے آتی روشنی بڑی ناکافی سی تھی ہیبت کے مارے اس کا بدن کپکپانے لگا اور وہ ننگے پاؤں سرپٹ باہر کی جانب بھاگ گئی۔

طویل راہداری سے گزرتے ہوئے بھی وہی تاریکی بار بار اس کا دامن تھام رہی تھی۔ نجانے مہر کو تاریکی سے اتنی انسیت کیوں تھی کہ اتنے بڑے گھر میں درجنوں قمقمے تھے' مگر ان میں سے ایک آدھ کو ہی روشن کرنے کی اجازت تھی۔ قد آدم شمع دان سالوں سے ناکارہ اور بے فیض کھڑے تھے۔ دیواروں میں لگیں قندیلیں عرصے سے بجھی پڑی تھیں۔ نیم تاریکی میں جابجا لگی قدیم تصاویر اور مصوری کے فن پارے ہولناک سی شبیہہ لیے اس کے خوف میں مزید اضافہ

کر رہے تھے۔

پھولے ہوئے سانس کے ساتھ وہ پرشکوہ خانم کے کمرے کے بھاری دروازے تک پہنچی اور دوڑ کے ان سے لپٹ گئی۔ ان کی وہیل چیئر کتنی دور تک پیچھے دھکیلی گئی۔

"میشا کیا ہوا؟"

"گرینی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"پھر سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا؟" وہ اس کا سر تھپکنے لگیں جو ان کی گود میں تھا اور اس کے گھنگھریالے گھنے بال اس بری طرح بکھرے تھے کہ ان کے گھٹنوں پہ بچھا سرمئی دوشالہ کہیں سے ذرا بھر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"کوئی خواب نہیں، وہی خواب۔" لمحہ بھر کے لیے ان کی آنکھوں کے گرد بنے دائرے کچھ سمٹے پھر سر جھٹک کر کہنے لگیں۔

"تم اس بارے میں بہت زیادہ سوچتی ہو اس لیے رات کو خواب میں وہی دیکھتی ہو۔"

"قسم سے نہیں، وہ بھی بھلا کوئی ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں میں سوچوں۔ میں سچی میں یہ خواب کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہتی، یہ خود بخود آجاتا ہے۔"

انہیں اس کے لہجے کی بے چارگی کے سامنے اپنا آپ بے بس پڑتا محسوس ہوا۔

"تو ٹھیک ہے۔ پھر اس خواب کے ساتھ فائٹ کرو۔"

"کیسے؟"

"اپنے روم میں جاکے ایک بار پھر سونے کی کوشش کرو۔"

"میں آپ کی بات آدھی مانوں گی۔" وہ شرطیں رکھنے لگی۔

"آدھی، وہ کیسے؟"

"میں سونے کی کوشش ضرور کروں گی مگر آپ کے روم میں۔" وہ مسکرائی تو اس کے لبوں کے دائیں گوشے کا تل شرارت سے پھیل گیا۔

"جی نہیں، تم اپنے روم میں جاؤ گی۔"

وہ ایک بار پھر زور سے ان کے ساتھ لپٹ گئی۔

"نہیں گرینی! نہیں پلیز آپ کے ساتھ۔"

"ایک تو یہ تمہاری ہر دوسرے دن کی ضد ہے۔ ایسا کب تک چلے گا میشا؟ تمہیں اپنے ڈر کو ہرانا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے آپ کے ساتھ سونا ہے، ویسے بھی کتنے دنوں سے ہم نے کوئی سٹوری نہیں بنی۔" اس نے دانہ ڈالا اور واقعی حربہ کارگر رہا کیونکہ وہ مسکرا اٹھی تھیں۔

"ہوں! اچھا طریقہ ہے یہاں رکنے کا کیونکہ تم جانتی ہو مجھے تمہاری بنی کہانیاں سننا کتنا اچھا لگتا ہے۔ چلو بنو۔"

میشا وہیں ان کی وہیل چیئر کے پاس بچھے افغانی غالیچے پہ پھیل گئی۔ سر پرشکوہ خانم کی گود میں تھا اور انگلیاں غالیچے کے گل بوٹے پہ۔ آنکھیں موندے وہ صرف انگلیوں کی پوروں کی مدد سے چھو کر بتا سکتی تھی کہ اب اس کی انگلیاں کس پتے یا کس رنگ پہ ہیں سالوں کا ساتھ جو تھا۔

"کہانی شروع ہوتی ہے ایک بہت خوب صورت سی وادی سے۔" اس کا لہجہ مخمور سا ہوا مگر پرشکوہ خانم کے ٹوکنے پہ سارا خمار ہرن ہوگیا۔

"نہیں، وادی نہیں، جزیرہ، آئی لینڈ۔"

"اوکے جزیرہ۔" وہ بدمزا تو ہوئی مگر مصالحت بھرا سانس لے کر ان کی ترمیم گوارا کی۔

"ایک خوب صورت جزیرہ، سرسبز شاداب ہرا بھرا۔"

"نہیں، برف سے ڈھکا ہوا بہت ٹھنڈا۔" میشا کی بند آنکھوں میں ہلکا سا کھنچاؤ اس کی ناگواری ظاہر کر گیا مگر لہجے کو حتی الامکان ٹھنڈا رکھتے ہوئے اس نے نیم رضامندی سے کہا۔

"اوکے، ایسا ہی سہی۔ برف سے ڈھکا ہوا تو یہ دل نہیں بھرتا آپ کا یہاں کی سردی سے، جو خوابوں اور کہانیوں میں بھی برف کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ ہاں! تو اس جزیرے پہ کسی پیلس میں رہتی تھی ایک بہت خوب صورت پرنسس۔"

"پیلس میں نہیں ہٹ میں۔"

اب کے وہ مزید نرمی نہ رکھ سکی۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کے خفگی سے کہنے لگی۔

"کیا ہے گرینی! آپ ہمیشہ میری اسٹوری میں گھس کے اپنی مرضی کی بنت کرتی رہتی ہیں۔ یہ اسٹوری میری ہے۔ میری مرضی کہ میں اسے پیلس میں رکھوں یا کسی ہٹ میں یا چاہے تو کسی ڈورم میں بٹھادوں۔"

"ٹھیک ہے! پھر ڈورم میں بٹھادو اپنی شہزادی عالیہ کو۔" وہ ہنسنے لگیں۔

"جی نہیں۔ وہ پرنسس ہے اور پرنسس کبھی ایسی ویسی جگہ نہیں رہتی، پرنسس صرف پیلس میں رہنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔"

✡ ✡ ✡

مئی کا آغاز تھا۔

یہاں مئی اور جون سے مراد چلچلاتی گرمی نہیں بلکہ بہار کی مستی اور شادابی تھی۔

پورا علاقہ چھ مہینے برف سے ڈھکے رہنے کے بعد اس سفیدی کو جھڑا کے دھل دھلا کے نکھرا ہوتا ہے۔ قسم قسم کے بوٹے اور پتے سر ابھار رہے ہوتے ہیں چشمے پگھل کے رواں ہو رہے ہوتے ہیں۔ آتش داں مسلسل جلتے رہنے کے بعد اب سکون کا سانس لیتے ٹھنڈے پڑے ہوتے ہیں۔

سرمئی چٹخے پتھروں اور سرخ اینٹوں سے بنا یہ دو منزلہ سیف کاٹیج جھیل کے اس پار تھا، جہاں سفید گلابوں کی بہتات تھی اور آبادی بے حد کم تھی۔

یوں تو سارا علاقہ ہی بے حد پرسکون تھا مگر یہ گوشہ بطور خاص سیف اللہ کو اسی لیے بھایا تھا کہ یہاں مصروف زندگی کی وہ خاص چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی جس سے وہ دور رہنا چاہتا تھا۔

نہ تارکول کی سڑکیں، نہ بلند و بالا عمارتیں، نہ دکانیں، نہ بل بورڈز، نہ شور، نہ ہنگامہ۔

جھیل کے اس پار والے علاقے میں البتہ زندگی اپنی تمام تر شوخیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اگرچہ بڑے شہروں والی چکاچوند نہ تھی مگر پھر بھی شام ہوتے ہی شاپنگ مالز، موڈ کورنس اور واحد سینما گھر کی روشنیاں جل اٹھتی تھیں۔ دن بھر کے کاموں سے تھکے یہاں کے باسی چہلیں کرتے نظر آتے تھے اور اس پار سے بھی لوگ جب سکون اور سکوت سے گھبرا جاتے تو کشتی کے ذریعے جھیل کے پار جاکے روشنیوں اور ہنگاموں سے اپنا حصہ وصولتے مگر سیف اللہ ضرورتاً کچھ خرید و فروخت کی نیت سے ہی ہفتوں بعد نکلتے تھے۔

سیف اللہ کے جانے کے بعد مہر نے بہت کوشش کی کہ یہ گھر بیچ کر جھیل کے اس پار کوئی چھوٹا مگر جدید طرز زندگی کا حامل گھر خرید لیا جائے مگر پرشکوہ خانم کے نام سیف کاٹیج ہونے کی وجہ سے وہ کبھی یہ خواہش پوری نہ کرسکی۔ دل میں ساس کے خلاف عناد اور بھی بڑھ گیا تھا۔

پرشکوہ خانم کے یہ گھر نہ چھوڑنے کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے سیف اللہ کی زندگی کے آخری دنوں کی یادگاریں وابستہ تھیں تو دوسری وجہ میشا تھی، جسے یہ گھر اور اس کے آس پاس کا سارا علاقہ بے حد پسند تھا۔ وہ جانتی تھیں میشا جس مزاج کی ہے شاید چہل پہل اور ہنگاموں میں اس کی روح بے چین رہے گی۔ شور شرابا اس کے ان خوابوں میں خلل ڈالے گا جو خواب وہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھتی ہے۔ وہ اسی سرمئی پتھروں اور سرخ اینٹوں کے بنے گھر میں خوش رہ سکتی ہے جس کی دیواریں اتنی ٹھنڈی ہیں کہ باہر کتنی ہی گرمی ہو، تپش اندر تک نہیں پہنچ سکتی۔

اور جس کی چھتیں اتنی اونچی تھیں کہ کبھی ابابیل کسی کڑی میں گھونسلہ بنا لیتی تو میشا کو جھانک کر اس میں سے انڈے گننے کے لیے بڑا تردد کرنا پڑتا۔

اور جس کی سیڑھیاں ہال کے وسط میں سے گھوم کر اوپر کو جاتی تھیں جہاں گرینی کا اور میشا کا کمرا تھا اور سیف اللہ کی اسٹڈی اور ایک خالی کمرا جس سے اسٹور کا کام لیا جاتا تھا اور اس کے علاوہ بڑی بڑی کھلی روشن ہوادار بالکونیاں، دریچے جہاں کھڑے ہو کر وہ گھنٹوں کہانیاں بنا کرتی۔

نیچے ایک بے حد وسیع ہال کے ساتھ زینی، امی اور مہر کے کمرے تھے۔ پرانی طرز کا بڑا سا باورچی خانہ تھا۔ جس کے اندر ہی تندور بنا ہوا تھا۔ جہاں مہر اکثر اتوار کو گڑ اور سوجی کا کیک بناتی جو میشا کو بڑا پسند تھا مگر اسے ہر بار چوری کر کے کھانا پڑتا تھا۔ بڑی بڑی مقفل الماریاں تھیں جن میں مرتبانوں میں شہد، زیتون، بادام، زعفران، چاندی کے ورق، پستے کی ہوائیاں اور کشمش بند ہوتے تھے۔ جو مہر ہوشیاری سے نکال کر استعمال کرتی تھی۔ میشا کے دل میں بڑا ارمان تھا کہ کسی دن وہ مہر کی کمر سے بندھی وہ چابیاں اتار لے اور مٹھی بھر کے بادام اور پستے اپنے کمرے میں لے جائے مگر دس سال سے یہ ارمان حسرت بن کے ہی پل رہا تھا۔ اس کا آدھا دن یہیں گزرتا تھا مختلف کاموں میں، کبھی ناشتا بنانے میں، کبھی مسالے پیسنے میں، کبھی کھانا بنانے میں مہر کی مدد کرنے اور برتن تو خیر کئی سال سے وہی دھوتی آئی تھی مگر کسی الماری تک اس کی رسائی کبھی نہ ہو سکی تھی۔

ابھی بھی وہ ناشتے کے برتنوں کا ڈھیر دھو رہی تھی کہ سب کا الگ الگ ناشتا بنتا تھا۔ پرشکوہ خانم کا دلیہ، چائے اور جوس زینی کا جوس ابلا انڈا اور شہد میں پسے بادام۔ امی کا آملیٹ، فرنچ ٹوسٹ، مہر کی چائے اور سلائس کے ساتھ مارجرین اور میشا تو اپنی کریمی کے ساتھ ہی ناشتا کرتی اور بدل بدل کے کبھی اس کا جی فروٹ کاک ٹیل پہ شہد ڈالنے کا کرتا تو کبھی آملیٹ کو دل مچلتا تو وہ امی اور زینی کا ناشتا بناتے ہوئے اپنا حصہ چپکے سے الگ ضرور کرلیتی۔ یہی وجہ تھی کہ بس ناشتا اسے پیٹ بھر کے اور من مرضی کا مل جاتا تھا کہ کریمی کے کمرے میں چھپ کے جو کرنا ہوتا تھا اور خود بنانا بھی ہوتا تھا ورنہ باقی دونوں وقت مہر کھانا خود بناتی تھی اور ٹیبل پہ لگاتی بھی خود ہی تھی، یہ الگ بات کہ اس میں بھی میشا کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ سبزی کاٹنے، دھونے، چھیلنے سے لے کر مسالے پیسنے تک وہی ساتھ ساتھ لگی رہتی تھی۔

"کس قدر سست لڑکی ہو تم ۔۔۔ ایک کام وقت پہ نہیں کرتیں۔"

مہر غصے سے پھنکارتی اندر داخل ہوئی تو وہ جو دھیرے دھیرے گلاس پہ جھاگ ملتی مدھر مسکان کے ساتھ کسی ہرن کی طرح خیالوں ہی خیالوں میں قلانچیں بھرتی پھر رہی تھی، بری طرح سے چونکی۔ شکر ہے گلاس پھسلا ضرور مگر گرا نہیں۔

"کون سا ایک کام مام؟" اس نے معصومیت سے پلکیں پٹپٹائیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح مہر کو زہر لگی۔

"اوفوہ! ایک تو اس ڈفر کو ایک بات سمجھ نہیں آتی۔"

"کون سی ایک بات مام؟"

"ابھی تک برتن کیوں نہیں دھوئے تم نے؟"

"کیونکہ میں ڈسٹنگ کر رہی تھی۔"

"اور ڈسٹنگ میں اتنی دیر کیوں لگادی؟"

"میں کپڑے دھونے لگ گئی تھی ناں۔"

"کون سے کپڑے، مجھے تو باہر کوئی دھلے ہوئے کپڑے لٹکے نظر نہیں آرہے۔" مہر نے کھڑکی سے غصے سے صحن میں جھانکا۔

"کیسے نظر آئیں گے میں نے دھوئے ہی نہیں۔"

"کیوں؟" وہ چلائی۔

"کیوں نہیں دھوئے، ڈھیر رکھا پڑا ہے میلے کپڑوں کا۔"

"دھونے تھے مگر آپ نے ڈسٹنگ کرنے کا کہا تو وہ کرنے لگ گئی۔"

"وہ کی یا اسے بھی درمیان میں چھوڑ دیا؟" مہر زچ ہونے لگی۔ روز ہی ہوتی تھی۔

"چھوڑنی پڑی ۔۔۔ برتن بھی تو دھونے تھے۔"

"اور برتن بھی اب جوں کے توں چھوڑ کے تم سبزی بنانے کھڑی ہو جاؤ گی جو شاید تم سے شام تک بنے۔ آخر تم کوئی کام پورا کیوں نہیں کرتی؟"

"کون سا والا کام مام؟" میشا نے بڑی صفائی سے مسکراہٹ ہونٹوں کے گوشوں تلے چھپائی تھی۔ مہر کی حالت اسے مزا دے رہی تھی۔

"اف! یہ لڑکی مجھے پاگل کر دے گی۔" بس یہی اپنی کسر رہ گئی تھی۔

"کون سی لڑکی؟"

☆ ☆ ☆

"عذاب کی طرح مسلط ہے یہ میرے سر پہ۔ جان بوجھ کے مجھے چڑانے کے لیے ایسی حرکتیں کرتی ہے، پتا نہیں اور کتنے سال مجھے اسے جھیلنا پڑے گا۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے ہال میں سے گزری اور جان بوجھ کے پرشکوہ خانم کی وہیل چیئر کے بالکل قریب سے گزری۔ مقصد انہی کو سنانا تھا مگر ان کے نظر انداز کر کے اخبار میں بدستور گم رہنے پہ رک کے پلٹی اور براہ راست مخاطب کیا۔

"اور یہ سب آپ کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس کو اتنی ڈھیل دی ہے بلکہ شہہ دی ہے جس کی وجہ سے وہ کمر کس کے مجھ سے مقابلے پہ اتری رہتی ہے۔"

"تم نے خود ایک معصوم اور بے ضرر بچی کو اپنے مقابلے پر کھڑا کر رکھا ہے مہر!" آخر کار وہ اخبار سے نظر ہٹا کے اسے دیکھنے پہ مجبور ہوئیں۔ ورنہ ان کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ کام مہر کے دلکش نقوش والے چہرے پہ رقم نفرت کو برداشت کرنا تھا۔

"اور اتنے سالوں سے اگر تم نے اس کا سکون اور آرام تہس نہس کر رکھا ہے تو بے سکون تم بھی ہو۔"

"میں تو اس دن سے بے سکون ہوں، جس دن سے یہ اس گھر میں آئی تھی اور میرا کھویا ہوا سکون مجھے واپس تب ملے گا، جب یہ یہاں سے جائے گی۔"

"پھر تو مجھے تمہاری زندگی پہ ترس آرہا ہے کیونکہ تم ہمیشہ بے سکون ہی رہنے والی ہو۔"

پرشکوہ خانم نے ایک دل جلانے والی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجا کے اخبار کو پھر سے چہرے کے آگے پھیلا لیا۔

"سیف اللہ نے یہ گھر میرے نام شاید اسی لیے کیا تھا کہ تم میشا کو یہاں سے نکالنے کا کبھی نہ سوچو اور یہ یاد

رکھنا کہ میرے بعد یہ گھر میشا کا ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

زینی چہرے پہ ماسک لگائے لیٹی کسی مغربی گانے کی دھن پہ ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

وہ مہر کے سارے نقش چرا کے لائی تھی مگر رنگت اس نے اپنے بنگالی نانا سے سانولی لے لی تھی' جس کا اسے بے حد قلق تھا۔ بڑی حسرت سے وہ ماں کے گلاب میں گندھے میدے جیسی رنگت کو دیکھا کرتی اور پھر پوری تندہی کے ساتھ نت نئے ٹوٹکے آزماتے ہوئے اپنی رنگت کو نکھارنے کے جتن کرنے لگتی' ویسے وہ پوری کی پوری مہر تھی۔

وہی سرو قامتی
وہی تراشا ہوا پیکر
لانبی انگلیاں
بڑی بڑی آنکھوں پہ گھنی پلکیں
گداز خوب صورت کٹاؤ کے ہونٹ
موتیوں جیسے دانت
موتیے کی منہ بند کلی جیسی مہین سی ناک
گھنیرے ریشمی آبشار جیسے بال
بس ذرا سی رنگت نکھر جاتی تو۔۔۔

"زینی تم نے میرا کنیڈیز باکس دیکھا ہے؟" امی سینڈوچ کترتے ہوئے اندر آگئی۔

وہ میدے کی بوری تھی۔ نقش اس کے بھی ماں والے تھے اور رنگت بھی وہی سرخ و سفید بلکہ مہر سے بڑھ کے سرخیاں ٹپک رہی تھیں۔ مگر فربہی نے اس کے نقوش کی خوب صورتی کو چربی کی تہہ میں چھپا رکھا تھا۔

"سوری! میں ڈائٹ پہ ہوں۔۔۔ ایسی چیزوں کو دیکھنے سے بھی پرہیز کرتی ہوں۔"

"اوہ! تو یہ کوکمبر تمہارے پاس ہے۔ میں نے اتنا چھپا کے رکھے ہوئے تھے اپنے سینڈوچ کے لیے۔ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئے؟" اس نے زینی کی آنکھوں پہ سے کھیرے کے قتلے اٹھائے۔

"امی! واپس دو یہ مجھے۔"

مگر وہ اس کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان قتلوں کو سینڈوچ میں رکھ کے مزے سے کھانے لگی۔

"یہ تمہاری چنی منی آنکھوں پہ نہیں۔ اس سینڈوچ میں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔"

"آخ! کتنی گندی ہو تم۔ یہ گندے سلائس مزے لے لے کر کھا رہی ہو۔"

"اگر یہ سلائس تمہاری آنکھوں پہ رکھنے کی وجہ سے گندے ہوئے ہیں تو گندی تو تم ہوئیں' میں نہیں۔"

"فضول بکواس مت کرو میشا کو بلاؤ' اسے کہو' میرے بالوں میں مساج کرے۔"

"وہ ماما کے پاس کچن میں ہے۔ اسے وہیں کام کرنے دو۔ ورنہ لنچ لیٹ ہوجائے گا۔"

"توبہ! تمہیں تو ہر وقت لنچ اور ڈنر کی فکر رہتی ہے۔"

"ہاں تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔" وہ آستین پلٹ کے میدان میں اتر کے لڑنے کو تھی کہ باہر سے آتی کچھ مانوس اور کچھ نامانوس سی آواز پہ ٹھٹک گئی۔ زینی نے بھی کان لگائے۔

گونجتی ہوئی آواز تھی۔ ویسی ہی جیسی وہ بچپن میں سنا کرتی تھیں اور پھر بھاگ کے بالکونی سے لٹک کر نیچے جھانکا کرتی تھیں۔ اب بھی دونوں ایک دوسرے کو دھکا دیتے باہر کی جانب بھاگیں۔

مگر میشا پہلے سے لکڑی کے سال خوردہ پھاٹک سے چپکی بڑے اشتیاق سے گلی میں جھانک رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہوش افتخار

کاش میرا یہ خواب کوئی

ڈائننگ روم کی خاموش فضا میں چھری اور کانٹے کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز نہ تھی۔ حالانکہ وہاں اس وقت ٹیبل کے گرد تین افراد کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ دن کے تین پہروں میں سے یہ وہ واحد وقت ہوتا تھا جب اس عظیم الشان عمارت کے مصروف مکینوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن ایسے میں بھی وہاں سوائے ضرورت کی بات چیت کے دوسری کوئی بات نہ ہوتی تھی۔

شاید اس مکان میں ہر کام ہی ضرورت کے فلسفے کے تحت ہوتا تھا۔ جسے دیکھ کر علی شیر یاران کے دل میں اکثر یہ خواہش ابھرتی کہ وہ اس محل کی پیشانی پہ سجا "یاران ولا" مٹا کر "ضرورت ولا" لکھوا دے۔ لیکن پھر اس خوب صورت محل کے مکینوں کی قسمت پہ رشک کون کرتا، جو دولت، عزت، شہرت اور طاقت کے لیے جانے جاتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے لیے جذبات کے معاملے میں کسی کھنکتے ہوئے برتن کی طرح بالکل خالی تھے۔

دراصل اس عمارت کی بنیاد ہی ضرورت کی اینٹ پہ رکھی گئی تھی۔ جس کے تحت رضا یاران اور عالیہ تنویر کی شادی اپنے والدین کے بزنس اور سیاسی مستقبل کو مضبوط بنانے کے لیے کی گئی تھی۔ اس بات کی پروا کیے بنا کہ دونوں کے مزاجوں میں نہ صرف زمین آسمان کا فرق تھا بلکہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے حد ضدی اور خود سر طبیعت کے مالک تھے۔

اگر علیحدگی کی صورت میں اپنے حصے کی پچاس فیصد جائیداد سے ہاتھ دھونے کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ دونوں کب کے اس زبردستی کے تعلق کو ختم کر کے آگے بڑھ چکے ہوتے۔ مگر اسے ان کے والدین کی ہوشیاری

مکمل ناول

کہیے یا ان دونوں کی بدنصیبی کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر مجبور تھے اور اسی مجبوری کے تحت جو گھر عمل میں آیا تھا وہ اتنا کمزور اور بکھرا ہوا تھا کہ علی شیر کا سارا بچپن اپنے ماں باپ کی بھرپور توجہ اور محبت کے لیے ترستے ہوئے گزرا تھا۔ مگر صرف بچپن ــــ بعد ازاں وہ بھی ان ہی کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔

بے حس اور اپنے حال میں مگن ۔ جس کے لیے پیسہ اور طاقت ہی خوشی اور سرور کا باعث تھا۔

وہ اپنے باپ کی پارٹی کے "یوتھ ونگ" کا صدر تھا۔ اس کی بے حد شان دار شخصیت اور غیر معمولی ذہانت نے اسے بے شمار نوجوانوں کا آئیڈیل اور ان گنت دلوں کی دھڑکن بنا ڈالا تھا۔

ان نازک دلوں سے کھیلنا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ لیکن محض وقتی طور پہ۔ کسی کو مستقل بنیادوں پہ اپنی زندگی میں شامل کرنے کا اس میں حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ کہیں اس کی ٹوٹی بکھری شخصیت ایک اور ٹوٹتے ہوئے گھر کو جنم نہ دے۔ حالانکہ اندر کہیں ایک آسودہ اور مکمل زندگی کی آرزو ہر گزرتے سال کے ساتھ زور پکڑتی جا رہی تھی اور تو اور اس کی اس تیسویں سالگرہ پہ عالیہ بیگم بھی اپنی تمام تر شخصی آزادی ایک طرف رکھتے ہوئے اسے شادی کے لیے کہنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔

ان کا مطالبہ اس کے لبوں پہ اک طنزیہ مسکراہٹ بکھیر گیا تھا۔ اسے اس لفظ سے متنفر کرنے والی اور عورت ذات سے بے اعتبار کرنے والی وہی تو تھیں۔

وہ اپنی اولاد کے سامنے اپنی بربادی کی دہائیاں اور اپنی شریک سفر کی ذات کی دھجیاں اسی طرح نہیں اڑانا چاہتا تھا، جس طرح اس کے ماں باپ ایک دوسرے کی یا اس وقت اس کی ماں اس کے باپ کی اڑا رہی تھیں۔ جن کا تازہ اسکینڈل آج صبح کے اخبار کی زینت بن کے عالیہ باران کے اشتعال کو ہوا دینے کے ساتھ ساتھ ڈائننگ روم میں چھائی خاموشی بھی توڑ گیا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں تمہیں شرم نہیں آتی اس عمر میں یہ گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے؟" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے دائیں جانب بیٹھے رضا باران کو گھورتے ہوئے اخبار پہ ہاتھ مارا۔ ان کے برعکس علی شیر پہ اس خبر یا ماں کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اسی اطمینان سے ناشتے میں مصروف تھا جتنا کہ چند لمحے پیشتر تھا۔ بلکہ اثر تو رضا صاحب پر بھی کچھ خاص نہ ہوا تھا۔

"نہیں!" وہ ان کی جانب دیکھے بنا بے نیازی سے بولے تو عالیہ کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"تم رضا باران! ایک گھٹیا آدمی تھے، ہو اور رہو گے۔"

"اور تم عالیہ تنویر! ایک بدزبان عورت تھیں، ہو اور رہو گی۔ تمہاری یہی حرکتیں ہیں جو مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کرتی ہیں۔ تم میں کوئی ایک بھی خوبی نہیں جو مجھے تم سے باندھ کر رکھتی۔" وہ بھی ملازموں کی پروا کیے بنا دو بدو چلائے تھے۔

"اپنے گناہوں کی گٹھڑی میرے کندھے پہ لادنے کی ضرورت نہیں اور تم ہو کیا جو میں تمہیں خود سے باندھ کر رکھتی؟ تم رضا باران درحقیقت عالیہ تنویر کے قابل ہی نہیں تھے۔"

وہ اپنی تمام تر نزاکت اور تہذیب ایک طرف رکھتی ان سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلائی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ غصے سے لال پیلے ہوتے رضا صاحب کوئی جواب دیتے، پرسکون سا علی شیر نیپکن سے منہ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"پاپا! میں آفس جا رہا ہوں۔ آپ چلیں گے کیا؟"

"ہاں چلو بیٹا۔ اس جاہل عورت کے ہوتے ہوئے بھلا کون ناشتا کر سکتا ہے۔" وہ انہیں گھورتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئے تھے اور پیچھے پیچ و تاب کھاتی عالیہ کتنی ہی دیر با آواز بلند انہیں کوستی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"صوفیہ! کہاں ہو بھئی؟ ڈرائنگ روم میں رخشی بھابھی اور اکبر بچوں کے ساتھ آئے بیٹھے ہیں۔" فصیح الحسن عجلت میں لاؤنج میں داخل ہوئے تھے جہاں صوفیہ چند مہمان خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ شوہر کی اطلاع پہ وہ اگلے ہی لمحے ان سے معذرت کرتی تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی جانب چلی آئی تھیں جہاں فصیح صاحب کی بیٹی علینہ کے سسرال والے آئے ہوئے تھے۔ باقی خاندان والے بھی وہیں موجود تھے۔ اکبر اعوان کے بیٹے اسد اعوان سے ان کی بیٹی علینہ کی منگنی ابھی چند ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم!" خوش دلی سے سلام کرتی وہ تپاک سے اپنی سمدھن کی طرف بڑھی تھیں۔ جو اپنے چہرے پہ زبردستی کی مسکراہٹ سجائے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"شکر ہے، تمہیں ہم سے ملنے کی فرصت تو ملی۔" تکلف سے صوفیہ کو گلے لگاتے ہوئے وہ ان کی چند لمحوں کی تاخیر جتائے بنا نہ رہ سکی تھیں۔

اتنے لوگوں کے درمیان ان کا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی صوفیہ بیگم کی مسکراہٹ پھیکی کر گیا تھا۔ رخشندہ اعوان کے مزاج کی نزاکت کے پیش نظر ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ان سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ خصوصاً علینہ کی منگنی کے بعد سے تو وہ اور بھی زیادہ محتاط رہنے لگی تھیں کہ اس رشتے میں زیادہ عمل دخل اسد اور اکبر اعوان کی پسند کو تھا، مگر وہ پھر بھی ہر بار کوئی نہ کوئی نکتہ اعتراض ڈھونڈ ہی لیتی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں بھابھی! آپ تو ہمارے لیے سب سے بڑھ کے ہیں۔" جواب صوفیہ کے بجائے فصیح صاحب نے مسکراتے ہوئے دیا تو رخشندہ بیگم کے چہرے پر اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"اوہو چھوڑو بھی یہ فضول کی باتیں۔ انہیں مبارک باد تو دو۔" اکبر صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "بھابھی! آپ کو اتنی بڑی سعادت کی بہت مبارک ہو۔"

"خیر مبارک بھائی جان! اللہ پاک آپ لوگوں کو بھی جلد اپنے گھر کی زیارت نصیب کرے۔" وہ متانت سے مسکراتے ہوئے اسد کی جانب متوجہ ہوئی تھیں جو انہیں مبارک باد دینے کے لیے اٹھ کر آگے بڑھا تھا۔ اس کے پیچھے فروا اور فریحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"فروا آپی اور فریحہ! آپ لوگ لان میں چلیں، وہاں سب کزنز بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ بھی آجائیں اسد!" بڑوں کو اپنی باتوں میں مصروف دیکھ کر وہ آداب میزبانی نبھانے کو مسکراتے ہوئے بولی تو فروا ایک نظر اٹھنے کے لیے پر تولتے بھائی پر ڈالتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"نو تھینک یو۔ ہم تینوں یہیں ٹھیک ہیں۔" اس کے روکھے جواب پہ جہاں علینہ کی مسکراہٹ سمٹی تھی، وہیں اس کی نظریں پہلے فروا اور پھر اسد کی جانب اٹھی تھیں۔ جو اپنی خفت چھپانے کو بے اختیار نگاہیں چراتا سیدھا بیٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کم آن علینہ! اب تو ناراضی ختم کر دو یار!"

"پلیز اسد۔ میں کوئی ناراض نہیں۔ آپ بس اب مجھے جانے دیں۔" وہ خفا خفا سی اپنی کتابیں اور فائل سمیٹتے ہوئے بولی۔ تو اسد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں تھے۔ جہاں اسد تیسرے پریڈ کے بعد اسے بصد اصرار، اس کے ڈپارٹمنٹ سے لے کر آیا تھا۔

کل یوں سب کے درمیان فروا کے دو ٹوک انکار پہ علینہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ جو پھر ان کی واپسی تک بحال نہ ہو سکی تھی۔ اس کی یہ خاموشی اسد نے با آسانی محسوس کی تھی، مگر وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ماں اور بہنوں کی موجودگی کے باعث خاموش رہا تھا۔ لیکن آج صبح موقع ملتے ہی وہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"پلیز، آپ کو پتا ہے مجھے یہ سب پسند نہیں۔" اس

نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا تھا لیکن اسد نے یک لخت ہی اس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت مضبوط کردی تھی۔

"فار گاڈ سیک' ہماری منگنی ہو چکی ہے یار!"

"شکر ہے' آپ کو یہ تو یاد ہے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی ہے۔ لیکن آپ شاید یہ بھول گئے ہیں اسد! کہ یہ رشتہ آپ کی شدید خواہش پہ ہوا تھا۔ ورنہ میری تو آپ سے سوائے سلام دعا کے شاید ہی کبھی کوئی بات ہوئی ہو۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے افسردگی سے بولی تو وہ قصداً" بات کو ہلکا رخ دینے کے لیے شرارت سے مسکرا دیا۔

"اور تمہاری یہی بے نیازی تو میرا دل لے اڑی تھی۔"

"اور اب شاید آپ کا یہی دل بھر چکا ہے۔" علینہ کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ آن ٹھہری تو اسد اک گہری سانس لیتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"دیکھو علینہ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے گھر میں' میرے علاوہ اگر کوئی اس رشتہ پہ راضی تھا تو وہ صرف ڈیڈی تھے۔ باقی مما' پا فروا اور فریحہ اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھیں کیونکہ وہ میری شادی فروا کی بیسٹ فرینڈ سے کروانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے اپنی محبت کی خاطر اسٹینڈ لیا' انہیں منایا۔ اب تم بھی تو میری خاطر تھوڑا سا کمپرومائز کرنے کی کوشش کرو نا۔ تم دیکھنا آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہا تھا اور علینہ کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے پوچھے کہ جب آپ نے سب کچھ اپنی خواہش اور اپنی خوشی کے لیے کیا تھا تو اب کمپرومائز کا سارا بوجھ تنہا اس کے شانوں پہ کیوں ڈال دیا گیا تھا؟ کیوں وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرکے یہ بھول رہا تھا کہ وہ تو فقط اس کے سہارے اسی گھر میں آنے والی تھی اور اگر وہی بے رخی برتتا رہے تو اس کا کیا بنتا۔

"اچھا اب بتاؤ کیا لوگی؟" اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے اسد نے موضوع بدل دیا۔

"کچھ نہیں۔ میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تو اسد نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے گھڑی پہ نگاہ ڈالی۔

"مجھے بھی دس منٹ تک آڈیٹوریم میں پہنچنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" علینہ نے نگاہ اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"پارٹی میٹنگ ہے۔"

"اسد! یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟ یہ سیاست تو سوائے وقت کے زیاں اور فضول قسم کے لڑائی جھگڑوں کے اور کچھ نہیں ہوتی۔"

"نہیں یار! کسی بھی پولیٹیکل پارٹی سے وابستگی' آپ کے اسٹیٹس اور پوزیشن میں بڑا فرق پیدا کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی ہماری پارٹی جوائن کر لو۔ ہمیں ویسے بھی فی میل ممبرز کی ضرورت ہے۔"

"تو تھینک یو! مجھے ان خرافات میں پڑنے کا شوق نہیں۔" وہ منہ بنا کر اپنی چیزیں سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی تو اسد بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"ایز یو وش۔ لیکن ایک بار اپنی کلاس فیلوز سے ضرور پوچھ لینا۔ کیا پتا کوئی باذوق لڑکی ہمارے نقش قدم پہ چلنا چاہے۔" وہ ہاتھ میں پکڑے سن گلاسز لگاتے ہوئے شرارت سے بولا تو علینہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"پھر اپنی یہ پولیٹیکل کمپین بھی کسی باذوق سے کروائیں۔ بلکہ شادی بھی پھر اسی باذوق سے کریں گے کم از کم میری جان تو چھوٹے گی۔" وہ تن فن کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی تو کھلکھلا کر ہنستا اسد تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل دیا۔

☆ ☆ ☆

اپنے شان دار آفس میں بیٹھا' وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔ جب انٹر کام پہ اس کی پی اے نے

یونیورسٹی سے آنے والے دو حضرات کی آمد کے متعلق اسے مطلع کیا تھا۔ انہیں اندر بھیجنے کا کہہ کے وہ ایک بار پھر اسکرین کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ جب چند لمحوں بعد ہلکی سی دستک دے کے داور اور مغیث اندر چلے آئے تھے۔

"السلام علیکم سر!" دونوں پرجوش سے آگے بڑھے تو علی شیر بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کی یہی چھوٹی چھوٹی سی اخلاقیات تھیں جو اسے ہر دل عزیز لیڈر بنا گئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ اپنی بھرپور ذہانت کا صحیح اور بروقت استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔

"کوئی نئی تازی سناؤ؟" وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرکے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔

"نئی تازی تو کوئی خاص نہیں' بس وہ اسد اعوان آج کل بڑا فارم میں آیا ہوا ہے۔ آصف میر کا بڑا منظور نظر بنا ہوا ہے۔" داور نے مخالف پارٹی کے یونیورسٹی سیکریٹری کا نام لیا تو علی شیر کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں دوڑ آئیں۔

"کون اسد اعوان؟ وہ جس نے پچھلے سال میر کی پارٹی جوائن کی تھی؟"

"جی سر وہی۔" داور نے اس کے خیال کی تصدیق کی تو ایک محظوظ سی مسکراہٹ علی شیر کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"پھر تو خاصی تیز چیز ہو گا جو اتنے کم عرصے میں میر کے برابر آکھڑا ہوا ہے۔"

"ایسا ویسا۔ ایک نمبر کا ہوشیار آدمی ہے سر۔" مغیث نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پرسوچ انداز میں محض ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"سر! اگر آپ کہیں تو ہم اسے آفر کرکے دیکھیں؟" مغیث نے ایک نظر داور پہ ڈالی۔

"اوں... ہوں... وہ اس وقت اپنا سیاسی کیریئر بنانے کے چکر میں ہے۔ پارٹی بدل کے وہ کبھی بھی اپنی سال بھر کی محنت پہ پانی نہیں پھیرے گا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تم ایسا کرو' اس کے بارے میں کمپلیٹ انفارمیشن اکٹھی کرکے مجھے دو' پھر اسے صحیح وقت پہ صحیح طریقے سے ہینڈل کریں گے۔"

"اوکے سر! اب ہمیں اجازت؟"

"ایسے کیسے اجازت؟ چائے پی کے جانا۔" انہیں دوستانہ انداز میں ڈپٹتے ہوئے اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا تو دونوں لڑکے مسکرا دیے۔

☆ ☆ ☆

بیش قیمت فانوسوں سے سجا وسیع و عریض ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ طبلے کی تھاپ پہ مہارت سے تھرکتے پیر اور ان میں بندھے گھنگرو' اردگرد بیٹھے بہت سے

مدہوش مردوں کو اپنے ساتھ دیوانہ کیے دے رہے تھے۔

ملک کے کتنے ہی معزز اور معروف سیاست دان ' بزنس مینز اور بیوروکریٹس ' اس وقت چند ناچنے والیوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے کس قدر مضحکہ خیز لگ رہے تھے ' یہ کوئی اس سے پوچھتا جو اس سارے تماشے کو اجنبی نگاہوں سے تکتا ہاتھ میں پکڑے مشروب کو گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار رہا تھا۔

یہ نہ تھا کہ وہ کوئی زاہد خشک تھا ' بلکہ دوستوں کے لیے تو وہ اکثر و بیشتر ایسی محفلیں سجواتا بھی تھا اور دوسروں کی جانب سے کیے گئے ایسے اہتمام میں شرکت بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا ' اس محفل میں اس کے والد گرامی ' محترم رضا باران بھی موجود تھے جن کی رنگین مزاجی سے وہ نہ صرف باخوبی واقف تھا ' بلکہ اس کے لیے اتنے لوگوں کے درمیان ان کی حرکتیں برداشت کرنا ہمیشہ سے خاصا دشوار عمل رہا تھا۔ جب ہی وہ ان کے ساتھ ایسی کسی بھی نجی نوعیت کی دعوتوں میں جانے سے گریز کیا کرتا تھا۔ لیکن آج چونکہ رضا باران کے بہت قریبی اور پرانے دوست نے اپنے نئے بنگلے میں اس پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی علی شیر کو شرکت کرنا پڑی تھی کہ خالد انکل نے اسے الگ سے فون کر کے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور جب وہاں کھانے کے بعد محفل سجائی گئی تو اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ اور وہ جو وہاں سے نکلنے کا خواہش مند تھا ' خالد انکل کے بیٹوں اور بھانجوں ' بھتیجوں کے زور زبردستی کرنے پہ رکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

مگر اب وہ اپنے اس فیصلے پہ رہ رہ کے پچھتا رہا تھا اور جب اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ باپ نے سامنے ناچتی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کے اسے ایک جھٹکے سے خود پہ گرا لیا تو علی شیر کا ضبط جواب دے گیا۔

ہاتھ میں پکڑا گلاس زمین پہ مارتے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے اٹھ کر ہال سے باہر نکل گیا تھا۔

تازہ ہوا میں نکلنے کی خواہش میں اس نے بے چینی سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ تب ہی اس کی نظریں اس بے حد کشادہ لابی کے دائیں جانب موجود زینے کی جانب اٹھی تھیں اور وہ بنا سوچے سمجھے تیز قدموں سے اوپر چل دیا تھا۔

فرسٹ فلور کو پار کرتا وہ مزید اوپر آ گیا تھا ' پہلی سیڑھیوں کے اختتام پہ موجود بند دروازے کو کھول کر جونہی اس نے ٹیرس پہ قدم رکھا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسے بے اختیار گہری سانس لینے پہ مجبور کر گیا۔

اردگرد پھیلے اندھیرے کی چادر میں ' آسمان پہ چمکتے ستاروں اور گھروں میں جلتی روشنیوں نے افشاں سی بکھیر رکھی تھی۔ مگر اس کے اندر اماوس کی رات کا سا اندھیرا اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لینے کے بعد ذہن پہ چھائی پراگندگی میں کچھ کمی واقع ہوئی تو تھکی تھکی سی سرخ نگاہیں اطراف میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تبھی سڑک کے اس پار موجود بنگلے کا اندھیرے میں ڈوبا ٹیرس یک لخت روشنی میں نہا گیا تھا اور ایک نازک سا وجود نماز کے طریقے سے سر پہ دوپٹہ لپیٹے ' ایک ہاتھ میں تسبیح پکڑے نمودار ہوا تھا۔

اردگرد سے بے نیاز وہ لڑکی زیر لب ورد کرتے ہوئے خاصی اندھیری چھت پہ کسی کی موجودگی سے مکمل طور پہ بے خبر تھی۔

اور علی شیر جو ابھی کچھ دیر پہلے عورت کو اپنی نسوانیت اور عزت محض چند ٹکوں کے عوض روندتا دیکھ کے آیا تھا ' اس یکسر مختلف اور معطر روپ کو سامنے پاکے پلکیں تک جھپکنا بھول گیا تھا۔

وہ کوئی حور یا اپسرا نہ تھی مگر سبز دوپٹے کے ہالے میں لپٹا اس کا نرم گلابی چہرہ علی شیر کو اپنی زندگی میں آنے والے ہر حسین چہرے سے بڑھ کے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں اس حد تک محو ہوا تھا کہ اسے اپنی انگلیوں میں دبی جلتی ہوئی سگریٹ بھی یاد نہ رہی تھی جو دھیرے دھیرے راکھ کا ڈھیر ہوتی اس کی انگلیوں تک آ پہنچی تھی۔

اپنے دھیان میں ٹہلتے ہوئے وجود نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ یوں جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ اس کے رک کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے پہ علی شیر کی نظریں بھی دوبارہ اس کی طرف اٹھی تھیں جو اب چلتے ہوئے ریلنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ جوں ہی لڑکی کو سامنے ایک مرد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات بڑی تیزی سے ابھرے تھے۔ سرعت سے پیچھے ہٹتے ہوئے وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اور علی شیر کے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے موجود چھت پہ ویرانی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔

اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ جو اب تک کسی خواب کی سی کیفیت میں گم صم سا کھڑا تھا ' بے اختیار اک گہری سانس لیتا حقیقت میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پہ اس کا دکھ اور تناؤ دونوں ہی مکمل طور پہ غائب ہو چکے تھے۔

نرم نرم سا ایک عجیب احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ سرشار سا خود بھی نیچے اتر کر باہر پورچ میں موجود اپنی گاڑی کی جانب چلا آیا تھا۔ اسے گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ کے چوکیدار نے تیزی سے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا۔ اگلے ہی لمحے اس کی سیاہ چمکتی ہوئی کرولا سڑک کے کنارے رکی تھی۔

دروازہ کھول کے وہ پیچھے کھڑے چوکیدار کی حیران نگاہوں کی پرواہ کیے بنا سامنے موجود بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھا تھا۔ جس پہ لگی "فصیح الحسن" کے نام کی نیم پلیٹ کو بغور پڑھتا ہوا واپس اپنی گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ساڑھے بارہ بجے کے قریب آفس پہنچ کر علی شیر نے پہلا کام محمود کو فصیح الحسن نامی بندے کے متعلق پوری معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کہا تھا اور خود وہ اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق گارڈز اور ڈرائیور کے ہمراہ یونیورسٹی روانہ ہو گیا تھا۔

داور اور مغیث کو ہمراہ لیے وہ اک شان بے نیازی سے چلتا ہوا ڈی سی کے آفس میں چلا آیا تھا۔ جہاں تھوڑی دیر بیٹھنے اور ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ لینے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح صرف اپنی پارٹی کے بندوں کے ہمراہ یونیورسٹی کا چکر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

"سر! آج تو صبح سے آصف میر اور اس کے بندے نظر ہی نہیں آئے۔" اس کے برابر چلتے مغیث نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی شیر کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اچھا! تو پھر کیوں نہ چل کے اسے شرف ملاقات بخشا جائے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو اس کے ساتھ چلتے سب ہی لوگ مسکرا دیے۔

"چلیں سر!" وہ لڑکوں کی راہنمائی میں آڈیٹوریم کے پیچھے موجود پرانی کلاسز کی جانب چلا آیا تھا جہاں آصف میر اپنا ڈیرہ جمایا کرتا تھا۔ اسے اس طرف آتا دیکھ کے بہت سی حیران نگاہیں ان کی طرف اٹھی تھیں اور کئی قدم تیزی سے اندر بیٹھے افراد کو مطلع کرنے کی غرض سے بڑھے تھے۔ جس کے نتیجے میں اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آصف اپنے لڑکوں سمیت باہر آ کھڑا ہوا تھا۔

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں !

اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتا علی شیر اس کے قریب آ رکا تو آصف میر نے کاٹ دار انداز میں شعر پڑھا اور بظاہر مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھے اپنے گھر کے گیٹ پہ ریسیو کرنے آؤ گے ' لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم تو صبح سے گوشہ نشین ہو تو میں نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی مزاج پرسی کر آؤں۔" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے علی شیر نے بھی مسکرا کر اسے جتایا تو آصف میر کی مسکراہٹ سمٹ سی گئی۔ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات علی کو اندر تک مزا دے گئے تھے۔

"ویسے اب تک تو تمہیں اس سب کا عادی ہو جانا چاہیے۔" علی حظ اٹھانے والے انداز میں اس پہ زور دیتے ہوئے بولا تو آصف جلبلا کر بولا۔

"ہمارے ہاں تو طاقت اور پوزیشن کو ہمیشہ سے ہی سلام رہا ہے۔ تم لوگوں کے ڈر کو ان کا احترام سمجھنے کی غلطی مت کرو۔" علی نے گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"تم اپنے دل کو ان ہی طفل تسلیوں سے بہلاؤ' میں جب تک تمہارے گھر کے لیے کچھ کام کر لوں۔" وہ اک تمسخرانہ نظر اس پہ اور اس کے ساتھیوں پہ ڈالتا پیچھے پلٹا۔ ان کی صورتیں یک لخت اسے ایک نئی راہ سجھا گئی تھیں۔

"داور! تم کل ہی یونیورسٹی میں میری جانب سے ضرورت مند اسٹوڈنٹس کے لیے اسکالرشپس اناؤنس کرو۔ باقی کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ انہیں مکمل طور پہ نظر انداز کیے آگے بڑھ گیا تو پیچھے کھڑے آصف میر کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"الو کا پٹھا!" دانت پیستے ہوئے اس کی شرارے برساتی نظریں علی شیر کی چوڑی پشت پہ جمی تھیں۔

"میر! یہ تو بہت بڑا داؤ کھیل گیا ہے۔ پوری یونیورسٹی میں اس کے نام کے ڈنکے بج جائیں گے۔" اسد نے پریشانی سے آصف کا چہرہ دیکھا۔

"ڈنکے بجیں گے لیکن بدنامی کے' خود کو بڑی توپ چیز تصور کرتا ہے نا۔ اسے اب میں بتاؤں گا کہ سیاسی داؤ پیچ کہتے کسے ہیں۔" مٹھیاں بھینچے وہ منتقمانہ لہجے میں گویا ہوا تو اسد بے اختیار اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اس نئی مشکل کا کوئی حل سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت ہر شام کی طرح جمخانہ کے ٹینس کورٹ میں اپنے قریبی دوست محسن کے ساتھ تھا' گیم کھیلنے میں اس نے کبھی لاپروائی نہیں برتی تھی۔ جب ہی اس کی صحت قابل رشک اور جسم بے حد مضبوط تھا۔ اس پہ مستزاد اس کا چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' چوڑی پیشانی' ارادوں کی طرح اٹل کھڑی ناک اور مغرور آنکھیں' دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لیے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا کرتی تھیں۔ مگر وہ شان استغنا کے ساتھ آگے بڑھ جانے کا عادی رہا تھا۔ لیکن اس بار نجانے کیا ہوا تھا کہ باوجود آج کی بے تحاشا مصروفیت کے وہ خود کو کل رات کے سحر سے نکال نہیں پایا تھا۔

لاشعوری طور پہ اس لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ بے چینی سے محمود کی کال کا منتظر تھا' جب معاً "سائیڈ لائن" پہ کھڑے اس کے ملازم نے اس کا موبائل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے انتظار کی کوفت سے اسے نجات دلائی تھی۔

"ہاں بولو محمود!" وہ اپنی بے ترتیب سانس کے ساتھ ملازم کے ہاتھ سے تولیہ لیتا چیئر پہ آ کے گر سا گیا۔

"سر! فصیح الحسن مشہور کنسٹرکشن کمپنی "حسن بلڈرز" کے مالک ہیں۔ ان کے دو بھائی آرمی میں جبکہ ایک بھائی لندن میں ہوتے ہیں۔ بہن کوئی نہیں ہے۔ ایک بیٹی' علینہ اور ایک بیٹا عمر ہے۔ بیٹی ان کی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے جبکہ بیٹا ابھی انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا ہے۔ انکم ٹیکس اور بینک اکاؤنٹس کی ڈیٹیل میں صبح آفس۔"

"بیٹی کس یونیورسٹی میں پڑھتی ہے؟"

علینہ نام ذہن میں دہراتے ہوئے اسے ٹوک دیا تو تیزی سے تفصیل سناتا محمود ایک پل کے لیے رک گیا۔ معاملے کی نوعیت اسے اب سمجھ میں آئی تھی جبکہ اس نے تو فصیح الحسن کی فیملی کے متعلق سرسری اور آفیشل انفارمیشن ڈیٹیل میں اکٹھی کی تھی۔

"سر! یہ تو میں نے نہیں پتا کروایا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا تو علی شیر کے چہرے پہ بے زاری چھا گئی۔ لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ محمود کی اس میں کوئی غلطی نہ تھی۔ اس لیے وہ اس پہ بگڑنے کے بجائے تحمل سے بولا۔

"دائس اوکے۔"

"سر! کل تک آپ کو اس کے بارے میں پوری انفارمیشن مل جائے گی۔"

وہ اگلے ہی پل مستعدی سے بولا تو علی شیر نے ہاتھ میں پکڑا تولیہ کوفت سے میز پہ پھینک دیا۔ اس کی اس حرکت پہ اس کے برابر کرسی سنبھالتے محسن نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا موڈ چند لمحے پیشتر کے برعکس خاصا آف لگ رہا تھا۔

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" نجانے کیوں اسے یکایک اپنی اس درجہ اضطرابی کیفیت سے ہی الجھن ہونے لگی تھی۔ آخر وہ اتنا مضطرب کیوں ہو رہا تھا؟

"اب ایسی بھی کوئی دنیا سے ماورا چیز نہیں تھی۔" کسی نے اسے سختی سے باور کروایا تو وہ کل رات کی اپنی اس کیفیت کو پیچھے دھکیلتا ایک بار پھر وہی علی شیر یاران بننے کی کوشش کرنے لگا جس نے ہمیشہ اپنے لیے دلوں کو فرش راہ ہوتے دیکھا تھا۔ اور جو خود سے صنف مخالف پہ نگاہ غلط ڈالنا بھی اپنی توہین تصور کرتا تھا۔

"جیسے آپ کہیں۔" اس کے جواب پہ محمود فقط اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"اور سر! فصیح الحسن کے متعلق انفارمیشن؟"

"اسے بھی رہنے دو۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں بولا تو حیران سا محمود ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔ کہاں تو وہ صبح تک ساری معلومات فوری اکٹھی کرنے کے لیے کہہ رہا تھا اور کہاں اب سرے سے ہی منع کر رہا تھا۔

"اوکے سر!" تابع داری سے کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر ڈالا تو علی نے بھی ہاتھ میں پکڑا فون بے دلی سے میز پہ ڈال دیا۔ یہ اچانک اسے ہوا کیا تھا وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں علی شیر یاران کی جانب سے تشہیر ہونے والی اسکالرشپس کا چرچا پوری یونیورسٹی میں ہونے لگا تھا۔ اس کی ذات یکایک ان اسٹوڈنٹس کے درمیان بھی مشہور ہو گئی تھی۔ جو یونیورسٹی صرف پڑھائی کی غرض سے آتے تھے اور جن کا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ایسے میں آصف میر اور اس کے کارکنوں کی جھنجلاہٹ اور غصہ کافی حد تک بڑھ گیا تھا' جس کی وجہ سے یونیورسٹی کے ماحول میں پچھلے کچھ دنوں سے خاصی کشیدگی در آئی تھی۔

چھوٹی سی بات بھی ایک بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی تھی اور آج کیفے ٹیریا میں یہی ہوا تھا۔ جب ایک معمولی سی بات پہ دونوں پارٹیوں کے بندوں نے دست و گریباں ہونے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ ایسے میں کس نے فائرنگ شروع کی اور کس نے پتھر اٹھایا۔ کچھ پتا نہیں چلا تھا' ہاں لیکن برپا ہونے والے ہنگامے نے اسٹوڈنٹس کو ہراساں ہو کے بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"آپ لوگ سامنے سے نہیں' لائبریری کی طرف سے نکلیں۔ باہر پتھراؤ ہو رہا ہے۔" وہ ساری کلاس فیلوز بھاگتے ہوئے ڈپارٹمنٹ کے مین دروازے کی جانب جا رہی تھیں جب دوسری جانب سے چند لڑکے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

ان کی بات پہ روہانسی ہوتی وہ سب ڈپارٹمنٹ کے پچھلے دروازے کی جانب لپکی تھیں جو لائبریری کی طرف کھلتا تھا۔

مگر باہر نکل کے انہیں احساس ہوا تھا کہ ان برستے پتھروں میں گیٹ تک پہنچنا تو دور وہ لائبریری کا وسیع و عریض لان ہی عبور کر لیتیں تو بڑی بات تھی۔

"یا اللہ ہم کیا کریں؟" روہانسی ہوتی ناجیہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تو سب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

بے بسی کی تصویر بنی وہ سب اپنے ڈپارٹمنٹ کے پچھلے برآمدے میں کھڑی دور برپا حشر کو متفکر نگاہوں سے دیکھتی ہول رہی تھیں۔ جب فضا میں سائرن کی آوازیں گونجتی سنائی دی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ارد گرد برستے پتھر جیسے تھم سے گئے تھے۔ لیکن بھاگتے قدموں میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔

”چلو جلدی نکلو۔“ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ان چاروں نے بھی باقی لڑکیوں کے ساتھ سامنے کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ لائبریری کا لان عبور کر کے وہ سب اب مین گراؤنڈ کے اردگرد بنی چوڑی سی سڑک پہ آ پہنچی تھیں‘ جس کے انتہائی سرے پہ واقع پارکنگ لاٹ سے متصل گیٹ کے اردگرد بے پناہ رش کے درمیان پولیس موبائلز دور سے ہی کھڑی نظر آ رہی تھیں۔

لوگوں کے درمیان بمشکل جگہ بناتے ہوئے وہ تیز قدموں سے ڈی سی کے آفس تک پہنچی ہی تھیں کہ نجانے کہاں سے ایک پتھر اڑتا ہوا آ کر علینہ کے سر پہ لگا تھا اور وہ ”سی“ کی آواز کے ساتھ بے اختیار سر تھام کے نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

”علینہ!“ ملیحہ کی چیخ پہ نہ صرف وہ تینوں بلکہ اردگرد موجود لوگ اور ڈی سی کے ساتھ آفس سے نکلتے علی شیر نے بھی چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ جہاں زمین پہ ایک لڑکی کو سر پکڑے بیٹھا دیکھ کر وہ تیزی سے سامنے کی تین چار سیڑھیاں عبور کرتا نیچے اترا تھا۔

اسے آتا دیکھ کر سب ہی از خود اس کے راستے سے پیچھے ہٹے تھے۔

”ایکسکیوزمی مس! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ زخمی لڑکی کے پاس پہنچنے پہ اس نے متفکر نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا‘ جس کی سہیلیاں اسے تھامے بیٹھی تھیں۔

”پ‘ پانی۔“ وہ بمشکل تمام بولی تو علی شیر نے پلٹ کر با آواز بلند کسی کو آفس سے پانی لانے کے لیے کہا تھا۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے ملیحہ نے اس کا چہرہ اونچا کیا تھا اور علی شیر بری طرح چونک گیا تھا۔ زرد چہرے اور بہتے اشکوں کے ساتھ زمین پہ نڈھال گری لڑکی‘ علینہ فصیح ہو گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

”اس کے سر سے تو خون بہہ رہا ہے۔“ اس کا سر اپنے بازو پہ ٹکائے بیٹھی ثمین نے اس کے بالوں کو گیلا محسوس کرتے ہوئے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو اس کی انگلیوں پہ خون لگ گیا۔

”او گاڈ!“ ثمین کی بات پہ ناجیہ بے اختیار رو پڑی تھی جبکہ علی شیر نے تیزی سے جیب میں پڑا موبائل نکالتے ہوئے نمبر ملایا۔

”گاڑی کہاں ہے؟“ چھوٹتے ساتھ ہی اس نے دوسری طرف موجود بندے سے استفسار کیا۔

”گاڑی ڈی سی کے دفتر کے جتنا ہو سکے قریب لے آؤ۔ کسی کو ہاسپٹل لے کے جانا ہے۔“ اس نے ڈرائیور کو ہدایت دیتے ہوئے فون بند کیا۔

”آپ لوگ پریشان مت ہوں‘ ہم ابھی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔“ وہ ان تینوں کو تسلی دیتے ہوئے بولا تو ثمین نے الجھ کر سامنے بیٹھی ملیحہ کی جانب دیکھا۔

”لیکن آپ ہیں کون؟“ ثمین نے ملیحہ کے چہرے سے نگاہیں اٹھاتے ہوئے سامنے کھڑے اجنبی کی طرف دیکھا۔

”علی شیر باران۔“ اور ان تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ مگر چونکہ فی الحال اور کوئی راستہ نہ تھا اور نہ ہی علینہ کا خون رکنے کا نام لے رہا تھا۔ اس لیے وہ تینوں آنکھیں بند کیے پڑی علینہ کو بمشکل سنبھالتی اس کی لینڈ کروزر تک چلی آئی تھیں۔ جو اس رش میں یہاں تک کیسے پہنچی تھی‘ وہ حیران تھیں۔ جبکہ پیچھے کھڑی اوپن جیپ میں اسلحے سے لیس باوردی گارڈز کو دیکھ کے وہ گھبرا گئی تھیں۔

”آپ مجھ پہ ٹرسٹ کر سکتی ہیں۔“ ان کے چہروں پہ بکھرے تذبذب کو دیکھتے ہوئے علی شیر نے رسان سے کہا تو وہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ اس کے پیسنجر سیٹ پہ بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی تھی اور سامنے موجود لوگ راستے سے یوں ہٹے تھے گویا کسی شہزادے کی سواری کے آگے سے رعایا ہٹتی ہے۔ بے اختیار ان تینوں کی نظریں ایک دوسرے کی جانب اٹھی تھیں۔

”شہزادہ جان عالم نے یہ مہربانی ان پہ کیوں کی تھی؟“ ہول کر سوچتے ہوئے ثمین نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”تمہیں علی شیر باران ہاسپٹل لے کے گیا تھا؟“ سب کے کمرے سے نکلتے ہی اسد نے سرد نگاہوں سے بیڈ پہ تکیوں کے سہارے نیم دراز علینہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنی فیملی کے ساتھ اس کی عیادت کے لیے ان کے گھر آیا ہوا تھا۔ اس کے سر میں چھ ٹانکے آئے تھے۔

ثمین نے اسپتال پہنچتے ہی فصیح صاحب کو فون کر کے فوراً پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ اس دوران سارا ٹریٹمنٹ علی شیر نے خود اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ جس پہ فصیح الحسن اس کے بے حد شکر گزار ہوئے تھے۔

اسپتال سے فراغت کے بعد وہ ان چاروں کو لیے گھر چلے آئے تھے جہاں علینہ تو دواؤں کے زیر اثر سو گئی تھی۔ لیکن وہ تینوں اس کے کمرے میں بیٹھی دیر تک آج کے واقعے اور علی شیر باران کو ڈسکس کرتی رہی تھیں۔ وہ حقیقتاً ”اتنا خدا ترس تھا یا ہمارے ہاں کے اسی فیصد مردوں کی طرح اس کی رحم دلی محض لڑکیوں کو دیکھ کر جاگی تھی“ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔

بہرحال شام کی چائے سے فراغت کے بعد وہ تینوں ڈرائیور کے ہمراہ اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئی تھیں۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اکبر اعوان اپنی پوری فیملی کے ساتھ چلے آئے تھے۔ علینہ کے زخمی ہونے کی خبر انہیں اسد نے دی تھی‘ جس کے علم میں خود یہ ساری بات چار بجے کے قریب اپنے ایک دوست کے ذریعے آئی تھی اور وہ تب سے لے کر اب تک اپنا ڈھیروں خون جلا چکا تھا۔

”جی۔“ اس کے چہرے پہ چھائی ناراضی کو تکتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی تو وہ کاؤچ پہ مکا مارتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم مر رہی تھیں کیا جو صبر نہیں کر سکتی تھیں؟“

”اسد!“ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”میں‘ میں خود تو نہیں گئی تھی۔ بلکہ ثمین بتا رہی تھی کہ وہ لوگ بھی یوں ایک انجان آدمی کے ساتھ کبھی نہ جاتیں اگر جو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔“

”حالات ہمیشہ کے لیے تو خراب نہیں ہوئے تھے‘ تھوڑی دیر میں سنبھل ہی جاتے۔ تم اکیلی تو زخمی نہیں ہوئی تھیں ناں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کی پروا کیے بنا اسی لہجے میں اسے گھورتے ہوئے بولا تو آنسو بے اختیار اس کے گالوں پہ پھسل آئے۔

”پوری پارٹی کے سامنے تم نے مجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اور میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پوری یونیورسٹی میں اسے صرف تم ملی تھیں مدد کرنے کے لیے؟ باقی زخمی اس الو کے پٹھے کو کیوں نظر نہیں آئے؟“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا تو علینہ کا ضبط بھی جیسے جواب دے گیا۔

”یہ آپ مجھ سے پوچھنے کے بجائے الو کے پٹھے سے کیوں نہیں پوچھتے؟“

”شٹ اپ! پتا بھی ہے کس قدر کرپٹ آدمی ہے وہ؟“ وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے کیریکٹر کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ بحالت مجبوری لے جائی گئی تھی۔ اگر اتنی ہی پروا تھی میری تو جب ہنگامہ شروع ہوا تھا تو آپ سب سے پہلے مجھے وہاں سے نکالنے کی کرتے‘ مگر آپ نے میری مدد تو دور مجھے ایک فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کیا میں آپ کی ذمہ داری نہیں تھی؟“

فہمائشی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے وہ سخت لہجے میں بولی تو مقابل کھڑا اسد شرمندہ سا ہو گیا۔

”میں نے آپ کی ہر غلطی کو ہمیشہ اگنور اور ہر مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اسد! پھر آج آپ کیوں میری مجبوری کو انڈر اسٹینڈ نہیں کر رہے؟ کیوں نہیں یہ سمجھ رہے کہ آج جو کچھ بھی ہوا‘ وہ محض ایک اتفاق تھا۔ جس کی وجہ سے آپ کو کسی کے سامنے شرمندہ یا جوابدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں دھیما پڑ گیا تو اسد اک گہری

سانس لیتا بیڈ کی پائنتی کے پاس بیٹھ گیا۔
"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے اس بارے میں اتنا اگریسیو ہو کے نہیں سوچنا چاہیے۔ رہی بات یونیورسٹی کی تو میں اس وقت میر کے ساتھ۔۔۔"
نرم لہجے میں بولتا وہ ہمیشہ کی طرح اپنے مسئلے' اپنی توجیہات بیان کرنے لگا تھا اور سر جھکائے افسردہ سی علینہ یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی کہ اسد اعوان کی ترجیحات کی فہرست میں اس کا نام کب اول نمبر پہ آئے گا؟

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ سو کے اٹھی تو سر میں درد خاصا کم تھا۔ رات بھر جو حرارت رہی تھی وہ بھی اس وقت نہیں تھی۔ گھڑی پہ نگاہ ڈالتے وہ آہستگی سے اٹھ کے باتھ روم کی جانب چل دی تھی۔
منہ ہاتھ دھو کے وہ باہر آئی تو صوفیہ بیگم بیڈ شیٹ ٹھیک کر رہی تھیں۔
"میں تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔ کیسی طبیعت ہے؟" وہ ہاتھ میں پکڑا تکیہ جگہ پہ رکھتی اس کے قریب چلی آئیں۔ "شکر ہے بخار تو اترا۔" اس کی پیشانی چھوتے ہوئے انہوں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔
"زخم میں درد تو نہیں؟" انہوں نے متفکر نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تو علینہ ان کے خود ہی سوال جواب کرنے پہ مسکرا دی تھی۔
اس کی ماں کل سے کتنی پریشان تھیں وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ رات بھی وہ اس کے پاس سوئی تھیں۔ اور ذرا سی آہٹ پہ دس بار اٹھ کے بیٹھی تھیں۔ جبکہ اگلے نے کتنے آرام سے اسے مرنے کا طعنہ دے دیا تھا۔
"نہیں اور اب آپ بھی پریشان مت ہوں' میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" وہ بے اختیار ان کا ہاتھ تھام گئی تو صوفیہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔
لوشن ہاتھ پہ ڈالے وہ چہرے پہ لگاتی آئینہ میں اپنے سر پہ بندھی پٹی کو دیکھ رہی تھی جب سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بجنے لگا۔
آگے بڑھ کے اس نے موبائل اٹھاتے ہوئے اسکرین پہ نگاہ ڈالی تھی۔ جہاں ایک انجانا نمبر جگمگا رہا تھا۔
"ہیلو۔" کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔
"علینہ فصیح بات کر رہی ہیں؟" دوسری جانب سے ایک بھاری انجانا لہجہ ابھرا تو علینہ کے چہرے پر الجھن در آئی۔
"جی' لیکن آپ کون؟"
"میں علی شیر یاران بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے اپنا تعارف کروایا گیا تو علینہ اپنی جگہ پہ گم سی گئی۔
"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس کی کیفیت سے بے نیاز مقابل نے انتہائی نارمل لہجے میں استفسار کیا تو ایک لمحے کے لیے علینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ہے۔
"جی ٹھیک ہے' لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا؟" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بظاہر اعتماد سے پوچھا۔ ذہن میں یک لخت ہی اسد کی باتیں گھومنے لگی تھیں۔
"آپ کی فرینڈ سے لیا تھا۔" نجانے کیوں علینہ کو اس کی آواز مسکراتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
"میری فرینڈ؟" بے یقینی اس کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ لہجے میں بھی در آئی تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ تینوں یہ حرکت کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ لیکن پھر اس شخص کے پاس نمبر آیا کہاں سے تھا؟
"کیوں آپ کو میرا فون کرنا اچھا نہیں لگا؟" وہ اسی نارمل لہجے میں بولا تو علینہ اک گہری سانس لیتی ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولی۔
"مجھے کسی بھی اجنبی کا فون کرنا اچھا نہیں لگتا۔"
"لیکن ہم اجنبی تو نہیں۔" اس کے انداز میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔
"اگر آپ کی مراد کل کے واقعہ سے ہے تو وہ محض

ایک اتفاق تھا۔ آپ مجھے زخمی حالت میں ازراہ ہمدردی ہسپتال لے گئے جس کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔ اس سے زیادہ نہ آپ میرے بارے میں جانتے ہیں اور نہ میں آپ کے تو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی کہلائیں گے۔"
وہ شائستگی لیکن قدرے سختی سے گویا ہوئی۔
"لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ اور کافی پہلے سے جانتا ہوں تو؟"
"تو معذرت کے ساتھ میں یہ کہوں گی کہ آپ کو غیر لڑکیوں کے بارے میں انفارمیشن اکٹھی کرتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔" وہ اس کا احسان ایک طرف رکھتے ہوئے غصے سے بولی تو علی شیر بے اختیار ہنس دیا۔
"مجھے آپ سے اسی جواب کی امید تھی۔ انی وے اپنا خیال رکھیے گا' اللہ حافظ!" نرمی سے کہتا وہ فون بند کر گیا تو ساکت علینہ اس عجیب و غریب کال پہ حیران پریشان ہوتی بیڈ پہ بیٹھ گئی۔
وہ بندہ اس کے بارے میں بہت کچھ اور کافی عرصے سے جانتا تھا؟
"یا اللہ! یہ کیا نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی پیشانی مسلی۔
"اور اگر جو اس نے یہی بکواس اسد سے کر دی تو؟" اور اس "تو" کے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ اسے تو اب کل کا اتفاق بھی اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ واقعی کل اسے صرف ایک وہی ملی تھی ہسپتال لے جانے کو اور بھی تو کتنے لڑکے لڑکیاں زخمی ہوئے تھے۔ وہ باقیوں کو کیوں نہ اپنی گاڑی میں ہسپتال لے گیا؟
یکایک اسے اسد کی بات صحیح لگنے لگی تھی۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ اگر اس نے دوبارہ رابطہ کیا تو اس نئی مشکل سے وہ کیسے نبٹے گی؟

☼ ☼ ☼

ہونٹوں پہ محظوظ مسکراہٹ لیے علی شیر نے فون بند کرتے ہوئے چند لمحے پہلے علینہ فصیح سے ہوئی گفتگو کو ذہن میں دہرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔
اس میں کوئی شک نہ تھا کہ علینہ فصیح اس کے اردگرد موجود ڈھیروں لڑکیوں میں منفرد تھی۔ جس کی ایک اپنی باوقار اور الگ شخصیت تھی اور علی شیر یاران جیسے شان دار اور مختلف بندے کو اچھوتی اور منفرد چیزیں ہمیشہ سے ہی بے حد متاثر کیا کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا تمہیں علی شیر یاران نے فون کیا تھا؟" وہ تینوں اس کا حال معلوم کرنے علینہ کی طرف آئی ہوئی تھیں' جب اس نے انہیں گزشتہ روز آنے والی علی شیر کی کال کے متعلق بتاتے ہوئے ابھی بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ حیرت زدہ سی ثمین بے اختیار چلا اٹھی تھی۔
"مگر اس کے پاس تمہارا نمبر آیا کہاں سے؟" ملیحہ کے تاثرات بھی کم و بیش ثمین جیسے ہی تھے۔ حیرت اور پریشانی میں ڈوبے۔ جبکہ ناجیہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ لبوں سے لگانا بھول گئی تھی۔
"بقول اس کے اس نے میرا نمبر میری فرینڈ سے لیا تھا۔" علینہ نے انہیں دیکھتے ہوئے مطلع کیا تو تینوں اچھل ہی پڑیں۔
"تم نے کیا ہمیں اتنا بے وقوف اور غیر ذمہ دار سمجھ رکھا ہے کہ ہم تمہارا نمبر ہر ایرے غیرے کو تھماتے پھریں گے؟" ثمین جلبلا کر بولی تو علینہ بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔
"مجھے پتا ہے یار! کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ اور کافی عرصے سے جانتا ہے۔"
"کیا؟" اس نئی اطلاع نے تو صحیح معنوں میں ان تینوں کی سٹی گم کر دی تھی۔
"مجھے تو سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے کہ وہ میرے بارے میں کیوں اور کس لیے انفارمیشن اکٹھی

کرتا پھر رہا ہے؟ جبکہ میں نے تو اسے صحیح سے دیکھا تک نہیں۔"

"ویسے دیکھ لیتیں تو اتنا ملال نہیں ہوتا۔" یک لخت ناجیہ کی زبان میں کھجلی ہوئی تو تینوں بے ساختہ ہی مسکرا دیں۔

"بکو مت!" ملیحہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے گھورا تو ناجیہ ہاتھ میں پکڑا کپ نیچے رکھتے ہوئے جوش سے بولی۔

"قسم سے علینہ! میں نے اتنا ہینڈسم بندہ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اوپر سے کیا شان، کیا انداز ہے اس کا۔ پورا ہاسپٹل کا اسٹاف اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا اور وہ تھا کہ کسی کو لفٹ ہی نہیں کروا رہا تھا۔"

"یہی بالکل یہی بات میں نے بھی گاڑی میں بیٹھتے ساتھ ہی محسوس کی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس جیسے شخص نے ہماری مدد کیوں کی تھی؟ واپس آکر بھی ہم نے اس کی ہمدردی کو ڈسکس کیا تھا، مگر وجہ نہیں سمجھ سکے تھے۔" ثمین نے پریشانی سے کہا۔ تو علینہ کی الجھن دوچند ہو گئی۔

"یہ کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں میں۔ پتا ہے اسد کہہ رہے تھے کہ انتہائی کرپٹ آدمی ہے وہ۔"

"اللہ رحم کرے۔ ویسے تم نے اس بات کا اسد سے ذکر کیا؟" ملیحہ نے اس کی جانب پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! وہ تو پہلے ہی اتنا ناراض ہو رہے تھے کہ ہم اس کے ساتھ ہسپتال کیوں گئے۔" وہ متفکر لہجے میں بولی تو ثمین خفگی سے گویا ہوئی۔

"نہیں خیر یہ بات تو وہ غلط کہہ رہا ہے۔ ہم کوئی خوشی سے اس کے ساتھ تھوڑا ہی گئے تھے۔ اگر ہمارے پاس کوئی اور آپشن ہوتا تو ہم بھلا کیوں ایک اجنبی کا احسان لیتے۔"

"صحیح کہہ رہی ہے ثمین۔ اس وقت تمہاری جو حالت تھی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے تمہارا خون دیکھ کے۔" ناجیہ نے یاد کرتے ہوئے بے اختیار جھرجھری لی۔ تو علینہ اک بوجھل سانس لے کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں اگلے دو دن یونیورسٹی بند رہی تھی۔ تمام آفیشلز نے سیاست کے نام پہ آئے دن ہونے والے ان جھگڑوں اور تعلیم کو پہنچنے والے نقصان کے خلاف وائس چانسلر کو سخت ایکشن لینے کے لیے کہا تھا اور یوں وہ دونوں پارٹیوں کے اہم کارکنوں کو اپنے آفس میں بلانے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

"ایکسکیوزمی سر! اگر علی شیر اس معاملے میں اتنے ہی حساس ہو رہے ہیں تو انہوں نے خود یہاں آنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟" آصف میر نے طنزیہ نظروں سے وی سی کو دیکھتے ہوئے ٹوک دیا۔

"اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی ہماری کارروائی پہ کسی بھی طرح سے اثر انداز ہو۔" وی سی نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ان کا جواب داور اور مغیث کے لبوں پہ محظوظ سی مسکراہٹ بکھیر گیا تھا، جسے اسد اعوان نے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"یعنی آپ مانتے ہیں کہ ان کی موجودگی آپ کے فیصلوں پہ اثر انداز ہوتی ہے؟" آصف میر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تو وی سی اپنی جگہ پہ جزبز ہوتے ایک نظر ٹیبل کے دوسری جانب بیٹھے آصف کو محض دیکھ کر رہ گئے۔ جس کے لبوں پہ کھیلتی طنزیہ مسکراہٹ انہیں سلگا گئی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی اسے کچھ زیادہ نہ کہہ سکتے تھے۔

اسے جن ہستیوں کی پشت پناہی حاصل تھی وہ کوئی معمولی لوگ نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یونیورسٹی سے کتنے سال پہلے پاس آؤٹ ہو جانے کے بعد بھی یہاں نہ صرف دندناتا پھرتا تھا بلکہ انتہائی سکون سے یہاں بیٹھ کر اپنی پارٹی کا یوتھ ونگ بھی چلا رہا تھا۔

"اثر انداز تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ ورنہ جو تماشا آپ لوگوں نے یونیورسٹی میں لگا رکھا ہے اس کے بعد تو اصولاً آپ لوگوں کو میرے آفس میں نہیں بلکہ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر ہونا چاہیے۔" انہوں نے ایک جتاتی نظر آصف کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے باقی تینوں لڑکوں کو بھی فہمائشی نظروں سے دیکھا۔

"سر! دو دن پہلے جو کچھ بھی ہوا اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ ان فیکٹ ہم تو پچھلے کتنے ہی دنوں سے باران صاحب کی جانب سے اناؤنس ہونے والی اسکالرشپ کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ لیکن جس دن سے اسکالرشپس کی اناؤنسمنٹ ہوئی ہے اس روز سے ہی یہ لوگ نہ صرف لڑائی کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں بلکہ ان کی پوری کوشش ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ رک جائے۔" داور نے مقابل بیٹھے وی سی کی جانب دیکھتے ہوئے صفائی دی۔

"ہونہہ! ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کے کسی سلسلے میں رکاوٹیں کھڑی کریں۔ یہ لوگ اب خود اپنے اس ڈرامے کو ختم کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" آصف نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے کندھے اچکائے تو داور نے ایک جھٹکے سے رخ موڑتے ہوئے خود سے ذرا فاصلے پہ کرسی سنبھالے بیٹھے آصف پہ ایک سلگتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

"ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا کہ کون کیا کر رہا ہے اور کیا نہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ لوگوں کی عداوت کی وجہ سے ہمارے ادارے کا نہ صرف نام بدنام ہو رہا ہے بلکہ طلبہ کا قیمتی وقت بھی برباد ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے نہ صرف یونیورسٹی کی املاک کو نقصان پہنچا بلکہ کتنے ہی طلبہ زخمی بھی ہوئے۔ خدانخواستہ اس روز اگر کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تو آپ بتائیں ہم ان کے والدین کو کیا جواب دیتے؟"

وی سی نے غصے سے ٹیبل پہ ہاتھ مارتے ہوئے ان کو گھورا تو بے اختیار وہ نظریں چرا گئے۔

"ہماری برداشت اب جواب دے گئی ہے۔ اور یہ ہم سب کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ اگر آپ لوگوں نے اپنے رویے تبدیل نہ کیے تو ہم سب مل کر آپ کے خلاف ایکشن لیں گے پھر چاہے ہمیں اپنی کرسیوں سے کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑ جائیں!" انگلی اٹھائے انہوں نے انتہائی سخت لہجے میں انہیں وارن کیا۔

"سر! ہماری طرف سے آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن آپ پلیز ان لوگوں سے کہیں کہ یہ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

مغیث نے بنا آصف اور اسد کی طرف دیکھے ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کیا تو وی سی کی غصیلی نگاہیں بے اختیار آصف میر کی جانب اٹھ گئیں۔

"آپ لوگوں کو یہ میری لاسٹ وارننگ ہے۔ ورنہ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ لوگوں کی سرگرمیوں کو یونیورسٹی سے باہر تک محدود کرنا پڑے گا۔" ان کی بات جہاں کمرے میں موجود ہر فرد کو حیران کر گئی تھی وہیں آصف میر کا چہرہ بھی تیزی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"بہت بڑی بات کہہ گئے ہیں آپ۔" ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا تو وی سی صاحب اثبات میں سر ہلا گئے۔

"میں جانتا ہوں۔ اور میری یہ وارننگ صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اب ہمارے فیصلے سے روگردانی کرے گا۔" وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے واضح الفاظ میں بولے تو چند لمحے بغور ان کی جانب دیکھنے کے بعد آصف جب بولا تو حیران کن طور پہ اس کا لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے! آپ کو ہماری طرف سے بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن اپنی اس وارننگ پہ اب آپ قائم رہیے گا۔"

آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا اسد اعوان بھی اٹھ گیا۔ جبکہ مغیث اور داور نے بے اختیار ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

ناجیہ کی بڑی بہن کی منگنی تھی۔ فنکشن شہر کے بہترین ہوٹلوں میں سے ایک میں ارینج کیا گیا تھا۔ وہ تینوں بھی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ مدعو تھیں۔

علینہ شیفون کی آف وائٹ لانگ شرٹ ' جس کے بازوؤں اور گلے پہ موتیوں اور نگینوں کا بے حد نفیس کام بنا ہوا تھا ' کے ساتھ آف وائٹ ' سلک کا پاجامہ پہنے ' کانوں میں کندن کے آویزے ڈالے اپنے ڈرائی کیے بالوں اور مناسب میک اپ کے ساتھ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ چونکہ ان چاروں سہیلیوں کی فیملیز کا بھی آپس میں ملنا جلنا تھا اس لیے فنکشن میں وہ تینوں ہر جگہ ناجیہ کے ساتھ پیش پیش تھیں۔

رسم سے پہلے انیقہ کو فوٹو سیشن کے لیے ہال سے ذرا آگے موجود کمرے میں بلوایا گیا تو ناجیہ کو اپنے پاپا کے ساتھ مصروف گفتگو دیکھ کے ثمین اور علینہ اسے تھام کر متعلقہ کمرے تک لے آئیں ' جہاں اس کی نندیں اور منگیتر پہلے سے موجود تھے۔

"علینہ! پلیز ذرا امی کو بلا لاؤ۔" وہ اسے کاؤچ پر بٹھا کر پلٹنے کو تھی جب انیقہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتی وہ ثمین کو اس کے پاس ٹھہرنے کے لیے کہہ کر خود کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ مگر سامنے سے آتی ناجیہ اور اس کی امی کو دیکھ کے وہ اپنی جگہ پہ رک گئی تھی۔ تب ہی وسیع و عریض لابی کے دوسری جانب موجود سیڑھیوں سے اپنے دوستوں کے ساتھ اترتے علی شیر کی نظریں اس کے روشنیاں چھلکاتے وجود پہ پڑی تھیں اور وہ اپنا اگلا قدم اٹھانا بھول گیا۔

سر سے پاؤں تک سجی سنوری وہ اپنی پچھلی دو ملاقاتوں کے برعکس بے حد مختلف اور بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ کھلے بالوں کے درمیان اس کا چاند کی طرح دمکتا چہرہ چند لمحوں کے لیے علی شیر کو جیسے مبہوت کر گیا تھا۔

"کیا ہوا یار!" اس کے یوں یک لخت رک جانے پہ اس کے دوستوں نے پلٹ کے اس کی جانب دیکھا تھا ' جو ان سے کئی سیڑھیاں اوپر کھڑا تھا۔

"ہوں۔۔۔" اپنے دھیان سے چونکتے ہوئے اس نے ایک لحظے کو اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر نگاہیں سامنے موجود چمکتے ہوئے وجود پہ جمائی تھیں ' جو اب پلٹ کر دو خواتین کے ساتھ آگے کو چل دی تھی۔

"کچھ نہیں۔" دھیرے سے کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے زینہ عبور کر تا ان کے ہم قدم ہو گیا تھا۔ مگر اس کا دھیان چاہ کر بھی علینہ فصیح سے ہٹ نہ سکا تھا۔ جس کا ہر روپ منفرد اور بے حد غضب کا تھا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً" ساڑھے بارہ بجے کے قریب علینہ ' صوفیہ بیگم اور فصیح صاحب کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر لاؤنج میں بیٹھ کر تقریب کے بارے میں بات کرنے کے بعد وہ تینوں اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے تھے۔

دروازہ بند کر کے علینہ پیروں کو سینڈلز سے آزاد کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔ ہاتھ میں پکڑا پرس ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنا جائزہ لینے کے بعد جیولری اتارنی شروع کی تھی۔ جب معا" اس کے پرس میں رکھا موبائل بجنے لگا تھا۔

اپنے دھیان میں پرس کھول کے موبائل نکالتے ہوئے اس نے بنا نمبر دیکھے فون کان سے لگاتے ہوئے جونہی "ہیلو" کہا دوسری جانب سے آتی بھاری گمبھیر آواز اس کی دھڑکن تیز کر گئی تھی۔

"ہیلو علینہ صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟" ہیلو کو قدرے کھینچ کر ادا کرتے ہوئے وہ خاصے شگفتہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" وہ اسے کسی طور پر تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔ جب ہی اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے اس نے سپاٹ سا لہجہ اختیار کیا تھا۔

"اول تو میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن پھر بھی اگر آپ انجان بننے پہ تلی ہوئی ہیں تو کوئی بات نہیں۔۔۔ علی شیر یاران بات کر رہا ہوں۔" وہ محظوظ سے لہجے میں بولا تو اس درجہ گھمنڈ علینہ کی پیشانی شکن آلود کر گیا۔

"آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ کوئی آپ کو بھلا نہیں سکتا؟" وہ چاہ کر بھی اپنے لہجے میں در آنے والی تلخی کو چھپا نہ سکی۔ مگر دوسری جانب بھی شاید بلا کا خود پسند شخص تھا۔ جب ہی وہ اس کی بات کا برا مانے بغیر انتہائی سکون سے گویا ہوا تھا۔

"اس لیے کہ علی شیر یاران کو بھلانا اتنا آسان نہیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں کسی علی شیر یاران کو نہیں جانتی تو؟" وہ دبدبو بولی تھی۔

"تو میں یہ کہوں گا کہ جھوٹ آپ جیسی صوم و صلوٰۃ کی پابند لڑکی پہ جچتا نہیں ہے۔" وہ اس کی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مزے سے بولا تو دوسری طرف اس کی توقع کے عین مطابق چند پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"ڈر گئی ہیں یا یہ سوچ رہی ہیں کہ میں آپ کے بارے میں یہ سب کیسے جانتا ہوں؟" اس نے مسکرا کر سوال کیا تو علینہ اس کے درست اندازوں پہ کھولتی غصے سے بولی۔

"نہ تو میں ڈری ہوں اور نہ ہی حیران ہوں بلکہ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ جیسے وحشت انسان سے اپنا پیچھا کیسے چھڑاؤں؟"

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ نہیں سوچ رہی تھیں۔" وہ ایک بار پھر اس کی بات کا برا مانے بغیر نارمل لہجے میں بولا۔

"دیکھیں علی شیر صاحب! میں غیر مردوں سے باتیں یا ان سے دوستی کرنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ اس لیے پلیز میری آپ سے ریکویسٹ ہے کہ آپ مجھے پریشان مت کریں۔" گہری سانس لیتے ہوئے اس نے قصدا" نرمی سے کہا۔

"میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ آپ کوئی عام لڑکی نہیں مس علینہ! جب ہی تو میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کی جانب خود پیش رفت کی ہے۔" وہ اس کی استدعا کو نظر انداز کیے بنا کسی ہچکچاہٹ کے اپنا مدعا واضح الفاظ میں بیان کرتا ہوا بولا تو علینہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"آپ ہوتے کون ہیں میری طرف پیش رفت کرنے والے؟ اور کیا سوچ کر آپ نے مجھے اتنے زعم سے یہ اطلاع دی ہے؟ آپ کوئی اونچی چیز ہوں گے تو اپنے گھر میں۔ میں آپ جیسے کرپٹ لوگوں سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ دوبارہ مجھے فون کرنے کی غلطی مت کیجیے گا۔" اس کی آواز بے اختیار ہی اونچی ہو گئی تھی۔

"اور دوبارہ آپ بھی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی غلطی مت کیجیے گا!"

وہ یک لخت انتہائی سرد لہجے میں بولا تو علینہ کی شعلے برساتی زبان تالو سے لگ گئی۔ اس کی حیثیت اور اس کی طاقت کا احساس بڑی شدت سے علینہ کے اندر جاگ کر اسے خوف زدہ کر گیا تھا۔

"علی شیر یاران کو آرڈر دینے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے آئندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنے لب و لہجے کا خیال رکھیے گا۔"

انتہائی کروفر سے بولتا ہوا وہ نئے سرے سے علینہ کے غصے کو ہوا دے گیا تھا۔ وہ شخص خود کو سمجھ کیا رہا تھا؟ جل کر سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار دانت پیسے تھے۔

"میں آپ سے دوبارہ بات کروں گی تو کسی چیز کا خیال رکھوں گی ناں!"

"چلیں دیکھیں گے۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے جیسے کان پہ سے مکھی اڑائی تھی۔

"ویسے آج آپ آف وائٹ ڈریس میں کافی اچھی لگ رہی تھیں۔ یہ رنگ آپ پہ خاصا جچ رہا تھا۔ اس لیے عموما" یہی پہنا کریں۔"

نرم لہجے میں اس کی سماعتوں پہ بم گراتا وہ فون بند کر گیا تھا اور پیچھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور سنسناتے دماغ

کے ساتھ کتنی ہی دیر اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ لیکن ہم یہ کریں گے کیسے میر؟" اسد نے حیرت سے سامنے بیٹھے آصف کو دیکھا جس کے چہرے پہ بڑی پراسرار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"سب ہو جائے گا۔ بس ذرا آغا صاحب سے بات ہو جائے' اس کے بعد اس علی شیر یاران اور اس کی پارٹی کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا تو آصف میر نام نہیں۔" وہ غیر مرئی نقطے پہ نگاہ جمائے تنفر سے بولا تو اسد نفی میں سر ہلا گیا۔

"میرا نہیں خیال کہ ہمیں یہ قدم اٹھانا چاہیے۔ یہ تو سیدھا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہو گی' کیونکہ اور کسی کے علم میں آئے یا نہ آئے علی شیر کو تو پتا ہو گا ناکہ یہ کھیل ہم نے کھیلا ہے۔"

"ہاں تو دشمن کا پتا کاٹنے کے لیے میدان میں تو اترنا پڑے گا نا۔" اسد کی بات آصف کو خاصا بدمزا کر گئی تھی۔

"بے شک اترنا پڑے گا لیکن ہمارا یہ قدم تو ہمیں فرنٹ لائن پہ لا کھڑا کرے گا۔" اسد نے پریشانی سے ایک نظر وہاں موجود باقی لوگوں کی جانب دیکھا۔

"تو تم نے کیا سیاست کو بچوں کو کھیل سمجھ رکھا ہے؟ یہاں کامیابی پانے اور اپنے مخالفین کا سر کچلنے کے لیے فرنٹ لائن پہ ہی سینہ تان کے لڑنا پڑتا ہے۔" آصف نے درشتی سے کہتے ہوئے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا تو اسد بے اختیار اک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

"جانتا ہوں میر! لیکن اگر ہم کوئی وار چھپ کر کریں تو میرے خیال میں وہ ہمارے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔"

"چھوٹے موٹے واروں سے مجھے میرا مقصد نہیں مل سکتا۔ اس وی سی کی باتوں نے میرے یہاں آگ لگا رکھی ہے۔" اس نے انگوٹھے سے اپنے سینے کو ٹھوکا۔ "وہ اس روز کس کی شہہ پہ اتنا اچھل رہا تھا میں اچھی طرح جانتا ہوں' لہٰذا پہلے اس فساد کی جڑ کو اکھاڑوں گا پھر اس وی سی سے بھی نپٹوں گا۔۔۔ تم نے میرا ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ باہر کا راستہ وہ رہا۔" اس نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں دروازے کی جانب اشارہ کیا تو اسد لب بھینچے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

ایک بات تو طے تھی کہ اگر اسے پارٹی میں اپنی حیثیت مزید مضبوط کرنی تھی تو وفاداری ثابت کرنے کا اس سے اچھا موقع اسے اور نہیں مل سکتا تھا۔ ویسے بھی علی شیر یاران کے عتاب کا پہلا شکار تو آصف میر کو ہی بننا تھا۔ سو اسے کیا پڑی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنی ایک سال کی محنت پہ پانی پھیرتا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں!" اندر ہی اندر سود و زیاں کا حساب لگاتے ہوئے وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد مضبوط لہجے میں بولا تو آصف کے لبوں پہ جاندار مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"گڈ! مجھے تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔"

☼ ☼ ☼

علینہ کی ساری رات پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزری تھی۔ یہ بات وہ قصداً" اس کے اردگرد موجود تھا یا ہوٹل میں اس کی موجودگی محض ایک اتفاق تھی' اسے پریشان کر گئی تھی۔ اس پہ مستزاد اپنی بے بسی کا احساس۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کا ذکر کس سے کرے؟

صوفیہ بیگم اور فصیح الحسن سے اگر وہ بات کرتی تو انہوں نے سب سے پہلے حفاظتی قدم کے طور پہ اس کا یونیورسٹی جانا اور باہر نکلنا بند کرنا تھا۔ پھر فصیح صاحب نے اس علی شیر یاران سے بات کرنی تھی اور وہ جس قسم کا ٹیڑھا بندہ تھا' علینہ کسی طور نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بابا اس گھٹیا شخص کے منہ لگیں۔

رہا اسد تو اس کے تو متوقع ردعمل کا سوچ کے ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ اس کی وجہ سے اسد کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے' وہ ایسا کبھی نہیں چاہتی تھی' یہی وجہ تھی کہ ساری رات آنکھوں میں

گزارنے کے باوجود اسے اس مسئلے کا کوئی حل سجھائی نہیں دیا تھا۔ مگر۔۔ اس پریشانی کو تنہا سہنا بھی اس کے بس میں نہ تھا۔ اسی لیے اپنے دکھتے سر کو نظرانداز کیے وہ یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ مگر آگے ان تینوں کو نہ پاکے وہ اتنی پریشان ہوئی تھی کہ کلاس تو کیا یونیورسٹی سے ہی باہر نکل آئی تھی۔

تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے اس کا ارادہ ٹیکسی لے کے گھر جانے کا تھا۔ مگر نجانے کیوں وہ ابھی گھر بھی نہیں جانا چاہ رہی تھی۔ بے چینی کے عالم میں وہ سیدھی سیدھی چلتی یونیورسٹی سے کافی دور چلی آئی تھی۔

اپنی سوچوں میں گم وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر آگے بڑھ رہی تھی جب پاس سے گزرتی ایک گاڑی نے تھوڑے فاصلے پہ جاکے بریک لگایا تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی تیزی سے ریورس ہوتی ایک جھٹکے سے علینہ کے پاس رکی تھی اور وہ جو اپنے دھیان میں چل رہی تھی' بری طرح ڈر کے پیچھے ہٹی تھی۔

غصے سے کھولتے ہوئے اس نے کھا جانے والی نظروں سے گاڑی کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے ایک جانے پہچانے چہرے کو پاکے وہ ایک پل کے لیے ٹھٹکی تھی اور اگلے ہی لمحے جہاں اس کی رنگت فق ہوئی تھی وہیں وہ بے اختیار کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"آپ کے چہرے کی رنگت بتا رہی ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ لیکن چونکہ اتفاق سے کبھی آج تک فیس ٹو فیس تعارف کروانے کا موقع نہیں ملا' اسی لیے' مجھے علی شیر یاران کہتے ہیں۔"

بھاری لہجے میں بولتا وہ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کے اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو علینہ ایک نظر اپنے سامنے کھڑے اونچے لمبے' بے انتہا خوبرو شخص کو دیکھ کر رہ گئی۔ جو سفید کاٹن کے کلف لگے شلوار قمیص میں آنکھوں پہ ڈارک گلاسز لگائے سپاٹ چہرہ لیے اسی کی جانب متوجہ تھا۔

اس کے باہر نکلتے ہی پچھلی سیٹ سے دو باڈی گارڈ گنز اٹھائے اتر کے گاڑی کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ بے اختیار علینہ کی سہمی ہوئی نظریں ان کی جانب اٹھی تھیں اور اسے اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں تو رات کیا کہہ رہی تھیں آپ کہ آپ مجھ سے دوبارہ بات کریں گی تو کسی چیز کا خیال رکھیں گی۔۔۔ ہوں۔ یہی دیکھنے کے لیے میں آج یونیورسٹی جا رہا تھا کہ اگر میں بات کرنے کے بجائے سیدھا آپ سے ملنے آجاؤں تو آپ کیا کریں گی؟" اس نے استہزائیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"لیکن آپ نے سرراہ شرف ملاقات بخش کے مجھے نہ صرف زحمت سے بچا لیا بلکہ میرے تجسس کا بھی جلد خاتمہ کر دیا۔ ہاں تو مس علینہ فصیح! اب میں نہ صرف آپ سے بات کر رہا ہوں بلکہ آپ کے سامنے بھی کھڑا ہوں۔ اب کیا کریں گی آپ؟"

چہرے پہ مکمل سنجیدگی لیے وہ اس کے روبرو کھڑا اپنے پرغرور لہجے میں بولا تو علینہ نے حیرت سے اپنی ذات کے نشے میں چور اس شخص کو دیکھا۔ جس کی انا شاید اس کے قد سے بھی زیادہ بلند تھی۔ جب ہی تو اسے اپنی بات کا رد کیے جانا اس قدر ناگوار گزرا تھا کہ وہ ہر کام چھوڑ چھاڑ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

بے اختیار اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے اس نے اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ رات اتنی دلیری سے دوبدو جواب دینے کے بعد اب اسے بھی بزدلی دکھانا منظور نہ تھا۔

"لگتا ہے خاصی گہری چوٹ پڑی ہے آپ کی انا پہ یا پھر آپ کو انکار سننے کی عادت نہیں؟" اپنی آواز کا توازن اسے ایک پل کے لیے خود بھی حیران کر گیا تھا۔

"صحیح کہا' مجھے واقعی انکار سننے کی عادت نہیں۔" وہ بازو سینے پہ لپیٹے ہوئے گویا ہوا۔

"دین آئی ایم سوری مسٹر علی شیر! میں آپ کو خوش کرنے کے لیے اپنے اصول سے انحراف نہیں کر سکتی۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بلا جھجک بولی۔

"اور آپ کا اصول کیا ہے؟" علی شیر کے چہرے پہ اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"اپنی عزت کی حفاظت کرنا۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا تو علی شیر کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں واقعی کوئی عام لڑکی نہیں ہوں اور میں ہی کیا ہر وہ لڑکی خاص ہے جو اپنے ماں باپ کے بھروسے کو ان کی پیٹھ پیچھے بھی قائم رکھتی ہے۔ میں معذرت چاہتی ہوں اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو' رات میرا مقصد آپ کی انسلٹ کرنا نہیں' بلکہ صرف یہ بات واضح کرنا تھا کہ پلیز مجھے یوں کالز کرکے' فالو کرکے پریشان مت کریں۔ میں اپنی ذات سے منسلک لوگوں کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

شائستگی سے بولتی وہ اپنی تئیں سامنے کھڑے شخص کے ہر ممکنہ سوال کا جواب دے رہی تھی۔ یہ جانے بنا کہ ڈارک گلاسز کے پیچھے چھپی علی شیر یاران کی آنکھیں اس کے وجود پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کا ہر ہر لفظ اس کے خاص نہیں' بلکہ بے حد خاص ہونے کا اعلان کر رہا تھا اور یہ کوئی معمولی احساس نہ تھا۔

"امید ہے' آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے' ناؤ پلیز ایکسکیوز می۔ مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔" اپنی بات مکمل کرتی وہ اس کی سائیڈ سے نکل کر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ جو محض اس کی جرأت کی حد دیکھنے کو یونیورسٹی چلا آیا تھا' اب مہر بہ لب کھڑا اسے گہری نگاہوں سے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

علینہ فصیح سے یہ اس کا چوتھا ٹکراؤ اور پہلی باضابطہ ملاقات تھی اور وہ خود سے یہ اقرار کرنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ اگر علی شیر یاران کو بھلانا آسان نہیں تھا تو علینہ فصیح کو بھی ذہن سے جھٹکنا اتنا سہل نہ تھا۔ جبکہ دوسری طرف ٹیکسی میں سوار علینہ نے اپنے بہ خیر و عافیت بچ نکلنے پہ اللہ کا ڈھیروں شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ علی شیر یاران کو ان اکھڑے تیوروں کے ساتھ اپنے سامنے جما دیکھ کے اس کی تو سٹی گم ہو گئی تھی۔ اسے تو اب تک یہ بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے اس درجہ ہمت کا مظاہرہ کر چکی ہے۔

گو کہ اس کی خاموشی اور بے تاثر چہرے سے وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی تھی' لیکن قوی امکان تھا کہ اس جیسا شاہانہ مزاج والا بندہ اب اس کے پیچھے آنے والا نہ تھا۔ اپنی کامیابی کا احساس اس کے اندر ڈھیروں اطمینان بکھیر گیا تھا۔ رات بھر کی کسلمندی اور بے زاری لمحوں میں ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس' وہ قیمتی کلون کی دلفریب خوشبو میں بسا اپنے دوست کے ولیمے پہ جانے کے لیے تیار ہو کے عجلت میں کمرے سے نکلا تھا' مگر لاؤنج میں عالیہ یاران کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لیکن پھر بھی ہلکا سا روکھا پن اس کے انداز میں جھلک ہی آیا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین۔ کہاں جا رہی ہیں؟ ظاہر ہے کسی پارٹی پہ ہی جا رہی ہوں۔" بھنویں تانے وہ ناگواری سے بولیں تو علی شیر نے بمشکل تمام خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا تھا۔

"مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ آپ کسی پارٹی میں جا رہی ہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں' کس کی پارٹی پہ جا رہی ہیں؟" تمام تر کوشش کے باوجود چند شکنیں اس کی پیشانی پہ نمودار ہو گئی تھیں۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" عالیہ یاران سے کوئی سوال جواب کرے یہ بھلا وہ کب برداشت کرتی تھیں۔

"اس لہجے میں جس میں پاپا کو آپ سے بات کرنی چاہیے تھی۔" ان کی جانب دیکھتا وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا تو عالیہ کے لبوں کو اک طنزیہ مسکراہٹ نے چھو لیا۔

"تمہارے باپ میں اتنے گٹس نہیں کہ عالیہ تنویر سے سوال جواب کر سکے۔ ویسے بھی وہ اکثر اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہوتا۔"

"لیکن مجھ میں نہ صرف گٹس ہیں بلکہ میرے حواس بھی بخوبی قائم ہیں اور میں آپ پہ آج یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کا لیٹ نائٹ اس "سرائے" سے باہر رہنا پسند نہیں!" وہ سرائے پہ زور دیتا ہوا بولا تو عالیہ یاران کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"بہت خوب! تو یہ گھر نہیں' سرائے ہے۔ یعنی تمہارے ماں باپ اتنے خود غرض انسان ہیں کہ انہوں نے اس گھر کو گھر نہیں بلکہ ایک سرائے بنا چھوڑا ہے۔"

"بات تو سچ ہے' مگر بات ہے رسوائی کی۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے علی شیر دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔

"تو پھر ایسا ہے صاحبزادے! کہ اس سرائے کو گھر بنانے والی لے آؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ ماں کو باتیں سنانے والا میرا لاڈلا خود کون سی خاص چیز پسند کر کے لاتا ہے۔" غصے سے اسے گھورتی وہ چیلنجنگ انداز میں سینے پہ بازو باندھے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں تو یک لخت علی شیر کی آنکھوں میں کسی کا نازک سراپا اور سماعتوں میں مضبوط لہجہ گونج اٹھا تھا۔

اگلے ہی پل اس کے دماغ نے ایک فیصلہ کیا تھا جس پہ دل نے لمحے کا توقف کیے بنا تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔

"لاؤں گا۔ اب میں جلد ہی اس سرائے کو گھر بنانے والی لاؤں گا اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ممی تو آپ کو بھی میری بات ماننی پڑے گی۔" ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو عالیہ یاران نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوکے' لیکن تب تک کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ امجد! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" ملازم کو پکارتی وہ پلٹ کر صوفے پہ پڑا اپنا پرس اٹھا کے لاؤنج سے باہر نکل گئی تھیں اور پیچھے علی شیر اپنا غصہ ضبط کرتا بے اختیار مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا تھا۔

علی شیر نے کراچی کی ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ ڈیل فائنل کی تھی اور اپنی اسی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے وہ کراچی سے آئے اپنے مہمانوں کو ایک شاندار ڈنر کروانے کے بعد ہلکی پھلکی تفریح کے لیے جم خانہ لیے چلا آیا تھا۔ اپنے ملنے ملانے والوں سے حال احوال کرتا وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ لون ایریا میں چلا آیا تھا۔ جہاں محفل موسیقی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

خوشگوار موڈ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے وہ اس محفل کو خاصا انجوائے کر رہا تھا۔ جب معاً موبائل کی اسکرین پہ رضا یاران کا نمبر جگمگاتا دیکھ کے وہ اپنے مہمانوں سے معذرت کرکے تیز قدموں سے اندر ہال کی جانب بڑھ آیا تھا۔ وہ اس سے یقیناً اس ڈیل کے بارے میں ہی پوچھنا چاہ رہے تھے۔

کال ریسیو کرتے ہوئے وہ نسبتاً ایک پرسکون کونے میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ مختصر الفاظ میں انہیں ضروری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے وہ فون بند کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھاتا آصف میر کا نام اسے اپنے دائیں جانب دیکھنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ جہاں اس سے کچھ فاصلے پہ مدہم روشنیوں کے سائے میں اسد اعوان اپنی پارٹی کے چند لڑکوں کے ساتھ ڈرنکس سے لطف اندوز ہونے میں مصروف تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے علی شیر واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا تھا۔ مگر اس بار احتیاطاً وہ قدرے بائیں طرف کو ترچھا ہو کے بیٹھا تھا۔

"تم نے اس کا انداز دیکھا ہے' کس طرح سے آرڈر دیتا ہے۔ میرا تو دل کرتا ہے کمینے کا گلا دبا دوں!" ایک آواز علی شیر کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ بے اختیار اس کے لب استہزائیہ انداز میں دھیمے سے مسکرا دیے تھے۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ایک بار اس علی شیر کا کانٹا ختم ہو جائے۔ پھر اسے میں کیسے اس کرسی پہ سے پٹختا ہوں' تم لوگ دیکھنا۔" کوئی بوجھل آواز میں

بولا تو علی شیر اسے دیکھنے کے لیے دھیرے سے سیدھا ہوا اور اپنے اندازے کے عین مطابق اسد اعوان کو بوتل ہاتھ میں لیے نیا ڈرنک تیار کرتا دیکھ کے وہ خاصا محظوظ ہوتا' رخ پھیر گیا تھا۔

"یار! کب آئے گی وہ۔۔۔" اسد نے جھنجلا کر بوتل زور سے میز پر پٹخی۔

"آہستہ بولو! ام میں تو صبر نام کو نہیں ہے۔" اس کے برابر بیٹھے لڑکے نے بے اختیار اپنے اردگرد دیکھا تھا۔

"پتا نہیں' شادی کے بعد اس کا کیا بنے گا؟ یہ کیسے کسی ایک پہ اکتفا کرے گا؟" ایک نئی آواز نے ہنستے ہوئے چوٹ کی تھی۔

"شادی کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ انسان زندگی کی رنگینیوں سے منہ موڑ لے' بیوی گھر پہ اور ڈبل عیش!" وہ بات کے اختتام پہ زور سے ہنسا تو باقی لڑکے بھی قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے اور علی شیر اس کی خباثت سے حظ اٹھاتا ایک طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پوری طرح سامنے کھلی کتابوں میں گم نوٹس بنانے میں مصروف تھی کہ اچانک پاس پڑے موبائل کی بیل نے اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر فون اٹھاتے ہوئے اس نے کرسی کی بیک سے کمر ٹکاتے ہوئے جونہی اسکرین پہ نظر ڈالی اس کا "پش" کی جانب بڑھتا انگوٹھا تھم گیا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے بھینچے ہوئے لبوں اور ڈوبتی دھڑکنوں کے ساتھ کال ڈسکنکٹ کرتے ہوئے موبائل ٹیبل پہ پٹخ دیا تھا اور خود دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے صحیح کہا تھا اسے واقعی انکار سننے کی عادت نہیں تھی اور علینہ جو پچھلے چار دنوں سے اس کی خاموشی کو اپنی کامیابی سمجھے ہوئے تھی' علی شیر یاران کا نمبر اپنے سیل پہ جگمگاتا دیکھ کے مارے جھنجلاہٹ اور بے بسی کے روہانسی ہو گئی تھی۔

اسی اثناء میں سامنے پڑے موبائل پہ میسج ٹون بجی تھی۔ بے اختیار سر اٹھاتے ہوئے اس نے لاچار نظروں سے اپنے سامنے پڑے فون کو دیکھا تھا اور پھر مردلی سے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھاتے ہوئے میسج کھولا تھا۔

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں کل یونیورسٹی نہ آؤں تو فون اٹھائیں۔" اور علینہ کی رگیں اس کھلی بلیک میلنگ پہ تن سی گئی تھیں۔ اس گھٹیا شخص نے آخر اسے سمجھ کیا رکھا تھا؟

کھولتے دماغ کے ساتھ اس نے جواب لکھنا شروع کیا تھا' مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے تمام الفاظ ڈیلیٹ کر ڈالے تھے۔ تب ہی موبائل ایک بار پھر بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اب کی بار علینہ نے دانت پیستے ہوئے کال ریسیو کی تھی اور لمحے کا توقف کیے بنا انتہائی سرد لہجے میں بولی تھی۔

"میں نے سنا تھا کہ برے سے برے انسان میں بھی کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت اچھائی اور شرافت ضرور موجود ہوتی ہے۔ مگر آپ نے یہ بات غلط ثابت کر دی ہے مسٹر علی شیر! آپ کا شمار صرف برے نہیں بلکہ برے اور بے حس لوگوں میں ہوتا ہے جن کے نزدیک دوسروں کی ذات' ان کے احساسات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مگر میں آپ کو بتا دوں میں آپ کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی نہیں بنوں گی۔ میں ابھی اسی وقت اپنے پیرینٹس کو آپ کی گھٹیا حرکتوں کے بارے میں انفارم کرتی ہوں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح۔۔۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔ کم از کم اس بہانے ان سے بات تو ہو گی اور مجھے بھی اپنا مدعا بیان کرنے میں تھوڑی سہولت ہو جائے گی۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے اطمینان سے بولا تو علینہ کی پیشانی پہ پڑے بل گہرے ہو گئے۔

"ویسے بھی آپ ماں باپ کا مان رکھنے والی بیٹی ہیں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ میں ڈائریکٹ آپ کے والدین سے بات کروں۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ ان سے بات کرنے سے قبل ایک بار آپ کی رائے لے لوں لیکن آپ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔"

"کیسی رائے؟" علینہ کے اندر یک لخت خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔

"آپ کوئی بچی نہیں کہ میرے عمل سے آپ کو اب تک کچھ سمجھ میں نہ آیا ہو۔ آپ مجھے روز اول سے ہی باقی لڑکیوں سے منفرد اور خاص لگی تھیں اور آنے والے وقت نے میرے اس اندازے کی تصدیق کی تھی۔ میں آپ کی جانب خود کو متوجہ ہونے سے روک نہیں سکا تھا۔ پہلے پہل میری نیت صرف آپ کو قریب سے جاننے اور دوستی کرنے کی تھی۔ لیکن ہماری آخری ملاقات نے مجھ پہ واضح کر دیا کہ آپ خاص نہیں' بلکہ بہت خاص لڑکی ہیں۔ آپ کے خیالات کی پاکیزگی اور کردار کی مضبوطی نے مجھے آپ کی عزت کرنے پہ مجبور کر دیا ہے اور یقین مانیں! کسی عورت کے بارے میں ایسے احساسات میں نے پہلی بار محسوس کیے ہیں۔ میں نے پہلی بار۔۔۔"

"ایکسکیوزمی مسٹر علی شیر! یہ پہلی بار کی داستان آپ اب تک کتنی لڑکیوں کو سنا چکے ہیں؟" علینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو علی شیر اک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"پہلی بار" کی داستان سننے والی آپ اب تک واحد ہیں۔ جہاں تک لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کی بات ہے تو ٹوٹلی وہ یری آنسٹ تعداد یاد نہیں' لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ وہ محض لفاظی تھی جبکہ جو میں آج سنا رہا ہوں اس کا حرف حرف سچا ہے۔ مجھ جیسا مرد اتنی آسانی سے اپنا آپ ہر کسی پہ نہیں کھولتا اور اگر آج میں آپ سے یہ سب کہہ رہا ہوں تو اس کا کریڈٹ صرف آپ کو جاتا ہے۔ میں ان مردوں میں سے ہوں جو اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی ترجیح ایک ایسے مضبوط گھر کو دیتے ہیں جس کی بنیادیں اعتبار' محبت اور عزت پہ قائم ہوں۔

ہو سکتا ہے آپ کو میری بات پہ یقین نہ آ رہا ہو لیکن یہ سچ ہے کہ ان گنت لڑکیوں سے دوستی کے باوجود میں نے اب تک شادی صرف اس لیے نہیں کی کہ مجھے رشتوں کو نبھانے اور گھر بنانے والی لڑکی کی تلاش تھی اور میری یہ تلاش آپ کو جان کر اب تھم سی گئی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ مجھے آپ سے کوئی دھواں دھار قسم کا عشق ہے۔ لیکن چونکہ آپ میرے آئیڈیل کے بے حد قریب ہیں اس لیے آپ نہ صرف مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہیں بلکہ میں آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں اور اسی سلسلے میں آپ کی رائے درکار تھی تاکہ میں مزید کسی تاخیر کے اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیج سکوں۔" انتہائی نارمل لہجے میں اس نے اپنی ترجیحات سے لے کے پسندیدگی اور پرپوزل تک سب کچھ ایک ساتھ کہہ سنایا تھا اور ساکت بیٹھی علینہ کے لیے کچھ بھی کہنا محال ہو گیا تھا۔

"آپ جیسے بندے کی اپنی لائف پارٹنر کے بارے میں اتنی منطقی سوچ ہو سکتی ہے' مجھے جان کے حقیقتاً خاصی حیرت ہوئی ہے۔ لیکن جہاں تک میری رائے کا سوال ہے تو یقین جانیں علی شیر صاحب! میری رائے آپ کے کسی کام کی نہیں' کیونکہ میرا اور آپ کا کبھی بھی کوئی رشتہ نہیں بن سکتا۔" علی شیر کے لہجے کی سنجیدگی اسے یہ باور کروا گئی تھی کہ اگر وہ اس مشکل سے نکلنا چاہتی ہے تو اسے اس لمحے جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا پڑے گا۔ پتا نہیں ۔۔۔ کیوں اسے علی شیر کے لہجے میں سچائی بولتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اسے نہ صرف سمجھ چکا ہے بلکہ تنگ کرنے اور اس سے فلرٹ کرنے کا ارادہ بھی موقوف کر چکا ہے۔ لیکن اس کا جواب سن کے اس کا کیا ردعمل ہونے والا تھا' وہ سوچ کے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ اسی لیے اس نے بہت طریقے سے تمہید باندھی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" مقابل کے لہجے میں ہلکی سی بے چینی در آئی تھی۔

"کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے۔" دھیمی آواز میں کیا گیا انکشاف ایک پل کے لیے علی شیر کو خاموش کر گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ کہیں وہ اس سے ڈر کے جھوٹ کا سہارا تو نہیں لے رہی تھی؟ لیکن اس کے

اگلے جملے از خود علی شیر کا ہر اندیشہ مٹا گئے تھے۔

"اور آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کو ٹالنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے لیے حقیقت پتا کروانا کوئی مشکل کام نہیں۔" مدہم لہجے میں بولتی وہ علی شیر کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گئی تھی۔

نجانے کیوں لیکن اس کی منگنی کی اطلاع پہ علی کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ افسردگی کا احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگا تھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کون خوش نصیب ہے وہ؟" خود پہ قابو پاتے ہوئے اس نے آہستگی سے استفسار کیا تو علینہ خاموش ہو گئی۔ وہ اسد کا نام بتا کر اسے کسی مشکل میں گرفتار نہیں کروانا چاہتی تھی۔ جبکہ ایک لمحہ پہلے وہ خود کہہ رہی تھی کہ اس کے لیے حقیقت پتا کروانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن یہ اس کی اسد سے محبت تھی جو وہ اپنا ہی کہا بھلائے یک لخت چپ ہو گئی تھی۔

"آپ اگر مجھ پہ بھروسا کریں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔" اس کی خاموشی منٹ میں علی شیر پہ اس کی سوچ واضح کر گئی تھی۔

بے اختیار علینہ نے اک گہری سانس ہوا کے سپرد کی۔

"اسد اعوان۔" اور دوسری جانب موجود علی شیر بری طرح چونک گیا تھا۔

"وہ اسد اعوان جو آصف میر کی پارٹی میں ہے؟" علی شیر نے بے یقینی سے کہا۔

"جی!" وہ جانتی تھی اس سے کچھ بھی چھپانا فضول تھا۔ علینہ کے جواب پہ علی شیر کی بے یقینی آن واحد میں تاسف میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"سوری ٹو سے مس علینہ! لیکن وہ شخص کسی بھی طرح آپ کے لائق نہیں!" اس کا تبصرہ علینہ کی پیشانی کو نئے سرے سے شکن آلود کر گیا تھا۔ کتنا گھٹیا انسان تھا یہ!

"مجھے تو لگا تھا کہ آپ حقیقت کو بڑے ظرف سے قبول کریں گے لیکن آپ تو مسٹر علی شیر! اوچھے ہتھ کنڈوں پہ اتر آئے ہیں۔" اس کی بے اعتباری نے علی کو سلگا کے رکھ دیا تھا۔

"میں نے صرف سچائی بیان کی ہے جو مجھے یقین ہے نہ آپ کے علم میں ہو گی اور نہ ہی آپ کے ماں باپ کے۔ ورنہ اتنا سطحی انسان۔۔۔"

"بس کریں! میں اسد کے بارے میں ایک لفظ اور نہیں سنوں گی!" اس کا لہجہ ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی شعلے برسانے لگی تھیں۔

"بہت پسند ہے وہ آپ کو؟" علی شیر کو اپنے اندر جلن سی اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں!" وہ زور دے کے بولی تو علی شیر کا دل جل کے خاک ہو گیا۔

"پھر تو آپ کی اعلا چوائس کی داد دینی پڑے گی۔ کیا ہیرا چنا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو علینہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"وہ ہیرا ہے یا پتھر، آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور آپ خود کون سے پارسا ہیں جو دوسروں کے کردار پہ انگلی اٹھا رہے ہیں۔"

"مجھے پارسائی کا کوئی دعوا نہیں۔ لیکن آپ کے مسٹر رائٹ کی طرح میں اپنی شریک حیات کو کم از کم دھوکا دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بقول آپ کے ہر برے انسان میں کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت اچھائی اور شرافت ضرور موجود ہوتی ہے۔ سو میں نے بھی اپنے اندر کی اچھائی اور شرافت اپنی بیوی کے لیے سنبھال رکھی ہے۔ اور اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں آپ کو آپ کے منگیتر سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو معاف کیجیے گا محترمہ! لیکن علی شیر باران دوسروں کی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ کو آپ کی پسند مبارک ہو۔ اسد اعوان کتنے پانی میں ہے، یہ آپ کو وقت بتائے گا۔ لیکن میری خواہش ہے کہ آپ پر اس کی اصلیت، کسی ناقابل تلافی نقصان سے پہلے واضح ہو جائے۔"

وہ سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا کھٹ سے فون بند کر گیا تو غصے سے کھولتے ہوئے علینہ نے بھی موبائل ٹیبل پہ پٹخ دیا۔

"ہونہہ!" تنفر سے سوچتے ہوئے اس نے سامنے کھلی کتاب ہاتھ مار کے بند کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

آنے والا دن یونیورسٹی کے در و دیوار ہلا گیا تھا۔ علی شیر باران کی پارٹی کے اہم رکن، مغیث احمد کے پاس سے ڈی سی صاحب نے سب کے سامنے ہیروئین برآمد کی تھی اور مغیث پھٹی پھٹی بے یقین آنکھوں سے اپنی جیکٹ کی بیرونی جیب سے نکلتی پڑیا کو دیکھ کے بے اختیار چلا اٹھا تھا۔

"سر، یہ میری نہیں ہے۔" فق ہوتی رنگت کے ساتھ اس نے متوحش نگاہوں سے داور کی جانب دیکھا تھا جو خود بھی سناٹے کی کیفیت میں کھڑا ڈی سی کے ہاتھ میں پکڑے سفید پاؤڈر کے اس چھوٹے سے پیکٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ماسوائے آصف میر، اسد اور ان کی پارٹی کے دیگر بندوں کے جن کے چہرے بے تاثر، لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"بکواس بند کرو! میں نے سب کے سامنے اسے تمہاری جیب سے نکالا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ تمہاری نہیں؟" ڈی سی نے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

"میں قسم کھاتا ہوں سر! یہ میری نہیں اور یہ، یہ میری جیب میں کیسے آئی میں یہ بھی نہیں جانتا۔" انہیں اپنی بات کا یقین دلاتے ہوئے وہ روہانسا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا داور بھی ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر یہ پیکٹ مغیث کی جیب میں آیا کہاں سے تھا؟ لب کچلتے ہوئے یک لخت اس کی نظر ان کے پیچھے کھڑے آصف اور اسد کے چہروں سے ٹکرائی تھی اور وہ بے اختیار ٹھٹک گیا تھا۔

ڈی سی کو ان کے آفس سے لانے والا بھی تو اسد اعوان ہی تھا۔ اسے بھلا کیسے پتا چلا تھا کہ مغیث کی جیکٹ میں ہیروئین تھی۔

"سر! مغیث صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ سارا کھیل ان کا رچایا ہوا ہے۔ ان ہی نے پھنسایا ہے اسے۔" لال انگارہ آنکھیں لیے داور نے لپک کر اسد کا گریبان پکڑنا چاہا تھا، مگر ڈی سی اور چیئرمین نے تیزی سے آگے آتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"اپنی حد میں رہو داور! ان کا بھلا اس معاملے سے کیا تعلق؟" ڈی سی نے اسے گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

"کہنے دیں سر! ان کا تو ہمیشہ سے یہی کام رہا ہے۔ اپنا گند ہم پہ اچھالنے کی پرانی بیماری ہے انہیں لیکن داور سہیل! اس بار سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہیروئین تمہارے دوست کی جیب میں سے سب کے سامنے برآمد ہوئی ہے!"

طنزیہ انداز میں بولتا آصف میر، داور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر ہیروئین میرے دوست کی جیب میں تھی تو تمہیں کیسے پتا چلا؟" داور نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے پوچھا۔ تو آصف کے چہرے پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"جب یہ علی شیر باران کے بندے سے یونیورسٹی کے باہر کھڑا یہ زہر لے رہا تھا تب اسے اسد نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً آ کے مجھے بتایا تھا اور تب ہی میں نے ڈی سی صاحب کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ علی شیر باران کی حقیقت کیا ہے، یہ ہم تو جانتے ہی تھے لیکن آج جس طرح تم لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ اس نے سب پہ تمہاری اور اس کی حقیقت عیاں کر دی ہے جو سیاست کی آڑ میں منشیات فروشی جیسا گھناؤنا جرم اس یونیورسٹی میں کر رہا ہے۔"

آصف میر بلا خوف و خطر داور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا ہوا تو اتنے بڑے الزام پہ داور کا دماغ گھوم گیا۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ رکھ کے ایک مکا آصف کے منہ پہ رسید کیا جو اگلے ہی پل مارے اذیت کے دوہرا ہو گیا تھا۔

"بہت ہو گیا تماشا' بلواؤ باران صاحب کو!" وی سی نے انہیں چھڑاتے ہوئے دہاڑ کر اپنے پی اے کو حکم دیا جو اثبات میں سر ہلاتا ان کے آفس کی جانب لپکا تھا۔ اس دوران اسٹوڈنٹس ان دونوں کو الگ کر چکے تھے۔

"یہ میری تم لوگوں کو آخری وارننگ ہے' اب اگر کسی نے بھی ایک دوسرے کو ہاتھ لگایا تو میں پولیس کو کال کرنے میں منٹ نہیں لگاؤں گا!" انگلی اٹھائے وہ عالم طیش میں چلائے تھے۔ "سیدھے طریقے سے تم چاروں میرے آفس میں چلو۔"

انہوں نے آصف' اسد' مغیث اور داور کو اشارہ کیا "باقی سب اپنی کلاسز میں جائیں اور پلیز جب تک ہم معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے میری آپ سب سے ریکوئسٹ ہے کہ اس معاملے کو باہر ڈسکس کرنے سے گریز کریں کیونکہ یہ ہماری یونیورسٹی کی ساکھ اور آپ سب کے مستقبل کا سوال ہے۔" اردگرد کھڑے طلبہ سے درخواست کرتے وہ پلٹ کر اپنے آفس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ان کے پیچھے چیئرمین اور چند ایک آفیشلز ان چاروں کو لیے آگے بڑھے تھے۔ جبکہ لیکچرارز اور پروفیسرز نے وہاں موجود ہجوم کو ان کی کلاسز کی جانب روانہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بکواس ہے یہ؟" وی سی صاحب کے منہ سے ساری تفصیل سن کے علی شیر کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ نکلے تھے۔ مارے غضب کے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے مقابل پڑے صوفے پر بیٹھے آصف میر کو گریبان سے پکڑ کے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ پہ اتنا گھٹیا الزام لگانے کی؟" اور اس کا انگارے کی طرح دہکتا وجود اپنے روبرو پا کے جہاں اس تمام عرصے میں پہلی بار آصف میر کو اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا تھا وہیں اسد اعوان کو بھی اپنے گلے کے گرد پھندا کستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آخر سب کے سامنے چشم دید گواہ کی حیثیت سے تو وہی آیا تھا۔

"باران صاحب! تحمل سے کام لیں۔ یہ صرف آپ کی نہیں بلکہ ہماری بھی عزت کا سوال ہے۔" وی سی نے پریشانی سے کہا تو علی شیر کتنی ہی دیر لب بھینچے' آصف کو شعلے برساتی نظروں سے گھورتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے پیچھے کو دھکیلتا وی سی کی جانب پلٹا۔

"علی شیر باران کی عزت اتنی ہلکی نہیں اصغر صاحب کہ کوئی بھی راہ چلتا دو ٹکے کا بے ضمیر انسان اس پہ سوالیہ نشان کھڑا کر سکے۔۔۔ میں چاہوں تو ڈی آئی جی سے لے کے آئی جی تک یہاں بلوا کر منٹ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کروا دوں۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک سرد نظر آصف اور اسد پہ ڈالی۔ جو اس کے چہرے سے چھلکتے پراسرار اور خوفناک عزائم دیکھ کے اندر ہی اندر ڈر گئے تھے۔

"اس آصف میر نے اپنے اس چیلے کو استعمال کر کے گندی سیاسی چال کے ذریعے مجھے یہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی ہے نا۔ اب آپ دیکھیے گا کہ کل یہی اسد اعوان اسی جگہ پہ کھڑے ہو کے کیسے اپنے میر صاحب کے رچائے اس ڈرامے پہ سے پردہ اٹھائے گا۔"

اس نے شہادت کی انگلی سے اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چٹانوں کی طرح مضبوط لہجے میں کہا تو اسد کا دل ایک لمحے کو ڈوب سا گیا۔ علی شیر کے تیور چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ اگر اسے اپنے نام پہ لگا داغ مٹانے کے لیے اسد اعوان کی کھال بھی کھینچ اتارنی پڑی تو وہ احتراز نہیں کرے گا۔

"تم' تم ہمیں دھمکا رہے ہو؟" آصف نے اپنے گرتے حوصلے کو سنبھالا دیتے ہوئے بہادری دکھانا چاہی تھی لیکن علی شیر کا جواب اور انداز اسے سن کر گیا تھا۔

"ہاں اور تم اپنے بچاؤ کے لیے جو کرنا چاہتے ہو کر لو اور اصغر صاحب! کل جب سچائی سب کے سامنے آئے گی تو یہ شخص اور اس کے بندے سب اسٹوڈنٹس کے سامنے نہ صرف مغیث سے معافی مانگیں گے بلکہ اس یونیورسٹی میں بھی نہیں رہیں گے۔" اس نے آصف سے بات کرتے ہوئے اچانک رخ موڑ کر وی سی کی جانب دیکھا تھا۔

اپنی بات مکمل کرتا' اسد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جس کا آدھا خون تو یہیں کھڑے کھڑے' علی شیر کے نڈر اور بے فکر انداز نے خشک کر ڈالا تھا۔

"اور تمہاری طرف تو ویسے بھی اسد اعوان میرا ایک پہلا حساب بھی نکلتا ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑا دھیمے لیکن ٹھنڈے لہجے میں بولا تو اسد کا تیزی سے دھڑکتا دل جیسے تھم سا گیا۔ "یہ کس حساب کی بات کر رہا ہے؟" اس نے الجھ کر سوچتے ہوئے سامنے کھڑے شخص کا چہرہ دیکھا' جس پہ بے اختیار اک طنزیہ مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا کر غائب ہو گئی تھی۔

"پریشان مت ہو' جلد پتا چل جائے گا جب ہم "دوبارہ" ملیں گے۔ وہ دوبارہ پہ زور دیتا وی سی کی جانب پلٹا تو اسد نے بے اختیار گھبرا کر آصف میر کی طرف دیکھا جو خود بھی پریشان نظروں سے علی شیر کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"او کے اصغر صاحب! چلتا ہوں۔ امید ہے آپ کل تک کی مہلت دیں گے مجھے۔" اس نے مسکرا کر لطیف سا طنز کیا تو سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پریشان مت ہونا!" مغیث کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس نے ایک کاٹ دار نظر آصف پر ڈالی اور باہر کی طرف چل دیا۔ جبکہ آصف کے شاطر دماغ نے تیزی سے نئے تانے بانے بننے شروع کر دیے تھے۔

وی سی صاحب کے بند آفس میں کیا بات ہوئی تھی اور کیا نہیں' کسی کو ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا۔ لیکن ہر ایک کے منہ سے کچھ نہ کچھ سننے کو ضرور مل رہا تھا اور ان ساری افواہوں نے مل کر علینہ کی حالت غیر کر ڈالی تھی اس پہ مستزاد گزشتہ رات علی شیر کے ساتھ ہونے والی گفتگو۔ وہ حد درجہ ہراساں اور پریشان تھی۔ مگر تسلی کے لیے اسد کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

وہ وی سی کے آفس سے نکل کر آصف میر کے ساتھ کہاں گیا تھا' کسی کو علم نہ تھا۔ اس کا موبائل بھی مسلسل بند تھا' ایسے میں وقفے وقفے سے اس کا نمبر ٹرائی کرتی علینہ بالآخر تھک کر رو پڑی تھی۔ گھر میں آج کے واقعے کا ذکر اس نے قصداً نہیں کیا تھا مبادا اسد اس بات کے ڈسکس کیے جانے پہ برا مان جاتا۔

وہ بہانے سے دوبارا اکبر انکل کی طرف بھی فون کر چکی تھی۔ اتفاق سے دونوں مرتبہ فون رخشندہ آنٹی نے ریسیو کیا تھا اور ہمیشہ کی طرح خاصی رکھائی سے اسے اسد کی غیر حاضری کے متعلق بتایا تھا۔ ان کا انداز ان کی لاعلمی کو ظاہر کر رہا تھا اور اس بات نے اس کی پریشانی کو سوا کر دیا تھا۔ آخر اسد گیا کہاں تھا؟

سرشار سے اسد نے' آغا فیروز کے عنایت کردہ گارڈز کے ہمراہ جس وقت گھر کے اندر قدم رکھا' گھڑی رات کے سوا بارہ بجا رہی تھی۔ وہ اور آصف وی سی کے آفس سے نکل کر سیدھا آغا فیروز کے گھر گئے تھے۔ جو ان کی پارٹی کے نائب صدر تھے اور جن کی اجازت پہ ہی میر نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

ساری بات سن کے انہوں نے ان دونوں کو پورا دن اپنے گھر میں ہی رکنے کی ہدایت کی تھی اور اب آدھی رات کو گارڈز کے ہمراہ وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کے اسد اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں گھڑی کی جانب اٹھی تھیں اور اس کے چہرے پہ بڑی بھرپور فاتحانہ مسکراہٹ چمکی تھی۔

"ہونہہ! بڑا آیا مجھ سے سچ اگلوانے والا۔" نفرت سے ہنکارا بھرتا وہ اپنے بیڈ پہ گر سا گیا تھا۔

"تم اور تمہاری دھمکیاں۔۔۔ ہونہہ مسٹر علی شیر باران۔۔۔ دیکھتے ہیں اب تم کل اسی آفس میں ان ہی لوگوں کے درمیان اپنے کہے کی دھجیاں کیسے سمیٹو گے!" سرشاری سے سوچتے ہوئے اس نے مطمئن انداز

میں آنکھیں موند لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے علینہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟" ناشتے کی میز پہ اسے بے دلی سے صرف چائے پیتا دیکھ کے صوفیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا جہاں تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ پژمردگی بھی بکھری ہوئی تھی۔

ان کی بات پہ فصیح صاحب نے بھی ہاتھ میں پکڑے اخبار پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا جو آج خلاف عادت بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"جی طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن سر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

"تو آج چھٹی کر لو بیٹا۔" فصیح صاحب نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے چائے کا کپ اپنے سامنے کیا۔

"نہیں بابا! آج جانا بہت ضروری ہے۔" وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانا ضروری ہے تو کم از کم ناشتا تو ٹھیک سے کر کے جاؤ۔" صوفیہ بیگم نے اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"دل نہیں کر رہا.... او کے بابا اور امی اللہ حافظ!" وہ بیگ اٹھائے پورچ میں چلی آئی جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی گاڑی منزل کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ علینہ نے بیگ میں سے موبائل نکالتے ہوئے ایک بار پھر اسد کا نمبر ملایا تھا۔ رات سے مسلسل "پاورڈ آف" کی گردان سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے، لیکن اس بار بیل جاتی سن کے اس نے بے اختیار شکر کا سانس لیا تھا۔

مگر دقفے دقفے سے جاتی بیل کے باوجود دوسری جانب سے جب کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تو جھنجلا کر کال کاٹتے ہوئے اس نے ایک بار پھر نمبر ملایا تھا۔ لیکن بے سود۔

لب بھینچے اس نے کال ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے پریشان نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔

"پتا نہیں اسد فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا؟ اے میرے پروردگار! تو اسد کی حفاظت کرنا اسے دشمنوں کے ہر دار سے محفوظ رکھنا مولا!" اپنے دل میں امڈتے ڈھیروں وسوسوں سے گھبرا کر اس نے نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار اپنے رب کو پکارا تھا۔ مگر مضطرب دل کی گھبراہٹ کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ جب تک وہ اسد کو دیکھے گی نہیں، اس سے بات نہیں کرے گی اس کی یہ بے چینی دور ہونے والی نہیں تھی اور اسی لیے وہ جلد از جلد یونیورسٹی پہنچنا چاہتی تھی۔ خدا خدا کر کے سفر تمام ہوا تو وہ تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کراس کرتی گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی ایک مردانہ پکار نے اس کے تیزی سے اٹھتے قدم روک دیے تھے۔

"ایکسکیوز می مس!"

"جی۔" چونک کر پلٹتے ہوئے اس نے خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑے لڑکے کی طرف حیرت سے دیکھا تھا جو اس کے لیے بالکل انجان تھا۔

"آپ کا نام علینہ فصیح ہے؟" اس نے قریب آتے ہوئے شائستگی سے پوچھا تو علینہ گھبرا سی گئی۔

"دیکھیں! گھبرائیں مت، میں اسد کا دوست ہوں۔" اس کا اضطراب یقیناً مقابل نے بھی بھانپ لیا تھا جب ہی اگلے ہی پل وہ اسد کا حوالہ دیتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولا تو علینہ اس کے منہ سے اسد کا نام سن کے بے قراری سے بولی۔

"جی میں ہی علینہ فصیح ہوں۔ آپ بتائیں سب خیر تو ہے نا؟ اسد ٹھیک تو ہے؟"

"جی سب خیر ہے۔ اسد بالکل ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ بس مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم بیچ راستے سے ہٹ کے ایک طرف ہو جائیں؟"

نرمی سے کہتے ہوئے اس نے علینہ کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اقرار پہ وہ لڑکا لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا تو علینہ بھی تیز قدموں سے اس کے پیچھے ہولی۔

ایک نسبتاً "خاموش سائیڈ" پہ وہ ایک سیاہ کرولا کے پاس آ کر رکا ہوا تو علینہ بھی چلتی ہوئی اس سے ذرا فاصلے پہ آ رکی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی۔ گاڑی کے پچھلے دروازے میں سے دو تگڑی عورتیں نکل کے اس کے دائیں بائیں آ کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی سامنے کھڑے لڑکے نے اپنی جیب میں سے چھوٹی سی پسٹل نکال لی۔

"آواز نکالنے یا شور مچانے کی غلطی مت کیجیے گا مس علینہ! کیونکہ آپ کے اسد اعوان صاحب ہمارے قبضے میں ہیں۔ آپ کی چھوٹی سی غلطی ان کی وہاں جان لے سکتی ہے۔ اس لیے خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

دھیمے لیکن انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو علینہ کی مارے دہشت کے آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"ک کون ہو تم لوگ اور م مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" مگر اس کی بات کا جواب دینا ان تینوں میں سے کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

لڑکے کے اشارے پہ ایک عورت نے اس کا بیگ اپنے قبضے میں لیا تھا۔ جبکہ دوسری نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کے اسے اپنے ساتھ کار میں گھسیٹ لیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا تھا کہ علینہ اپنے منتشر حواس کو سمیٹ بھی نہ سکی تھی اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

تقریباً "پچیس، تیس منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ علینہ کی آنکھوں پہ چونکہ پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اسے کہاں لایا گیا تھا۔ لیکن کس کے کہنے پہ لایا گیا تھا۔ اس حقیقت سے وہ کچھ کہے سنے بنا بھی بخوبی واقف تھی۔ علی شیر باران کے متعلق اس کے بدترین خدشات آخر کار سچ ثابت ہوئے تھے۔ وہ خود کو چاہے کتنی ہی سلجھی ہوئی سوچ کا مالک کیوں نہ ظاہر کرتا اس کی حقیقت یہی غنڈہ گردی اور بدمعاشی تھی۔ اس نے اپنا اصل دکھانے میں چار دن بھی نہ لیے تھے اور اب وہ علینہ اور اسد کی صورت میں اپنے ایک نہیں بلکہ دو دو دشمنوں سے دشمنی نکال رہا تھا۔ پتا نہیں اسد کے ساتھ اس ذلیل آدمی نے کیا سلوک کیا تھا؟ اس بے چارے کو تو اس حقیقت کا علم بھی نہیں تھا کہ یہ گھٹیا شخص اس کے پیچھے پڑا تھا۔

بہتے اشکوں کے ساتھ علینہ کو مسلسل اسد کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ اسی حد تک کہ وہ خود اپنی ذات کو بھی فراموش کر گئی تھی۔ مگر جب گاڑی رکنے پہ اسے بند آنکھوں کے ساتھ، بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا گیا اور پھر اسی طرح پکڑ کے اندر کسی کمرے میں لے جایا گیا۔ تو اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے اپنی شدید بے بسی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اغوا کر کے علی شیر باران کے قدموں میں ڈال دی گئی تھی۔ جو اب جیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک کر سکتا تھا۔

آگہی کا یہ احساس اس قدر جان لیوا تھا کہ اس کے ہر مسام میں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ اسے اپنا دل بیٹھتا اور سر بری طرح چکراتا محسوس ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی کسی نے اتار دی تھی۔ روتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے بے قراری سے چاروں طرف دیکھنا چاہا تھا اور تب ہی اس کے کانوں سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز ٹکرائی تھی۔

"علینہ!" گلے ہی لمحے کوئی اس سے دوڑ کے آ لپٹا تھا۔

"فر، فریحہ تم؟" آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ خود سے لپٹی زار و قطار روتی فریحہ کو دیکھ کے

ساکت رہ گئی تھی۔

"تم' تم یہاں کیسے؟ اور اسد کہاں ہیں؟" اس نے فریحہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے متوحش نظروں سے اپنے پاس کھڑی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

"م' مجھے یہ لوگ کالج جاتے ہوئے راستے سے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں اور بھائی تو گھر پہ ہی تھے۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تو علینہ کا شل ہوتا ذہن ٹھٹک سا گیا۔

"اس' اس کا مطلب ہے کہ ہم دونوں یہاں۔۔۔"

"تنہا ہیں۔ اسد اعوان تو اب آئے گا میرے بندوں کا فون سن کے!" یکایک ان کے پیچھے ایک بھاری آواز ابھری تو علینہ نے ایک جھٹکے سے پلٹتے ہوئے اپنے پیچھے دیکھا تھا جہاں دروازے کے قریب کھڑا مسکراتا ہوا علی شیر یاران اس کا خون خشک کر گیا تھا۔

"صبح صبح تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے اکثر و بیشتر کسی ایک کی کرنی بہت سے بے گناہوں کو بھگتنی پڑ جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آج آپ دونوں خواتین کو ایک گھٹیا اور مکار انسان کا بویا کاٹنا پڑ گیا ہے۔"

کمرے میں کھڑی عورت کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اندر چلا آیا تو فریحہ خوف زدہ نظروں سے علی شیر کی جانب دیکھتی' علینہ کے قریب کھسک آئی۔ جبکہ سراسیمگی سے اس کا بشاش چہرہ تکتی علینہ کو اس کے الفاظ آگ لگا گئے تھے۔

"اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کم ظرف انسان! عورتوں کو تختہ مشق بنا کے اپنا مقصد حاصل کرنے والا گھٹیا اور مکار تو کیا سرے سے انسان ہی کہلانے کے لائق نہیں ہوتا!" نفرت سے اس کی جانب دیکھتی وہ کاٹ دار لہجے میں بولی تو علی شیر کے لبوں پہ کھیلتی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آپ واقعی کافی باہمت لڑکی ہیں علینہ! جو ان حالات میں بھی صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی جرأت رکھتی ہیں۔ میں آپ کے کہے سے سو فیصد متفق ہوں لیکن کیا ہے کہ میرا ایک اصول ہے جو آپ کے ساتھ جیسا سلوک کرے اس کے ساتھ ویسے ہی پیش آؤ تاکہ دوبارہ وہ کبھی آپ کو نقصان پہنچانا تو دور' آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔

اسد اعوان نے' آصف میر کے ساتھ مل کے میری عزت پہ وار کیا ہے۔ میں اگر چاہتا تو آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسے حوالات کی سیر کروا کے سچ بولنے پہ مجبور کر سکتا تھا' لیکن میں اسے یہ جتانا اور سکھانا چاہتا ہوں کہ علی شیر یاران کی عزت اور غیرت کو للکارنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے اور ویسے بھی کچھ حقیقتیں آپ پہ بھی منکشف کروانا ضروری تھیں' ورنہ میرا کام تو صرف اس کی بہن کو یہاں لا کے بھی پورا ہو سکتا تھا۔"

اس نے ایک نظر علینہ کے پہلو میں چپکی کھڑی' ڈری ہوئی فریحہ پہ ڈالی تو وہ مزید علینہ کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس کے نتیجے میں علینہ نے بے اختیار اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔ یوں جیسے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلانا چاہ رہی ہو۔

اس کی اس لاشعوری حرکت پہ علی شیر نے بڑی دلچسپی سے علینہ کے صبیح چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ جو خود بھی ان ہی حالات کا شکار تھی کہ جس میں فریحہ گرفتار تھی' مگر پھر بھی وہ بھرپور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بڑی بہن کی طرح اسد کی چھوٹی بہن کو خود سے لگائے کھڑی تھی۔ وہ واقعی خود سے جڑے ہر رشتے کی حفاظت کرنا خوب جانتی تھی۔

"اتنا تردد؟ اور وہ بھی میرے لیے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مسٹر علی شیر! آپ نے تو بڑے زعم سے کہا تھا کہ آپ دوسروں کی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے' پھر آج آپ کی اصول پسندی کہاں گئی؟"

اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ تو علی شیر محظوظ سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بے اختیار آگے بڑھ آیا۔

اس کے حرکت میں آتے ہی جہاں علینہ کا رنگ اڑا تھا وہیں وہ فریحہ کو ساتھ لگائے تیزی سے پیچھے ہٹی تھی۔

"مان گئے' بڑی مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی ہیں آپ۔۔۔ لیکن کاش کہ آپ کا ہونے والا ہم سفر بھی آپ کے لیے اتنا ہی باوفا ساتھی ثابت ہو سکتا جتنی کہ آپ اس کے لیے ہیں۔ وہ کتنے پانی میں ہے صرف یہی دکھانے کے لیے آج اپنے اصولوں سے انحراف کیا ہے۔۔۔ لگے ہاتھوں ایک کے بجائے اگر دو مقصد پورے ہو جائیں تو کیا برا ہے۔"

اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ علینہ کے چہرے پہ تنفر در آیا۔

"واقعی! شرفاء کی عزت سے کھیل جانے میں بھلا برائی ہی کیا ہے؟ کس قدر خود غرض شخص ہیں آپ۔ آپ کے نزدیک اہم ہے تو صرف آپ کی عزت اور آپ کے مقصد۔ باقی آپ کی وجہ سے چاہے کوئی زندہ درگور ہو جائے آپ کی بلا سے۔۔۔ آپ تو میرے تصور سے بھی بڑھ کے گرے ہوئے انسان نکلے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں۔۔۔"

الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ علی شیر نے ایک جست میں درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کے ایک جھٹکے سے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اس کی اس حرکت پہ جہاں فریحہ بے اختیار چیخی تھی۔ وہیں علینہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"بتاؤں میں گراوٹ کسے کہتے ہیں؟" وہ اسے اپنی مضبوط گرفت میں جکڑے برف سے ٹھنڈے لہجے میں غرایا تو علینہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں مارے دہشت کے پانی بھر آیا۔ وہ اس کے اس قدر قریب تھا کہ علینہ نے دیوانہ وار نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے اختیار اپنا چہرہ دائیں جانب موڑ لیا۔

"پلیز علی! مجھے چھوڑ دیں۔" بہتے اشکوں کے درمیان اس نے کپکپاتے لہجے میں استدعا کی تھی اور علی شیر کو اپنی ساری دہشت' ہوا میں دھواں بن کے اڑتی محسوس ہوئی تھی۔

بکھری لٹوں کے درمیان' چاند چہرے پہ چمکتے آنسو اور پسینے کے قطرے کانپتے لبوں پہ اس کا لمحہ بھر کا ماتم۔ وہ ایک پل کے لیے اس کے چہرے پہ سے نگاہیں ہٹانا بھول گیا تھا۔

"جاؤں سو جان سے اس طرز تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے' کیا آپ نے ارشاد کیا؟"

دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی ایک لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے علی شیر نے مخمور سے لہجے میں شعر پڑھا تو مارے ذلت کے علینہ نے روتے ہوئے اپنی آنکھیں اور لب سختی سے بھینچ لیے۔

اس کا یوں بے اختیار ہو کے رو پڑنا علی شیر کو بھی جیسے ہوش میں لے آیا تھا۔ اس کا یہ ڈرا سہما بے بس سا انداز اس پہ بالکل نہیں جچ رہا تھا۔ وہ تو سر اٹھائے باوقار انداز میں ہی بات کرتی اچھی لگتی تھی۔

اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے' نرمی سے علینہ کے بازو چھوڑ دیے تھے اور خود رخ موڑ گیا تھا۔ وہ حقیقتاً "اس لڑکی کی دل سے عزت کرتا تھا۔

"خود اعتمادی اچھی چیز ہے مس علینہ! لیکن حد سے بڑھی خود اعتمادی کبھی کبھی آپ کو مصیبت میں بھی گرفتار کروا دیتی ہے۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھیے گا۔" سپاٹ سے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

علینہ کے لیے مزید اپنی بے جان ٹانگوں پہ کھڑے رہنا ممکن نہ رہا۔

اگلے ہی پل وہ دو زانو زمین پہ گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے یوں روتا دیکھ کے فریحہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ اس کے اپنے آنسو اس لمحے بے اختیاری کے عالم میں بہہ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

ڈی سی کے آفس میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہاں موجود سب ہی افراد کی نظریں کمرے کے وسط میں کھڑے اسد اعوان پہ جمی تھیں۔ جو لب کچلتا اپنی ذلت و رسوائی کے لیے حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ جبکہ آصف میر دم سادھے پریشان نظروں سے اسد کا نچلا

ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

ابھی گھنٹہ پہلے ہی تو دونوں کی فون پہ بات ہوئی تھی اور اسد نے چہکتے ہوئے لہجے میں "سب ٹھیک ہے" کی نوید سناتے ہوئے، علی شیر کی متوقع جگ ہنسائی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کے ساتھ خوب اونچے اونچے قہقہے لگائے تھے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اسے چوکیدار نے وی سی صاحب کا پیغام دیتے ہوئے فوراً "ان کے آفس میں پہنچنے کے لیے کہا تھا اور جب وہ پُراعتماد چال چلتا ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اندر کا منظر اس کے اوسان خطا کر گیا تھا۔

صوفے پہ وی سی اور چیئرمین کے برابر کرو فر سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا علی شیر یاران اور کمرے کے وسط میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا اسد اعوان ایک پل کے لیے تو اسے اپنی نظر کا دھوکا محسوس ہوئے تھے۔ لیکن جوں ہی اصغر صاحب نے اسے اندر آنے کے لیے کہتے ہوئے مغیث اور داور کے برابر میں جگہ سنبھالنے کے لیے کہا تھا، وہ حیران سا، سارے منظر کو بے یقین نظروں سے دیکھتا ہوا صوفے پہ آبیٹھا تھا۔

بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے متفکر نگاہوں سے اسد کا چہرہ دیکھا تھا جو لب کاٹتے ہوئے نجانے کس گہری سوچ میں غرق تھا کہ اس نے ایک بار بھی آصف کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کا انداز چیخ چیخ کر ان کی ہار کا اعلان کر رہا تھا۔ کب؟ کیسے؟ آصف کا شل ہوتا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔

"جی اسد اب کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

وی سی نے ایک نظر آصف پہ ڈالتے ہوئے اسد کی جانب دیکھا تو اس کا سائیں سائیں کرتا دماغ بالکل خالی سا ہو گیا۔ نگاہیں اٹھاتے ہوئے اس نے خالی نظروں سے سامنے موجود علی شیر کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ یہ آخری لمحوں میں کیا ہو گیا تھا؟ بازی کیونکر اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی؟ وہ فاتح سے مفتوح کیسے بن گیا تھا؟

بے اختیار اس کے ذہن کی خالی اسکرین پہ گھنٹہ بھر پیشتر کا واقعہ روشن ہوا تھا، جب وہ سرشار سا آصف سے بات کرنے کے بعد یونیورسٹی آنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ معاً "رخشندہ بیگم کی چیخ و پکار نے اسے بوکھلا کے لاؤنج کی جانب بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

روتی پیٹتی ماں اور فون کان سے لگائے بے یقین کھڑے اکبر اعوان نے اس کے قدموں میں بجلی بھر دی تھی۔ بستر سے دوڑ کے آتی فروا بھی نا سمجھی کے عالم میں ماں کا بازو تھامے پریشان سی کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کس کا فون ہے؟" کہتے ہوئے اس نے ریسیور باپ کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگایا تھا اور دوسری جانب بلکتی ہوئی فریحہ کی آواز سن کے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"ڈیڈی! پلیز ڈیڈی! مجھے بچالیں۔ یہ یہ لوگ۔۔۔"

بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا گیا تھا۔

"ہیلو! ہیلو فری۔" اسد نے دیوانہ وار بہن کو پکارا تھا۔ تب ہی دوسری طرف سے ایک انجانی آواز ابھری تھی۔

"بہن کی سلامتی چاہتے ہو تو سیدھا وی سی کے آفس میں جا کے ساری سچائی بیان کر دو اور اگر تم نے اپنے کسی بھی حمایتی کو مطلع کرنے کی غلطی کی تو نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے!"

اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی اور اسد کے لیے ساری صورت حال پہ یقین کرنا اور پھر گھر والوں کو سمجھانا از حد مشکل ہو گیا تھا۔ جن کا اشتعال آدھی ادھوری بات سن کے ہی قابو سے باہر ہو گیا تھا۔

اکبر اعوان نے زندگی میں پہلی بار اکلوتے بیٹے پہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ جس کی غلط روش نے آج ان کی عزت کو داؤ پہ لگا دیا تھا۔ اندھا دھند گاڑی دوڑاتے وہ اگلے پندرہ منٹ میں یونیورسٹی میں تھا۔ وی سی کے آفس میں قدم رکھتے ہی اس کی پہلی نظر مکمل اطمینان سے بیٹھے علی شیر پہ پڑی تھی اور اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ علی شیر یاران جو کچھ کہتا ہے "حقیقتاً" بہت سوچ سمجھ کے کہتا ہے اور اب وہ اس کے کہے کے عین مطابق، اسی جگہ پہ، اپنے میر صاحب کے رچائے ارامے پہ سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ اپنے جلن اور حسد کے ہاتھوں تم اتنا گر جاؤ گے آصف! کہ نہ صرف تم یاران صاحب کی عزت سے کھیل گئے بلکہ مغیث کی زندگی، اس کا کیریئر تک تم نے داؤ پہ لگا دیا۔ آج اگر علی شیر اس اسد اعوان سے سچ نہ اگلواتے تو میں تو مغیث احمد کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے والا تھا۔

یاران صاحب تم پہ دھوکا دہی کا کیس کرتے ہیں یا نہیں، مگر میں تم پہ اس یونیورسٹی کا ماحول خراب کرنے اور یہاں شرپسندی پھیلانے کے چارجز لگا کے یہاں سے فارغ کرتا ہوں۔"

اسد کے منہ سے ساری حقیقت سن کے اصغر صاحب کسی آتش فشاں کی طرح، ساکت کھڑے آصف میر کے سر پہ پھٹے تھے۔ جس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں بچا تھا۔

علی شیر یاران کو زمین کی دھول چٹوانے کے چکر میں وہ خود اپنا بوریا بستر یہاں سے گول کروا بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنے سب سے بڑے حریف کے سامنے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسد اعوان کو گولیوں سے بھون ڈالتا، جس نے نہ صرف اس کی اتنے سالوں کی محنت کو مٹی میں ملا ڈالا تھا بلکہ اسے اپنی پارٹی کی ساری قیادت کے سامنے جوابدہ بھی بنا دیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے غداری بہت مہنگی پڑے گی اسد! بہت مہنگی۔" وہاں موجود لوگوں کی پروا کیے بنا وہ انتہائی سرد لہجے میں خاموش کھڑے اسد کو دھمکی دیتا، ایک جھٹکے سے پلٹ کے باہر نکل گیا تھا اور ساکت کھڑے اسد کی رنگت متغیر ہو چلی تھی۔

"سر پلیز، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ یقین جانیں میں نے یہ سب آصف کے مجبور کرنے پہ کیا تھا، ورنہ میں تو اس پلان کے نہ صرف خلاف تھا بلکہ میں نے اسے یہ قدم اٹھانے سے منع بھی کیا تھا۔ آپ چاہیں تو میری اس بات کی تصدیق فرحان، عمر اور واحد سے بھی کروا سکتے ہیں۔ وہ تینوں بھی اس وقت وہیں تھے۔ پلیز، پلیز سر میں بہت بہت شرمندہ ہوں۔

سر پلیز! مجھے معاف کر دیں، میں مجبور کر دیا گیا تھا۔ اب بھی آپ سب کے سامنے وہ مجھے دھمکی دے کے گیا ہے۔ کیا یہ میری بات کی تصدیق کے لیے کافی نہیں؟"

وہ چہرے پہ دنیا بھر کی مسکینی طاری کرتے ہوئے بولا

"ہوں، ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں نہ صرف مغیث سے بلکہ یاران صاحب سے بھی معافی مانگنی پڑے گی۔"

وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے بولے تو اسد کے مرجھائے ہوئے چہرے کی رنگت قدرے بحال ہو گئی۔

"میں، میں دونوں سے معافی مانگوں گا۔"

"مجھے اس کی معافی کی ضرورت نہیں اصغر صاحب!" علی شیر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"ہاں! لیکن یہ مغیث سے سارے اسٹوڈنٹس اور اسٹاف کے سامنے معافی مانگ کر اپنے جھوٹ کا اعتراف کرے گا۔" اس نے اک نگاہ غلط اسد پہ ڈالے بنا اصغر صاحب سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسد کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے! مجھے منظور ہے۔" سر جھکائے وہ دھیرے سے بولا تو علی شیر کے لبوں پہ اک فاتحانہ مسکراہٹ در آئی۔

وہ الوداعی کلمات کہتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے یوں بے نیازی سے سب کے ساتھ آگے بڑھتا دیکھ کے اسد نے پریشانی سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا۔

لب کچلتے ہوئے اس نے نا سمجھی کے عالم میں خالی پڑے آفس پہ اک نظر ڈالی تھی اور تب ہی اس کی جیب میں پڑا موبائل بج اٹھا تھا۔

تیزی سے سیل نکالتے ہوئے اس نے اسکرین پہ جگمگاتے انجان نمبر کو دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ "ویلیں"

کا بٹن دبا تا فون کان سے لگا گیا تھا۔

"اپنی گاڑی کے پاس پہنچو' وہاں دو آدمی تمہارے منتظر ہیں۔" بھاری لہجے نے اسے ہدایت جاری کرتے ہوئے کال ڈسکنیکٹ کر دی تو اسد تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب چلا آیا' جہاں اپنی گاڑی کے قریب دو انجان بندوں کو کھڑا دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا۔

"چابی دو!" اس کے قریب پہنچنے پہ ایک نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو اسد نے خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چابی نکال کے اس کے حوالے کر دی۔

پچھلی سیٹ پہ اسے' دوسرے آدمی کے ساتھ بٹھا کے پہلے نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔

☆ ☆ ☆

"چلو اٹھو بی بی' صاحب نے تم دونوں کو بلایا ہے۔"

گھڑی دوپہر کے ڈیڑھ بجا رہی تھی' جب وہی صبح والی عورت دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس کے اس نئے حکم پہ علینہ اور فریحہ نے بیک وقت ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' وہ خوف زدہ نظروں سے ارد گرد دیکھتی اس کے پیچھے چل پڑی تھیں' جو انہیں سیڑھیوں اور راہداری سے لیتی ہوئی ایک ہال میں داخل ہوئی تھی۔

"صاحب جی! بی بیاں آ گئی ہیں۔" اس کی اطلاع پہ جہاں ان دونوں نے اپنی سہمی ہوئی نگاہیں اٹھائی تھیں' وہیں کاؤچ پہ براجمان علی شیر نے اپنے سامنے اور اس کے مقابل کھڑے اسد نے بے تابی سے پلٹ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور فریحہ کے ساتھ کھڑی علینہ کو دیکھ کے وہ مارے حیرت کے گنگ ہو گیا تھا۔

"علینہ! تم یہاں؟"

"اسد! بھائی!" وہ دونوں اسے اپنے سامنے پا کے بے قراری سے آگے بڑھی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں زور و شور سے برسنے لگی تھیں۔

فریحہ تڑپ کے بھائی کے سینے سے آ لگی تھی' جبکہ علینہ نے روتے ہوئے اس کے بازو سے اپنا چہرہ ٹکا دیا تھا۔

"کہو! کیسا لگا سرپرائز' اسد اعوان؟" بری طرح الجھے ہوئے اسد کو علی شیر نے سوچوں سے نکالا تو وہ پریشان نظروں سے اس کا مطمئن چہرہ دیکھنے لگا۔ اتنا تو وہ اب تک جان ہی چکا تھا کہ علی شیر جیسا بندہ کوئی بھی کام بنا سوچے سمجھے نہیں کرتا تھا۔

علینہ کی یہاں موجودگی کے پیچھے بھی یقیناً اس کا کوئی مقصد تھا' کیا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر اک ایک اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہاری طرف کچھ پچھلا حساب کتاب بھی ہے۔" علی شیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو اسد کی آنکھوں میں پھیلی پریشانی میں گھبراہٹ بھی آن ملی۔

"علینہ فصیح اسی حساب کی کڑی ہے۔" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تو اسد کے ساتھ ساتھ علینہ کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

"ک۔ کیا مطلب؟" کوشش کے باوجود اسد اپنے لہجے کو لڑکھڑانے سے روک نہ سکا تھا۔

"مطلب بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ پہلے آپ دونوں تو وہاں چل کے بیٹھیں نا!" اس نے اچانک اسد سے لگی کھڑی لڑکیوں سے کہا تو دونوں چند لمحوں کی پس و پیش کے بعد ناچار صوفے پہ جا ٹکیں۔

"جی تو اسد صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ آج آپ نے ڈی سی کے آفس میں آصف میر کا پردہ فاش کر کے کن لوگوں کی دشمنی مول لی ہے؟" اس نے اسد کے چہرے پہ نگاہیں جمائے بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا تو اسد بے اختیاری کے عالم میں اپنا نچلا لب کاٹتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گیا۔

"لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اور آپ کی فیملی کو ان سے قانونی سیکیورٹی فراہم کر سکتا ہوں۔" وہ اس کی جانب دیکھتا پرسکون لہجے میں بولا تو اسد کی

آنکھوں میں بے یقینی سی حیرت در آئی۔

"مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔" وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ تو دور بیٹھی علینہ کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"کیسی شرط؟" اسد نے بے چینی سے پوچھا تو علی شیر کے چہرے پہ سنجیدگی در آئی۔

"آپ کو دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی آج رات کے لیے یہاں چھوڑ کے جانی پڑے گی۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بنا کسی جھجک کے گویا ہوا تو مارے وحشت کے علینہ اور فریحہ کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ جبکہ اسد کا چہرہ پہلے سفید اور پھر تیزی سے سرخ ہوا تھا۔

"تم' تم۔ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔" اسے مٹھیاں بھینچتے دیکھ کے علی شیر نے بے اختیار ٹوک دیا۔ "اور ویسے بھی صرف ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ صبح آپ کی لڑکی آپ کو مل جائے گی اور آصف میر سے بھی ہمیشہ کے لیے آپ کی گلو خلاصی کروا دی جائے گی۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بولا تو اسد کی بند مٹھیاں اور تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔

اس کے بدلتے تاثرات پہ جہاں علی شیر کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی' وہیں اس کی جانب سے کسی شدید رد عمل کی منتظر علینہ اور فریحہ کو اس کی خاموشی' بے یقینی کے گہرے کنویں میں دھکیل گئی تھی۔

"اور اگر میں آپ کی مدد لینے سے انکار کر دوں تو؟" اسد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا تو علی شیر کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"نو پرابلم۔ دونوں لڑکیاں گھر پہنچا دی جائیں گی۔ لیکن تب آپ کو میں چند اہم شرائط کے بدلے میں آغا فیروز اور آصف میر کے حوالے کر دوں گا۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے سفاکی سے مسکرایا تو اسد کے چہرے پہ خوف نے اپنے پنجے گاڑ دیے۔

بہ مشکل تمام اپنے خشک پڑتے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے اس نے ایک پریشان سی نظر صوفے پہ بیٹھی علینہ اور فریحہ پہ ڈالی تھی۔ جن کے چہرے دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید اور آنکھیں پتھر کی طرح اس کے وجود پہ جمی تھیں۔

"میں' میں آپ کی مدد لینے کے لیے تیار ہوں۔" چند لمحے ان کی جانب دیکھنے کے بعد وہ آہستگی سے نظریں چراتا علی شیر کی طرف رخ موڑ گیا تو فریحہ کا ہاتھ اپنی چیخ کا گلا گھونٹنے کے لیے لبوں پہ آن ٹھہرا۔ جبکہ علینہ اپنے محافظ کے اس فیصلے پہ اس حد تک شاکڈ ہوئی تھی کہ اس کا ذہن بالکل خالی اور جسم مکمل طور پہ سن ہو گیا تھا۔

"ویری گڈ!" علی شیر کے لبوں کے ساتھ ساتھ پورا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ "تو پھر آپ کسے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے؟" وہ دونوں لڑکیوں پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے اسد کی جانب پلٹا۔

"ف' فریحہ کو!" الفاظ تھے یا کوئی بم۔ علینہ کو اپنا وجود ایک دھماکے سے اڑتا محسوس ہوا تھا۔

"منگیتر کو چھوڑ رہے ہیں؟" اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے جو فیصلہ کیا ہے' سوچ سمجھ کے کیا ہے۔ علینہ میری عزت تھی' ہے اور رہے گی۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں' سو ہر حال میں اپناؤں گا۔ فریحہ کو اگر یہاں چھوڑ دوں تو کل اسے کون اپنائے گا۔"

"یعنی آپ ماں' بہن' بیوی سب کو بیچنے کے لیے تیار ہیں' ایک صرف خود کو بچانے کے لیے؛ آپ جیسا بیچ اور خود غرض آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ سے اچھے تو وہ دلال ہیں جو کھلے عام یہ کام۔۔"

علی شیر نے پھر اس کی تذلیل کی۔ آنکھوں میں شرمندگی کا گہرا احساس لیے وہ علینہ کی جانب پلٹا جو اس وقت بے ایک ہی پوزیشن میں ساکت بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

کچھ کہنے کی خواہش میں اسد نے الفاظ ترتیب دینا چاہے تھے۔ مگر لب کاٹتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ علی شیر اس دوران سینے پہ بازو باندھے مکمل خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"یاران صاحب' آپ پلیز ہمیں گھر بھیج دیں۔" وہ علی شیر کی جانب پلٹتے ہوئے بولا تو وہ قصداً" اسے جتانے کو دھیرے دھیرے چلتا علینہ کے پاس صوفے پہ آبیٹھا۔

"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے اسد صاحب!" ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ صوفے کی پشت پہ بازو پھیلا گیا۔

"جی!" نظریں چراتا وہ بے اختیار رخ موڑ گیا تو علی شیر کے لب مسکرا دیے۔

"نور الٰہی۔" اس نے با آواز بلند پیچھے کھڑے ملازم کو پکارا تو وہ سرعت سے آگے بڑھ آیا۔

"جی صاحب۔"

"اسد صاحب اور ان کی بہن کو ان کی گاڑی تک پہنچا دو۔" وہ ایک نظر پتھرائی ہوئی علینہ پہ ڈالتے ہوئے سامنے کھڑے اسد کی جانب متوجہ ہوا۔

"ایک بات اور یہاں سے جانے کے بعد کسی قسم کی ہوشیاری کرنے کی غلطی مت کرنا نہ ہی علینہ کے والدین سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے...... آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ سمجھے!" وہ اسے تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"جی!" اسد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے روتی ہوئی فریحہ کا ہاتھ تھاما اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا تو علینہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جمی نمی قطرہ قطرہ اس کے چہرے پہ بہہ نکلی' وجود میں البتہ اب بھی کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔

اس کا مان' یقین کیا بکھرا تھا' اس کے سوچنے' سمجھنے اور بولنے کی طاقت بھی جیسے سلب ہو گئی تھی۔

ان کے ہال سے نکلتے ہی چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ علی شیر نے ایک ملال بھری نظر ذرا فاصلے پہ بیٹھی آنسو بہاتی علینہ پر ڈالی تھی اور پھر بے اختیار لب بھینچ گیا تھا۔

دل سے جڑی ہستیاں جب آپ کی آنکھوں میں موجود یقین اور روح میں بستے مان کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں تو انسان غم اور بے یقینی کے کسی سمندر میں خود کو غرق محسوس کرتا ہے' وہ اس اذیت سے بخوبی واقف تھا۔

اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے' اس نے ہاتھ کے اشارے سے وہاں موجود ملازمین کو باہر جانے کے لیے کہا تھا اور پھر دھیرے سے خود سے بھی بیگانہ بیٹھی' علینہ کی جانب رخ موڑا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اسد اعوان جیسا سطحی اور گرا ہوا انسان کسی بھی طرح آپ کے لائق نہیں۔" اس کی آنکھوں سے بہتے اشکوں پہ نگاہیں جمائے وہ نرم لہجے میں بولا تو ساکت بیٹھے بت میں جیسے دھیرے سے جان پڑ گئی۔

اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو علی شیر کتنی ہی دیر تاسف بھری نظروں سے اس کے لرزتے وجود کو دیکھتا رہا' جو نجانے کس کس یاد کس کس احساس کو رو رہی تھی۔

"آپ میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہیں' مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن میں کل بھی دل سے آپ کی عزت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔ میری نیت میں آپ کے حوالے سے نہ کل کوئی کھوٹ تھا اور نہ آج کوئی کھوٹ ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا' جو کچھ بھی کہا' وہ صرف ایک گھٹیا شخص کی گھٹیا اور خود غرض سوچ کو آپ پہ واضح کرنے کے لیے کیا۔ یہ بتانے کے لیے کیا کہ کم از کم آپ سے میں نے اپنے احساسات ______ کے بارے میں غلط بیانی نہیں کی۔

میں جانتا ہوں کہ اسد اعوان کو پرکھنے کے اس چکر میں آپ کو بہت درد' بہت تکلیف سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن یقین مانیں علینہ! یہ اذیت اس تکلیف سے بدرجہا بہتر ہے' جو آپ کو اس کی شریک حیات بن کے قدم قدم پہ جھیلنی پڑتی لیکن تب واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہوتا اور پتا نہیں کیوں لیکن میں آپ کو کسی بند گلی کا مسافر بنتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

وہ دھیرے دھیرے بولتا نظریں چرا گیا تو علینہ جو پہلے ہی جذباتی اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی' ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے چلا اٹھی۔

"میں اب بھی ایک بند گلی میں ہی آکھڑی ہوئی ہوں علی شیر یاران! تم مجھے یہاں اٹھا کے لائے ہو' یہ اور کچھ نہیں۔" اس کی بات پہ چاہتے ہوئے بھی علی شیر کی پیشانی پہ شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

"میں نے اگر آپ کو ایک بند گلی میں لا کھڑا کرنا ہوتا تو یہ ساری کارروائی کل رات کو کرواتا' آج صبح آپ کے یونیورسٹی آنے اور آپ کے ڈرائیور کے چلے جانے کے بعد نہیں۔ اسد اعوان اور آصف میر کو اگر میں نے کل شام کی مہلت دی تھی تو صرف آپ کی وجہ سے اور اب بھی اگر میں نے اسے' آپ کے پیرنٹس سے کچھ نہ کہنے کی ہدایت دی ہے تو صرف آپ کے لیے کیونکہ آپ کی فیملی کو تو پتا بھی نہیں کہ آپ یونیورسٹی نہیں پہنچیں۔"

علینہ اس کے منہ سے یہ ساری تفصیل سن کے آنسو بہانا بھول گئی تھی۔ اس کی سرخ متورم آنکھوں میں چھائی حیرت علی شیر کو اک گہرا سانس لینے پہ مجبور کر گئی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا علینہ! کہ آپ کو یہاں کچھ حقیقتیں واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے' اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہ تھا۔ میں کسی دوسرے کو آپ کو دھوکا دیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا تو کیا خود آپ کو رسوا کروں گا؟ میں بہت برا انسان سہی لیکن خود سے جڑے رشتوں کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس کی جانب لودیتی نگاہوں سے تکتے ہوئے علی شیر نے اس کی بات کا حوالہ دیا تو دم سادھے بیٹھی علینہ اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس سے بھلا اس کا کیا رشتہ تھا؟

"اب آپ پلیز اٹھیں اور منہ ہاتھ دھو کے اپنی حالت درست کریں۔ تاکہ میرا ڈرائیور آپ کو وقت پہ یونیورسٹی واپس پہنچا سکے۔" بجھے لہجے میں کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تو علینہ کے مردہ تن میں جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی۔ کیا دعائیں ایسے بھی مستجاب ہوا کرتی ہیں؟ اس کی بے یقینی عروج پہ تھی۔

"فیروزہ!" علی شیر نے پلٹ کے کسی کو پکارا تو وہی صبح والی عورت دروازہ کھول کے اندر چلی آئی۔

"بی بی کو باتھ روم لے جاؤ اور ان کی چیزیں ان کے حوالے کرو اور فیاض سے کہو کہ گاڑی نکالے۔" وہ علینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکمیہ لہجے میں بولا۔

"چلیں بی بی۔"

علینہ اپنے ساتھ پیش آنے والے معجزے کو پوری جان سے محسوس کرتی اپنے رب کا شکر بجالائی۔

"جائیں علینہ! وقت خاصا کم ہے۔" اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے علی شیر نے نرمی سے اسے احساس دلایا تو وہ اپنے سامنے کھڑے شخص کو گہری نظروں سے دیکھتی آگے بڑھ گئی' جو اس کا محسن تھا یا گناہ گار' وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

واپسی کا سفر جیسے کسی خواب کے گمان میں طے ہوا تھا۔ علی شیر یاران کے ڈرائیور سے کہہ کے اس نے گاڑی یونیورسٹی سے تھوڑی دور رکوائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے کسی اجنبی کی گاڑی سے اترتا دیکھ کے غلط مطلب نکالے۔

گاڑی سے اتر کے وہ تیز قدموں سے یونیورسٹی کی جانب چل دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بار بار بھر آرہی تھیں۔ جنہیں ٹشو سے پونچھتے وہ مسلسل خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر درد اتنا شدید تھا کہ اس کی ہمت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹوٹتی چلی جارہی تھی۔

بالآخر خود کو گھسیٹتی وہ پارکنگ میں پہنچی تو نظر سیدھی اپنی مخصوص جگہ پہ کھڑی مانوس ریڈ کار اور ڈرائیور پہ جا ٹکی۔

آنکھوں میں پھیلتی نمی میں یک لخت تیزی محسوس کرکے علینہ نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑتے ہوئے اک گہرا سانس لیا تھا اور پھر تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب چلی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دوپہر گھر پہنچنے پہ اس نے اپنی دگرگوں حالت کو

طبیعت خرابی کا نام دیتے ہوئے اپنے کمرے کی راہ لی تھی۔ جس کے بعد اسے اب کہیں جا کے اپنی پیشانی پہ محسوس ہونے والے ٹھنڈے ٹھنڈے نم احساس کے زیر اثر ہوش آیا تھا۔

آنکھیں کھولنے پہ اسے ماں کا متفکر چہرہ نظر آیا تھا جو اس پہ جھکی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کے بے اختیار انہوں نے شکر کا سانس لیا تھا۔

"امی! پانی۔" خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا تو صوفیہ بیگم نے پاس رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالا۔ پھر اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" تھوڑا سا پانی پی کے اس نے گلاس پیچھے کر دیا۔ صوفیہ بیگم نے نرمی سے اس کے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بیڈ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے نقاہت سے بولی۔

"صبح تمہارے بابا نے منع بھی کیا تھا کہ آج یونیورسٹی جانے کی ضرورت نہیں' اب دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ۔ اتنا تیز بخار تھا کہ مجھے بالآخر تمہارے بابا کو گھر بلوانا پڑا۔"

وہ اس کی کمر کے پیچھے تکیہ رکھتے ہوئے بولیں تو یونیورسٹی کے نام پہ علینہ کا سویا ہوا ذہن جیسے جاگ سا گیا۔ ساتھ ہی وہ تلخ ترین واقعہ اپنی پوری جزئیات سمیت دماغ کی اسکرین پہ روشن ہوا تو اس کی بوجھل آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

اس کے مشفق ماں باپ' اس کی ذرا سی طبیعت خرابی پہ اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور اگر جو آج اس کی واپسی نہ ہوتی تو نجانے ان دونوں کا کیا حال ہوتا؟ اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو وہ بے اختیار اپنا لب دانتوں تلے دبا گئی تھی۔

"اسد اعوان! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں!" دل ہی دل میں خود سے عہد کرتے ہوئے اس نے اپنے اندر اٹھتے درد کے طوفان کو بمشکل تمام برداشت کیا تھا اور پھر دھیرے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

تنہائی میسر آتے ہی' علینہ نے بیگ میں پڑا اپنا موبائل نکال کے کمرے کا دروازہ لاک کیا۔

اسد کا نمبر ملاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگا لیا تھا۔ چند بیلوں کے بعد کال ریسیو ہوتے ہی اسد کی بے چین آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہیلو' کون' کون بول رہا ہے؟" وہ جانتا تھا کہ علینہ کا بیگ اور موبائل اس کے پاس نہ تھا۔ جب ہی اس کا نمبر اسے الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔

"میں ہوں علینہ!" شعلے برساتی نگاہیں اس کے ہیولے پہ جمائے وہ سرد لہجے میں بولی تو دوسری طرف موجود اسد بری طرح چونک گیا۔

"تم؟ کہاں' کہاں سے بات کر رہی ہو تم؟"

"اپنے گھر سے۔" وہ اپنے سابقہ انداز میں بولی تو اسد کی سٹی گم ہو گئی۔

"گھر؟ تم اس وقت گھر کیسے پہنچیں؟"

"کمال ہے بجائے میری خیریت پوچھنے کے تم یہ پوچھ رہے ہو کہ میں اس وقت گھر کیسے پہنچی؟" تلخ لہجے میں بولتے ہوئے اس نے اس وقت پہ زور دیتے ہوئے کہا تو دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"او ہاں' یاد آیا تم تو میرا رات بھر کے لیے سودا کر کے آئے تھے ناں۔۔۔ اسی لیے تمہیں پریشانی ہو رہی ہے کہ کہیں علی شیر یاران ڈیل کینسل کر کے تمہیں آصف میر کے حوالے نہ کر دے۔" وہ زہر خند سی بولی تو اسد خفت زدہ لہجے میں بولا۔

"ن' نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تم نے جو ذلیل حرکت آج میرے ساتھ کی ہے' جس طرح میرا مان' میرا یقین بکھیر کے اپنی جان کے بدلے میں میری عزت گروی رکھی ہے' اس طرح تو کوئی بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی نہیں کرتا۔ میں پوچھتی ہوں' تمہیں یہ سب کرتے ہوئے ذرا سا بھی خوف خدا محسوس نہیں ہوا؟ تھوڑی سی بھی شرم نہیں آئی؟" بات کرتے ہوئے آنسو ایک بار پھر اس کے زرد چہرے کو بھگونے لگے تھے۔

"شرم کیسی؟ بیوی کا فرض ہے اپنے شوہر کے کام آنا' مشکل وقت میں اس کا ساتھ دینا۔ اب آخر میں بھی تو تمہیں اپناؤں گا ناں!" وہ شرمندہ ہوئے بنا انتہائی ڈھٹائی سے کہتا آخر میں اسے جتانے کو طنزیہ لہجہ اختیار کر گیا تو علینہ کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"تم اگر دنیا میں بچنے والے آخری انسان بھی ہوتے ناں اسد اعوان! تب بھی میں تمہیں اپنانا تو دور' تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ ویسے بھی اللہ کے فضل سے میں اپنے گھر سے جیسے گئی تھی ویسے ہی لوٹی ہوں اور وہ بھی دن کے اجالے میں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" اسد کی آواز میں ناقابل یقین سی حیرت در آئی تھی۔

"دیکھ لو! معجزے آج بھی ہوتے ہیں۔ لیکن صرف نیک اور مخلص لوگوں کے ساتھ۔ تم نے تو فرعون بن کے اپنے تئیں میری قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ مگر اللہ نے نہ صرف میری آج حفاظت کی بلکہ تمہاری اصلیت اور کمزوری کی انتہا دکھا کے میرے کل کو بھی محفوظ بنا دیا اور میں جو کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ کب تمہاری ترجیحات میں میرا نام اول نمبر پہ آئے گا اب یہ جان کے مطمئن ہوں کہ تم جیسے بے غیرت' خود غرض اور بزدل انسان سے کم از کم اب میرا کوئی تعلق' کوئی واسطہ نہیں۔" وہ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی تو دوسری طرف حیران پریشان سا اسد بوکھلا گیا۔

"پلیز پلیز علینہ ایسے مت کہو۔ دیکھو میں اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں۔ میں اس وقت گھبرا گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے محبت۔۔۔"

"محبت کا نام مت لینا اسد! یہ لفظ تمہاری زبان پہ جچتا نہیں۔" اس نے انتہائی سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ ڈالی تو وہ چپ کا چپ رہ گیا۔

"اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری ذلالت کی یہ داستان صرف مجھ تک محدود رہے تو کل اپنے ماں باپ کے ساتھ میرے گھر آ کے' منگنی کی انگوٹھی بابا کے حوالے کر دو' یہ کہہ کے کہ اب تم کسی اور لڑکی میں انٹرسٹڈ ہو گئے ہو۔"

اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے سابقہ ٹھنڈے اور سپاٹ لہجے میں بولی تو اسد نے بے اختیار اپنا نچلا لب کاٹ ڈالا۔

"اور کل کا مطلب ہے کل مسٹر اسد! ورنہ مجبوراً مجھے اپنے پیرنٹس کو ساری حقیقت سے آگاہ کرنا پڑے گا' جو میرے خیال میں آپ جیسا نیک نام بندہ افورڈ نہیں کر سکے گا۔"

ترشی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے علینہ نے اسد کے جواب کا انتظار کیے بنا لائن کاٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فصیح صاحب نے پریشان نظروں سے ٹیبل پہ رکھی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے ایک نظر ساتھ بیٹھی صوفیہ بیگم کے زرد چہرے پہ ڈالی تھی جو متوحش نگاہوں سے انہی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے کیا ہماری عزت کو کھیل سمجھ رکھا ہے یا میری بیٹی اتنی فالتو ہے کہ جب دل چاہا رشتہ جوڑ لیا اور جب دل بھر گیا تو رشتہ توڑ دیا؟ میں نے اپنی بیٹی تمہیں پلیٹ میں رکھ کے پیش نہیں کی تھی۔ تم لوگ خود چل کے یہاں اس کا ہاتھ مانگنے آئے تھے' پھر تمہاری جرأت کیسے ہوئی' کسی اور لڑکی کی جانب دیکھنے کی؟ کیا یہی شریف لڑکوں کا وتیرہ ہوا کرتا ہے؟"

ان کا چہرہ مارے غضب کے انگارے کی طرح دہک اٹھا تھا۔ جبکہ دل تو کر رہا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے اس بے شرم لڑکے کا منہ نوچ لیں جو کتنی دیدہ دلیری سے ان کے روبرو بیٹھا اپنا نئے معاشقے کا اعتراف کر رہا تھا۔

اسے یوں سب کے درمیان سر جھکائے لعن طعن سنتا دیکھ کے علینہ کو اپنے اندر جلتی آگ پہ ٹھنڈے

ٹھنڈے سے چھینٹے پڑتے محسوس ہوئے تھے۔

"دیکھ رہے ہو اکبر! اپنے بیٹے کے کرتوت۔ یہ کس بے شرمی سے ہمیں اپنے نئے عشق کی داستان سنا رہا ہے۔ کبھی تم نے اتنی بے غیرتی، اتنی جرأت دیکھی یا سنی ہے کہیں؟" وہ یک لخت اکبر اعوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تو وہ شرم سے زمین میں گڑ سے گئے۔

"میں کیا کہوں فصیح! اس لڑکے نے تو مجھے تمہارے سامنے نظریں اٹھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ کہاں تو دن رات اس نے علینہ کے نام کی رٹ لگائی ہوئی تھی اور اب یہ اچانک ..." انہوں نے طیش سے بھرپور نظر بیٹے کے جھکے سر پہ ڈالی جو اپنے ہاتھوں پہ نگاہ جمائے، سختی سے لب بھینچے بیٹھا تھا۔

"مانا کہ اسد سے غلطی ہوئی ہے لیکن اگر وہ چاہتا تو آپ سے جھوٹ بول کر بھی یہ رشتہ ختم کر سکتا تھا۔ مگر یہ اس کی شرافت ہے کہ وہ یہاں نہ صرف خود چل کے آپ کو پوری سچائی بتانے آیا ہے بلکہ کب سے چپ چاپ بیٹھا آپ کی بری بھلی بھی برداشت کر رہا ہے۔"

"بہت شکریہ آپ کے عظیم بیٹے کا جو اس نے یہاں آنے کی زحمت فرمائی، ورنہ اگر آپ کے بس میں ہوتا تو آپ تو شاید ہمیں فون پہ بھی انکار کرنے کا تکلف نہ فرماتیں۔" انہوں نے زندگی میں پہلی بار ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے رخشندہ بیگم کو جواب دیا تو وہ جلبلا اٹھیں۔

"آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" فصیح الحسن کاٹ دار لہجے میں بولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو رخشندہ اعوان ایک جھٹکے سے جبکہ اکبر صاحب دل گرفتی سے انہیں دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

صوفیہ اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو بے اختیار لبوں پہ ہاتھ رکھ گئیں۔ لیکن علینہ کی آنکھوں میں نہ تو کوئی آنسو چمکا تھا اور نہ ہی چہرے پہ کوئی تاثر چھلکا تھا۔

اس کے وجود سے مترشح ہوتی بے گانگی کو دیکھتے ہوئے اسد بھی اپنی جگہ سے دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا فصیح!" اکبر صاحب بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ان کی اس معذرت پہ اسد کی نظریں بے اختیاری کے عالم میں لب بستہ کھڑی علینہ کی جانب اٹھی تھیں، لیکن وہاں وہی جامد سناٹا پا کے وہ بھاری قدموں سے اپنے ماں باپ کے پیچھے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

علی شیر آفس میں بیٹھا تھا جب اس کے پی اے نے اسد اعوان کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

"کم ان۔" دروازے پہ ہونے والی دستک کے نتیجے میں اس نے با آواز بلند آنے والے کو اجازت دی تو اسد دروازہ دھکیلتا اندر چلا آیا۔

علی شیر نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ سے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"فرمایئے، کیسے زحمت کی؟" اس نے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے اپنے بازو ٹیبل پہ ٹکاتے ہوئے قصداً انجانا لہجہ اختیار کیا تو اسد جو گہری نظریں علی شیر کے چہرے پہ جمائے ہوئے تھا دھیرے سے بولا۔

"آپ نے اگر علینہ کو گھر ہی واپس بھجوانا تھا تو پھر آپ نے میرے امتحان کا سامان کیوں کیا؟" اور علی شیر اپنا پہلا اندازہ درست ہوتا دیکھ کے دھیرے سے مسکراتے ہوئے واپس کرسی کی بیک سے ٹیک لگا گیا تھا۔

"کیسا امتحان؟ میں نے آپ کا کوئی امتحان نہیں لیا۔ ہاں لیکن آپ کی منگیتر کے آنسوؤں نے میرا ارادہ بدل دیا تو میں نے انہیں واپس بھجوا دیا۔ آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کی منگیتر کو صحیح سلامت آپ کو واپس لوٹا دیا۔" وہ اسے جتاتے ہوئے بولا تو اسد جو کل سے اس معمے کا حل ڈھونڈ رہا تھا، علی شیر کے عام سے لب و لہجے پہ اک گہرا سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"وہ اب میری منگیتر نہیں رہی۔"

"واٹ!" علی شیر کے لیے یہ اطلاع حقیقتاً "نئی" تھی۔ گو کہ وہ جانتا تھا کہ اسد کی خود غرضی کی انتہا دیکھنے کے بعد علینہ کبھی بھی یہ رشتہ قائم نہیں رکھے گی، لیکن اتنا بڑا فیصلہ وہ محض ایک ہی رات میں کر لے گی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے اپنے والدین کو اپنے اس اچانک فیصلے کی کیا وجہ بتائی ہو گی؟

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ انہیں ہر حال میں اپنائیں گے؟" اس نے جان بوجھ کے انجان بنتے ہوئے کہا تو اسد بوجھل لہجے میں بولا۔

"یہ میرا نہیں، اس کا فیصلہ تھا۔"

"او! آئی ایم سوری... میری وجہ سے آپ کی منگنی ..."

"اٹس او کے میری ہی غلطی تھی جو اس پہ مان رکھتے ہوئے ایک ذرا سی قربانی مانگ بیٹھا..." وہ بددلی سے گویا ہوا تو علی شیر کا دل چاہا کہ وہ اس بے غیرت اور بے حس شخص کا منہ توڑ دے جو ایک لڑکی کی حرمت کو داؤ پہ لگانے کو "ذرا سی قربانی" کا نام دے رہا تھا اور لڑکی بھی وہ جو اس کی اپنی عزت تھی۔

"آپ بتائیں، آپ اپنے وعدے پہ قائم تو ہیں ناں؟" اس نے متفکر نظروں سے علی شیر کی طرف دیکھتے ہوئے، اس کے دوسرے اندازے کی بھی تصدیق کر ڈالی تو وہ دل ہی دل میں اس کی کمینگی کو داد دیتا، بظاہر مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں آپ نے تو شرط پوری کی تھی، اب میں نے ہی ہاتھ آیا سنہرا موقع گنوا دیا تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔" وہ کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو اسد کے چہرے پہ اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"شکر ہے یہ کمینہ اپنی بات سے منکر نہیں ہوا، ورنہ میں کیا کرتا۔" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا تھا اور علی شیر اس کے چہرے پہ پھیلتے اطمینان کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ کیا کوئی شخص اس حد تک بھی پستی میں گر سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆

اس طوفان کو گزرے ایک ہفتہ گزر گیا تھا، لیکن اس کے اثرات تاحال ان کے پورے گھر پہ چھائے ہوئے تھے۔ گو کہ فصیح صاحب نے صوفیہ بیگم کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں جس نے انہیں یہ چھوٹی تکلیف دے کر آنے والی بڑی تکلیف سے بچا لیا تھا، مگر ماں ہونے کے ناتے ان کا دکھ اور آنسو بے اختیار تھے۔

ان کی تکلیف پہ علینہ کا زخمی دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا تھا، مگر وہ خود کو سنبھالے ہر ہر لمحے اپنے رویے اور الفاظ سے ان کی دل جوئی کرتی رہتی تھی۔ لیکن رات کی تاریکی میں اس کا ضبط بھی جواب دے جاتا تھا۔ اسد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا وہ اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا اور جس کی اگر بھنک بھی اس کے ماں باپ کو پڑ جاتی تو وہ شاید اتنا بڑا صدمہ برداشت ہی نہ کر سکتے۔

وہ دن اپنی پوری جزئیات سمیت اس کے ذہن پہ جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اور علی شیر باران کی ذات ایک ناقابل فراموش حقیقت بن کے اس کے دل و دماغ تو کیا اس کے خوابوں کو بھی الجھا گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے سمجھنے اور اپنے ذہن سے جھٹکنے سے قاصر تھی۔

☆ ☆ ☆

رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ مگر علی شیر ڈھلتی رات سے بے خبر لان کی گیلی گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتے ہوئے اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے اپنے پیچھے رضا صاحب کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ جو چند لمحے اسے اپنے دھیان میں سر جھکائے ٹہلتا دیکھ کے دھیرے سے پکار بیٹھے تھے۔

"علی!" اور خود میں مگن علی شیر نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تھا۔

"پاپا آپ؟" نائٹ گاؤن میں ملبوس رضا باران کو خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دیکھ کے وہ ان کے قریب چلا

آیا تھا۔

"خیر تو ہے؟" اس نے متفکر نگاہوں سے باپ کا چہرہ دیکھا تھا جو اس کے اطمینان کو ہولے سے مسکرا دیے تھے۔

"خیر ہے یار! بس نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ قدم بڑھاتے ہوئے لان کے وسط میں رکھی کرسیوں کی جانب چلے آئے تو علی شیر بھی ان کی تقلید میں ایک کرسی پہ آ بیٹھا۔

"تو آپ نے نیند کی گولی کھا لیتی تھی۔" وہ ان کی بوجھل آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا تو اک پژمردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"اب وہ بھی کام نہیں کرتیں۔" ان کا جواب علی شیر کو بے اختیار اک گہری سانس لینے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"تم بتاؤ اس وقت یہاں ٹہلتے ہوئے کیا سوچ رہے تھے؟" انہوں نے اس کا کھویا کھویا سا چہرہ بغور تکتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔" وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے نظریں آسمان پہ جماتا ہوا بولا تو رضا صاحب اس کے انداز دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کہیں محبت تو نہیں کر بیٹھے برخوردار؟" ان کی بات پہ علی شیر نے چونکتے ہوئے اپنی نگاہیں ان کے چہرے پہ جما دی تھیں۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے محبت کا آپ کو بڑا تجربہ رہا ہے۔" ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ شرارت سے بولا تو رضا صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"ہک ہا! ہمارے ایسے نصیب کہاں؟ لیکن بڑے بڑوں کو آہیں بھرتے تو دیکھا ہے ناں۔ ویسے کون ہے وہ جو میرے مغرور بیٹے کو تارے گننے پہ مجبور کر گئی ہے؟"

"ہے ایک پاکیزہ سا وجود۔" وہ مزید آنا کانی کیے بنا دھیمے سے لہجے میں بولا تو رضا صاحب اس کے الفاظ پہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"بڑے عرصے بعد کسی لڑکی کے تعارف کے لیے لفظ پاکیزہ سنا ہے۔ اچھا لگا ہے۔" وہ متانت سے مسکرائے تھے۔

"وہ خود بھی بہت اچھی ہے۔" کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتے ہوئے علی شیر نے ایک بار پھر اپنی نظریں آسمان پہ جما دیں تو رضا صاحب نے مصنوعی خفگی سے بیٹے کو ٹوک دیا۔

"اگر اتنی اچھی ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" ان کے سوال پہ بے اختیار اک سرد آہ اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو کے فضا میں بکھر گئی تھی۔

"یہی تو مسئلہ ہے وہ خود بہت اچھی ہے جبکہ میں صرف اچھا بھی نہیں... مجھ جیسے برے انسان سے وہ کبھی شادی کے لیے تیار نہیں ہو گی۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے دل گرفتی سے بولا تو رضا یاران اسے دیکھتے ہوئے کرسی کی پشت سے کمر ٹکا گئے۔

"ہونا چاہیے بھی نہیں۔" وہ مکمل سنجیدگی سے گویا ہوئے تھے۔ ان کی بات علی شیر کو ایک لمحے کے لیے حیران کر گئی تھی۔

"کیا مطلب؟" اس نے اچنبھے سے باپ کی جانب دیکھا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے اللہ تعالیٰ نے نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور برے مردوں کے لیے بری عورتیں رکھی ہیں۔" اور علی شیر اپنے باپ کے منہ سے اللہ کا ذکر سن کے ساکت رہ گیا تھا۔

اس کے چہرے پہ چھائی حیرت پر رضا صاحب کے لبوں پہ اک خفیف سی مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا کے غائب ہو گئی تھی۔

"پتا ہے علی! میں ایک عرصے خود سے الجھتا رہا کہ آخر عالیہ جیسی بد دماغ اور بد زبان عورت میرا مقدر کیوں بنی؟ لیکن ایک بار ایک کالم میری نظر سے گزرا اور مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ چونکہ میری ذات میں خود بے شمار کمزوریاں تھیں اس لیے اللہ مجھے کسی طور ایک اچھی عورت کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ ایک اچھی عورت کا اصل حق دار ایک اچھا مرد ہی ہوا

کرتا ہے... ہاں بعض دفعہ جب مجھ جیسے کسی برے آدمی کو نعمت غیر مترقبہ کی طرح کوئی اچھی عورت عطا کر دی جاتی ہے تو عموماً وہ اسے اپنی عاقبت نااندیشی کی نذر کر ڈالتا ہے جو اس عورت کے لیے سوائے آزمائش کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

سو اگر تمہیں قسمت سے ایک اچھی عورت مل گئی ہے تو خود کو ایک اچھا مرد بنانے کی کوشش کرو تاکہ خدا تمہارے نصیب میں اس لڑکی کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لکھ دے اور تمہیں مجھ جیسی اور تمہارے بچوں کو تم جیسی ناآسودہ زندگی نہ گزارنی پڑے۔"

دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے آخر میں ان کی آواز کپکپا گئی تو دم سادھے بیٹھا علی شیر بے اختیار اٹھ کے ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔

"پاپا! آپ میری تکلیف سے واقف ہیں؟" اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے درد سے چور لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں، تم میری اولاد ہو بیٹا۔ کیا مجھے اس بات کا احساس نہیں کہ ہماری گھریلو زندگی کتنی ایب نارمل ہے۔" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بوجھل لہجے میں بولے تو علی شیر جیسے تڑپ اٹھا۔

"تو آپ نے پھر اسے نارمل بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"کس کے لیے کرتا؟ اس عورت کے لیے جو میرے ساتھ زندگی صرف اس لیے گزار رہی ہے کہ وہ مجبور ہے؟" ان کی آنکھیں دھواں دھواں اور پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"نہیں اس عورت کے لیے جو ساری زندگی آپ کی جانب سے بڑھنے والے ہاتھ کی منتظر رہی مگر زبان سے کبھی کہہ نہ سکی۔" یک لخت عالیہ باران کی بھرائی ہوئی آواز ان باپ بیٹے کے اردگرد گونج اٹھی تو دونوں نے چونک کر ایک ساتھ اس باڑ کی جانب دیکھا تھا جس کے پیچھے کھڑی عالیہ ان پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔ ماں کو دیکھ کے علی شیر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عالیہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی رضا

باران کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"میں نے اگر آپ کو چھوڑ کے جانا ہوتا ناں تو دولت کی کوئی بھی زنجیر مجھے آپ کے ساتھ بندھے رہنے پہ مجبور نہیں کر سکتی تھی۔" وہ بہتے اشکوں کے درمیان بولیں تو ساکت بیٹھے رضا انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"آپ جسے میری خود سری کہتے ہیں وہ دراصل میری جھنجلاہٹ تھی جو آپ کی بے نیازی اور بے زاری کو جھیلتے جھیلتے اتنی بڑھ گئی کہ مجھے آپ کو تکلیف دینا اچھا لگنے لگا۔ آپ جب غصے کے عالم میں بے بسی سے چلاتے تو مجھے لگتا جیسے میں نے آپ سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہو۔ آپ کی ضد میں میں نہ صرف اپنے گھر سے بلکہ اپنے بیٹے سے بھی دور ہوتی چلی گئی... مگر اب میں تھک گئی ہوں رضا! بہت تھک

گئی ہوں۔"

بولتے بولتے وہ رضا صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پہ پیشانی ٹکاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو رضا یاران کی آنکھیں بھی جھلملا اٹھیں۔

انا اور ضد نے ان دونوں کی زندگیوں کو کھوکھلا کر کے انہیں کس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر اب اور نہیں۔ وہ خود کو مزید تباہ نہیں کر سکتے تھے کہ عمر اور حوصلے دونوں کی نقدی کب ختم ہو جاتی کچھ پتا نہ تھا۔

"آئی ایم سوری عالیہ' آئی ایم رئیلی ویری سوری!" رضا صاحب کا ہاتھ بے اختیار ان کے بالوں پہ آٹھہرا تھا۔ اور علی شیر کی بھیگی آنکھیں بے اختیار چھلک اٹھی تھیں۔

✡ ✡ ✡

بہار کی آمد کی خوشی میں شہر کے ایک مشہور کلب نے جم خانہ میں فلاور شو کا انعقاد کیا تھا جس میں جاپان سے آئی چند ایکسپرٹ نے اپنے فن کا خاص مظاہرہ کیا تھا۔

نصیح صاحب چونکہ اس کلب کے ممبر تھے اور جانتے تھے کہ علینہ کو ایسی آرٹسٹک چیزوں سے کتنا لگاؤ ہے اس لیے انہوں نے بطور خاص علینہ کو اس کی فرینڈز کے ساتھ یہ ایگزیبشن دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ آج کل ان کی توجہ کا خاص مرکز ان کی بیٹی کی ذات تھی' جو انہیں ویسے بھی کچھ کم پیاری نہ تھی۔ مگر اس تلخ واقعہ کے بعد سے تو وہ اس کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔

لان سے نکل کے وہ تیز قدموں سے لابی میں داخل ہوئی تھی جب اچانک دائیں جانب موجود ہال سے نکلتا علی شیر اس سے بری طرح ٹکرا گیا تھا۔

"آئی ایم سوری' رئیلی ویری سوری۔" معذرت خواہ انداز میں دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے علی شیر نے مقابل کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے علینہ کو سنبھلتے دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا تھا۔

وہ پچھلے کتنے ہی دنوں سے علینہ سے ملنے کی کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا جو اسے ناگوار نہ گزرتی' لیکن مسلسل سوچ بچار کے باوجود بھی وہ کوئی راستہ نکالنے میں ناکام رہا تھا۔ اور اب یوں اچانک اسے اپنے سامنے پا کے علی شیر کی تو جیسے دلی مراد جیسے بر آئی تھی۔

"آپ یہاں؟" اور علینہ نے اپنے قریب ایک جانی پہچانی آواز سن کے جہاں تیزی سے سر اٹھایا تھا' وہیں اس کے دل نے بھی ایک بیٹ مس کی تھی۔

علی شیر کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے قدرے کملائے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے علی شیر نے نرمی سے پوچھا تھا۔ مگر وہ اک خاموش نظر اس پہ ڈالتی' آگے بڑھنے کو تھی کہ علی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے سرعت سے اپنا بازو اس کی راہ میں حائل کر دیا تھا۔

"پلیز علینہ! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔" وہ ملتجی انداز میں گویا ہوا تو علینہ نے ایک نظر اس کے بازو پہ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مگر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی تو علی شیر کے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیاں در آئیں۔

"کیا میں اس قابل بھی نہیں علینہ کہ آپ رک کے دو گھڑی کو میری بات ہی سن لیں؟" اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

"پلیز علینہ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" اس نے دھیرے سے اصرار کیا تو علینہ اک گہری سانس لیتی اثبات میں سر ہلا گئی۔

"تھینک یو' تھینک یو سو مچ' آپ پلیز یہیں ہال میں آجائیں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک جانب کو ہوا۔ علینہ سر جھکائے آگے کو بڑھی' اس کے پیچھے علی نے بھی قدم بڑھائے تھے۔ آگے پیچھے چلتے' وہ اسے لیے ایک قدرے پر سکون گوشے میں چلا آیا تھا۔

"بیٹھیں پلیز۔" علی شیر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے علی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے آپ کے فیصلے کے بارے میں پتا چلا تھا۔" گلا کھنکھارتے ہوئے علی شیر نے اس کی طرف دیکھا تھا' مگر وہاں ہر قسم کے تاثرات سے عاری چہرہ دیکھ کے اس کی آنکھوں میں یک لخت ایک فیصلہ کن سی کیفیت جاگی تھی۔

"اور اب چونکہ آپ کی زندگی میں کوئی نہیں' اس لیے میں آپ کو آپ کی رضا سے اپنانا چاہتا ہوں علینہ!" اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے وہ گمبھیر لہجے میں بولا تو اس کی طرف دیکھتی علینہ ایک پل کے لیے پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ دل کی دھڑکنوں میں یک لخت تیزی اتر آئی تھی۔

"علی صاحب! آپ نے اسد اعوان کو نیچا دکھانے کے لیے دو عورتوں کو اٹھوا کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے۔"

"میں مانتا ہوں کہ آپ اور میں دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔ لیکن اپنی زندگی میں ایک مخلص اور اچھی شریک سفر پانے کے لیے میں اپنی دنیا کو چھوڑ کے آپ کی دنیا میں آنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے ایک ایسے سہارے کی تلاش ہے' جو جگنو بن کر زندگی کے اس سفر میں میری اندھیری راہوں کو روشن کر سکے' جو مجھے تھام سکے' میرا ساتھ نبھا سکے' جو میرے مکان کو ایک مکمل گھر کا روپ دے سکے' جو میری نسل کی عمدہ تربیت کر سکے۔

یہ میرے وہ خواب ہیں علینہ' جو ہمیشہ سے میرے اندر پنپتے رہے ہیں۔ لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے یہ خواب کسی کے قابل بھروسا ہاتھوں میں سونپ دوں — آپ کو سونپ دوں۔ کیا آپ میرے خوابوں کو سنبھالیں گی علینہ؟" جذب سے بولتا وہ علینہ کو حیران کر گیا تھا۔

یہ اس کے خواب تو نہیں' یہ تو علینہ فصیح کے خواب تھے۔ اپنے شریک سفر کے ساتھ زندگی کے سرد گرم کو مل بانٹنے کے خواب' عزت کی ردا میں لپٹی محبت کے خواب' جو پہلے کہیں ادھورے رہ گئے تھے۔ مگر اب جن کی تعبیر سامنے کھڑی تھی۔

"پلیز علینہ! مجھے مایوس مت کرنا۔" اس کی خاموشی علی شیر کو بے چینی سے آگے جھک آنے پہ مجبور کر گئی تھی۔ اس لمحے وہ کہیں سے بھی' وہ مغرور اور انا پرست علی شیر یاران نہیں لگ رہا تھا جو علینہ کو سڑک کنارے ملا تھا۔

اس کے چہرے سے جھلکتی بے قراری اور آنکھوں میں ڈولتا رد کیے جانے کا خوف اسے ایک عام سا انسان بنا رہے تھے۔ مگر اسے اس بات کی پروا نہ تھی۔ اس کے لیے اس وقت اگر کچھ اہم تھا تو ایک صرف علینہ کی ذات اور اس کا اقرار۔

"سنبھالوں گی' لیکن ان کے بدلے میں آپ کو اپنا یقین سونپنے لگی ہوں علی! میرے اس فیصلے کو کبھی غلط ثابت مت ہونے دیجیے گا۔" نظریں جھکائے وہ دھیمے لہجے میں علی شیر کو ہفت اقلیم کی دولت تھما گئی تھی۔

وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھنے کے بعد مارے خوشی کے حیران رہ گیا تھا۔ علینہ نے اس کا ساتھ قبول کر لیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کبھی نہیں — مر کے بھی نہیں!" وارفتگی سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے اس نے اپنے دل کی تمام تر سچائی سمیت اس سے زیادہ خود اپنی ذات سے وعدہ کیا تھا اور علی شیر یاران کم از کم وعدہ خلاف نہ تھا۔

شاہدہ ملک

مالا کا موتی

پڑوس میں رہنے والی عصمہ کالج میں تھرڈ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کی زبانی میڈم علیزے کی بابت پتا چلتا رہتا تھا۔ عریشہ اس کے ذریعے سلام دعا بھی بھجواتی رہتی۔ ایک روز وہ پیغام لیے چلی آئی۔ میڈم علیزے نے اسے بلایا تھا۔

"میڈم علیزے کی شادی ہو رہی ہے۔ پتا نہیں واپس آئیں گی یا نہیں۔" میڈم علیزے کی منگنی ہو چکی تھی۔ ان کے منگیتر پی آئی اے میں آفیسر تھے۔

"اور ہاں آپی! وہ کہہ رہی تھیں کہ شام کے بعد آیئے گا ہاسٹل میں۔ ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" چلتے چلتے عصمہ کو پیغام کا بقیہ حصہ یاد آیا تو رک کر بتانے لگی۔

عریشہ دو روز سے سحرش کو اس مقصد کے لیے فون کھڑکا رہی تھی اور ساتھ ہی بھائی سے بھی چھوڑنے اور لانے کا ٹائم طے کرلیا تھا۔

فخری بھیا کو رضا مند کرنا کون سا آسان کام تھا۔ بہرحال وہ بھی ہو ہی گیا۔ مگر عین وقت پر سحرش اور بھیا کی ٹائمنگ میں تصادم ہوگیا۔ جس روز سحرش نے آنے کی رضامندی دی اسی روز بھیا آفس کے کام سے اسلام آباد چلے گئے عریشہ نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ مزید انتظار کرے اور سحرش اور فخری بھائی کی ٹائمنگ ملانے کے چکر میں اتنی دیر ہو جائے کہ میڈم علیزے لاہور کی سواری پکڑلیں، سحرش کو آنے دیا جائے اور کوئی مناسب ترکیب کنوینس کے لیے ڈھونڈلی جائے۔

اتفاق سے اس کی آمد سے آدھ گھنٹہ قبل احسان بھائی عشمہ آپی کو چھوڑنے آئے اور جب وہ انہیں چائے پیش کررہی تھی تو سحرش صاحبہ کی سواری باد بہاری آن پہنچی۔ اسے سوکھے منہ بھی چائے پانی کا پوچھنے کے بجائے آپی کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور جب تیار ہو کر نکلی تو احسان بھائی بھی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"واپسی پر کیا کروگی؟" اماں نے آواز لگائی۔

"اماں! کمپیوٹر کورس کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ کالج وین میں آجائیں گے۔" عجلت میں جواب دیتے ہوئے وہ کوریڈور کی طرف لپکی، جہاں احسان بھائی گاڑی اسٹارٹ کررہے تھے۔

☆ ☆ ☆

میڈم علیزے کے ساتھ "آپ جناب" کا بھی بس تکلف ہی تھا۔ ورنہ کالج میں لڑکیاں ان کی دوستی کی بدولت جڑواں بہنیں قرار دیتی تھیں اور عریشہ تو ایک طرف، میڈم علیزے بھی اس لقب کو اعزاز کے ساتھ قبول کرتی تھیں۔ کافی سارا اچھا وقت گزار کر، گزری باتوں اور شوخیوں پر ہنس کے، جدائی کے احساس کو دل میں سمو کر ڈھیروں نیک خواہشات کا اظہار کرکے انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا۔

ہاسٹل کے گیٹ سے نکلتے ہوئے سحرش نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا۔

"مجھے ادھر قریبی مارکیٹ سے سوٹ چینج کرنا ہے، وہیں سے ٹیکسی لے کر گھر چلیں گے۔"

"اوفوہ! تمہیں سوٹ پسند نہیں تھا تو لیا ہی کیوں تھا؟ اب یہ چینج کرنے کی بخ۔" عریشہ کو اس کے پروگرام پر تاؤ آگیا۔

"پسند تو تھا مگر میری ہمسائی کہہ رہی تھی یہ کلر ایجڈ لوگوں کو سوٹ کرتا ہے۔" اس نے وجہ بیان کی۔

سحرش کی ایک بری عادت تھی کہ سو جگہوں پر منہ مار کر ایک چیز پسند کرتی اور اگر کوئی دوسرا آکر اس میں ذرا سی بھی مین میخ نکالتا تو اس کا دل فوراً اچاٹ ہو جاتا۔

"دکھاؤ! کیسا سوٹ ہے؟" عریشہ کے کہنے پر سحرش نے بیگ سے براؤن اور آف وائٹ کے امتزاج کالان کا خوب صورت سا سوٹ نکال کر دکھایا۔

"ارے یہ تو بہت پیارا کلر کمبی نیشن ہے۔" اس نے بے ساختہ تعریف کی۔

"ہاں! اب تم تو کہوگی ہی تاکہ ہمیں مارکیٹ نہ جانا پڑے۔ یہاں سے دس منٹ کی تو واک ہے۔ خود تو بندے کو جہاں مرضی لے جاؤ اور اگر دوسرا کوئی ذرا سا کام کہہ دے تو۔۔۔"

"اوکے! بابا اوکے۔ میں چلتی ہوں ویسے یہ مارکیٹ وغیرہ جانا ہو تو بھائی یا امی کے ساتھ ہی۔۔۔"

"تو میں کون سا روز منہ اٹھا کر اکیلے آوارہ گردی

کرنے کو کہہ رہی ہوں؟بس ذرا دیر کی تو بات ہے۔" اس نے قدرے چڑ کر کہا۔ ناچار وہ خاموش ہو کر سحرش کی تقلید میں چل پڑی۔

"کون سی شاپ سے لیا تھا؟" اس نے راستے میں پوچھا۔

"چاند کلاتھ ہاؤس۔"

"ارے! وہاں ہم اکیلے جائیں گے؟" عریشہ نے چونک کر انتہائی بے تکی بات کہی۔

"نہیں! ایک بینڈ باجا' بارات' ڈیلی گیشن' حفاظتی دستہ' جو تم کہو' ساتھ لے چلتے ہیں۔" سحرش نے جل کر جواب دیا۔

"نہیں! دراصل یہ چاند کلاتھ ہاؤس والوں کی ریپو کچھ اچھی نہیں ہے۔" اس نے سنی سنائی بیان کی۔

"میں پچھلے ہفتے بھائی کے ساتھ ان کی شاپ پر آئی تھی۔ اتنے ویل مینرڈ سیلز مین ہیں یہاں پر۔" سحرش نے اس کی بات کی نفی کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی۔

"پھر بھی سوچ لو۔ بھائی کو بھیج دینا سوٹ چینج کرانے۔" اگرچہ وہ مارکیٹ کے قریب پہنچ چکی تھیں' مگر پھر بھی عریشہ نے مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

"یار! پانچ منٹ کی تو بات ہے۔ ہمیں ایک سوٹ ہی تو چینج کرنا ہے۔ کون سا میں ان کے ساتھ بزنس یا لائف پارٹنر شپ کرنے جا رہی ہوں۔ تم پتا نہیں' میرے ہر کام میں روڑے کیوں اٹکانے لگ جاتی ہو؟" گویا اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ سوٹ تبدیل کرا کے ہی جائے گی۔

"باجی! یہ دیکھ لیں۔ امبرائیڈڈ سلک' یہ شیفون کی نئی ورائٹی آئی ہے' یہ نئے ڈیزائن۔"

"بس بھائی! ہمیں ان کے سوٹ کا کلر چینج کرنا ہے۔" سیلز مین ان کے سامنے ڈھیروں سوٹ پھیلاتے ہوئے کہہ رہا تھا' جب عریشہ نے اسے ٹوک دیا تھا' مگر پھر بھی وہ لکڑی کی بنی ہوئی اس اونچی سی اسٹیج نما سطح جس پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا' براجمان نئے نئے ڈیزائن اور کلر ان کے سامنے ڈھیر کیے جا رہا تھا۔

درمیان میں معمولی سا راستہ اور پھر کسٹمرز کے بیٹھنے کے لیے بنچ بنے ہوئے تھے۔

"یہ سوٹ بالکل۔۔۔" اس کی اگلی بات عریشہ کے پلے نہ پڑی تھی۔ سحرش قدرے آگے بیٹھی ہوئی تھی کہ اسے ہی سوٹ پسند کرنا تھا۔ عریشہ کو یوں لگا کہ سیلز مین کا ہاتھ سحرش کے گھٹنے کے قریب گیا تھا۔

"شاید مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے سوچا اور سحرش اُسے تو یوں بھی بات ذرا دیر سے سمجھ میں آتی تھی۔

ابھی وہ اس غلط فہمی کو دل سے نکالنا ہی چاہ رہی تھی' جب اگلا پل اس کے ساتھ ساتھ سحرش کو بھی ساکت کر گیا تھا۔ ان دونوں نے حق دق ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تیزی سے کھڑی ہو گئیں۔

سڑک پر چلتے ہوئے چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔

"میں بھائی کے ساتھ آئی تھی تو یہاں کا ماحول بالکل ٹھیک لگا تھا مجھے۔" سحرش بے حد شرمندہ ہو کر کہہ رہی تھی۔

"تب اور اب میں ایک بہت بڑا فرق بھی تو تھا۔" عریشہ سوچ رہی تھی۔

"بس! پانچ منٹ کی تو بات ہے۔" تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس کے ساتھ بحث کرتے ہوئے سحرش نے کہا تھا۔

"مگر پانچ منٹ کیا' یہ تو ایک لمحے کی بات تھی۔" زندگی کے بہت سے سال گزر تا وقت اپنی بغل میں سمو لے گا' مگر یہ ایک لمحہ ذہن کے منظر سے کبھی محو نہ ہو پائے گا۔ ایسا ہی کوئی لمحہ زندگی پر محیط ہو جاتا ہے کہ وہی مالا کے ایک موتی کی طرح ہوتا ہے' جو ٹوٹ جائے تو ساری مالا بکھر جاتی ہے' ٹوٹ کر فنا ہو جاتی ہے' بے کار ہو جاتی ہے۔

نایاب سحر

زندگی موسم اور خوشبو

"جو بات میں تم سے کرنے جا رہا ہوں آئی ہوپ کہ تم اس مسئلے میں مجھ سے مکمل تعاون کرو گی اور اگر تم ایسا نہیں کرو گی تو اپنا ہی نقصان کرو گی۔"

عادل کی بات سن کر اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی جان جیسے یکدم ختم ہو گئی تھی۔ "وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔"

بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے سوچا۔ اس وقت' اس لمحے میں اسے اپنی سانس کی آواز بھی شور محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سانس روکے کھڑی رہی۔

"میں نے اپنے پیرنٹس کو بہت سمجھایا۔ رابیل! یقین کرو پچھلے ایک ماہ سے میں نے اپنی ساری انرجی صرف اسی ایک کام میں لگا دی ہے مگر ماں باپ۔۔۔" اب کے وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"اولاد کو آسائش دے کر' ان پر پیسا لگا کر' ان کی خواہشات پورا کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کو خرید لیا ہے اور اولاد۔۔۔ اسے ان ساری چیزوں کے بدلے میں ایک بھاری خراج۔۔۔ ایک تاوان بھرنا پڑتا ہے۔"

"وہ مطلب کی بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔" اسے شدید الجھن ہوئی۔

"کتنا کہا تھا میں نے ماما سے' کتنی منتیں کی تھیں کہ ایک دفعہ۔۔۔ صرف ایک دفعہ وہ سویرا اور اس کی فیملی سے بات کر کے تو دیکھیں مگر نہیں۔۔۔ ان کی انا۔۔۔

مکمل ناول

ان کی اولاد سے زیادہ بڑی ہے؟ کیا کسی کو پسند کرنا، کسی سے محبت کرنا اتنی ہی بری بات ہے کہ آپ اس ایک بات کو لے کر اپنی ہی اولاد کے دشمن ہو جائیں..... کیا تمہیں نہیں لگتا یہ ماں باپ کا جو سو کالڈ پیار ہوتا ہے، ان کی محبت، جس کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں، وہ سب دھوکا، سب فراڈ ہوتا ہے؟" وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

وہ کیا جواب دیتی۔ اسے تو اپنے محسوسات کی بھی خبر نہیں تھی۔

"رابیل! میں نے بہت امید لے کر اور ایک واحد حل کے طور پر تم سے بات کی ہے۔ فار گاڈ سیک..... تم از کم تم میری مدد ضرور کرنا۔"

بے اختیار وہ ریسیور کو تھامے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے لیے کھڑا ہونا اب ایک مشکل کام ثابت ہو رہا تھا۔

"میں سویرا سے شادی کر چکا ہوں۔" اب کے وہ مدھم آواز میں بولا تھا۔

کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ آسمان اس کے سر پہ آ نہیں گرا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔

اس کی اتنی لمبی چوڑی تمہید سے وہ اتنی۔ بات تو بخوبی سمجھ چکی تھی۔

اور وہ اس سے مدد چاہتا تھا..... کس قدر بھونڈا مذاق تھا یہ۔

"ہیلو، رابیل..... رابیل!" اس کی اتنی لمبی خاموشی پر دوسری طرف سے کہا گیا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ لرزتی آواز میں بولی تھی حالانکہ یہ بات بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"تم انکار کر دو..... تم کہہ دو کہ تمہیں یہ شادی نہیں کرنی کوئی بھی بہانہ بنالو۔ کہہ دو کہ تمہیں کوئی کال آئی ہے، کسی نے تم سے کہا ہے کہ عادل کا کریکٹر بہت لوز ہے، وہ شرابی ہے، جوا کھیلتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر یہ کہہ دو کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو اور تم یہ شادی نہیں کر سکتیں۔"

وہ جیسے اسے حل سمجھا رہا تھا۔

رابیل ہونٹ بھینچے، نم آنکھوں کے ساتھ سنتی رہی۔

"کچھ بھی کہہ دو..... مگر پلیز! انکار کر دو۔" اب کے وہ بے حد بے بسی سے بولا۔

"تم..... تم کیوں نہیں انکار کر دیتے؟ تم کہہ دو کہ تمہیں کوئی کال آئی ہے، کسی نے تم سے کہا ہے کہ رابیل کا کریکٹر لوز ہے اس کی لڑکوں سے دوستی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یا پھر یہ ہی کہہ دو کہ تم سویرا کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کر سکتے۔" اب کے وہ تلخی سے بولی۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں نے کچھ نہیں کیا ہوگا۔ میں نے کہا نا کہ پچھلے ایک ماہ سے میں اپنی انرجی اسی کام میں ویسٹ کر رہا ہوں مگر انہوں نے مجھے جائیداد سے ڈس اون کرنے کی دھمکی دی ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"تم میرے باپ کو نہیں جانتیں، وہ صرف کہتے نہیں کر کے دکھاتے ہیں۔ اور میں ابھی یہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ ابھی میرا ابی ڈی ایس مکمل نہیں ہوا اور وہاں آسٹریلیا میں سویرا میری منتظر ہے۔ اور اگر میرے باپ نے مجھے سپورٹ کرنا بند کر دیا تو میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ میں دوبارہ آسٹریلیا جا سکوں۔"

اب کے وہ جھنجلا کر بولا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

"تم کچھ تو بولو..... کم از کم میرے سوال کا جواب تو دو۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"میں انکار نہیں کروں گی۔" وہ بے حد کمزور لہجے میں بولی۔

"تم..... تم، تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟" وہ مشتعل ہو گیا۔

"تم کہہ سکتے ہو۔"

"تم جانتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ میں کبھی بھی تمہیں قبول نہیں کروں گا۔ تمہیں ہمیشہ میری دوسری بیوی بن کر رہنا ہوگا اور..... اور اگر ایک دفعہ میں آسٹریلیا چلا گیا نا..... تو یقین کرو کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ پھر تم کسی فلمی ہیروئن کی طرح میرا انتظار کرتی رہنا۔

یا پھر..... میں تمہارے ساتھ اتنے برے طریقے سے پیش آؤں گا کہ تم خود مجھ سے نجات مانگو گی اور تب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ وہ حشر کروں گا تمہارا کہ تم یاد کرو گی۔ ابھی میں نے تمہیں بتایا نا کہ میرا باپ کہتا نہیں، کرتا ہے۔ تو میں بھی اسی کی اولاد ہوں۔ پھر تم دیکھنا تمہارے ساتھ ہوتا کیا ہے۔" وہ پاگل ہو رہا تھا اور بے حد سنگین لہجے میں اس کو دھمکی دے رہا تھا۔

"تمہیں جو کرنا ہو، تم کر لینا مگر میں انکار نہیں کروں گی۔" اب کے وہ چلا کر بولی تھی۔

اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز کے ساتھ فون کٹ گیا۔ اس نے ریسیور کو دور پھینک دیا۔

اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور پورے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔

بمشکل کھڑے ہو کر اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

"مجھے کہتا ہے..... انکار کر دو..... میں، میں انکار کر دوں تاکہ..... تاکہ میرا باپ..... ان..... ان تین چار سو لوگوں کے سامنے بے عزت ہو تا رہے۔" وہ سسکیوں کے ساتھ بڑبڑائی۔

"انکار کر دوں اور اپنے خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا دوں۔

انکار کر دوں اور ساری عمر کے لیے معتوب ٹھہرائی جاؤں۔

کس قدر ظالم..... کس قدر سفاک ہے یہ شخص۔ اسے صرف اپنے مفادات عزیز ہیں۔ کسی کی عزت اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

اپنے آنسو روکتے ہوئے اس نے کھڑکی کے پٹ کو مضبوطی سے پکڑا تھا۔

بے اختیار اسے سردی کا احساس ہوا تھا۔

باہر شدید ٹھنڈ تھی اور ہر چیز منجمد ہو رہی تھی جبکہ وہ آگ پر رکھی کسی چیز کی طرح پگھل رہی تھی۔

"اب کیا بچا ہے میرے پاس....." اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دیکھے۔

"کوئی خواب کا جگنو..... کوئی امید کا ستارہ۔ کچھ بھی تو نہیں..... کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ مڑی اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اس نے آئینے میں نظر آنے والے عکس پر ہاتھ پھیرا۔

یوں ہاتھ اٹھانے پر اس کی کلائی میں موجود چوڑیاں کھنکنا اٹھیں۔

اس نے آئینے پر سے نظر ہٹا کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔

وہ دلکش آواز کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کی سماعتوں میں اتری تھی۔ اشتعال کی ایک شدید لہر اٹھی تھی اور اس نے زور سے اپنا بازو ڈریسنگ ٹیبل پر مارا تھا۔

ایک چھناکے کے ساتھ کئی چوڑیاں ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گئیں اور کچھ نے اس کی کلائی پر خراشیں پیدا کی تھیں۔ وہ چند لمحے ان ٹوٹی چوڑیوں کو دیکھتی رہی۔ ان پر سے نظر ہٹا کر اس نے ایک دفعہ پھر سے خود کو دیکھا۔ بے اختیار اس کا کاجل پھیل کر بہہ گیا تھا۔

"میں تمہارے لیے کبھی سویرا نہیں بن سکتی۔" وہ بڑبڑائی۔

"اور تم..... تم میرے لیے کبھی طلال نہیں ہو سکتے۔" اس نے زیر لب کہا۔

"اچھا مذاق ہے۔" اب کے وہ تلخی سے ہنسی۔

"اگر مجھے تمہاری اور..... اور تمہیں میری ضرورت نہیں تھی تو تو کیا یہ ضروری تھا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگی میں آتے۔"

دونوں ہاتھ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر وہ بے بسی سے سوچ رہی تھی۔

"کیا ہمیں وہ نہیں دیا جا سکتا تھا جس کی ہمیں چاہ تھی۔" وہ ایک جھٹکے سے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی اور پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر گھٹنوں میں سر

دے کر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔
اس کے سارے شکوے ' ساری شکایتیں ' ہر حسرت ' ہر دکھ ' ساری بے چینی ' اضطراب ۔۔۔ سب کچھ یکدم ختم ہو گیا تھا۔
"خالی ہونا کسے کہتے ہیں؟"
"راکھ کی مانند کس طرح بکھرتے ہیں؟"
"ریزہ ریزہ وجود کیا ہوتا ہے؟"
ان تمام باتوں کا مفہوم رابیل علی سے بڑھ کر کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ مکمل اندھیرے میں اور سب لوگوں سے دور ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ ختم کر کے اسے پاؤں کے نیچے مسلا اور دوسرا سگریٹ سلگایا۔
چند کش لینے کے بعد اس نے سگریٹ کو اپنی آنکھوں کے سامنے کیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ دھواں دھواں ہو کر فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے آپ میں اور اس سگریٹ کے ٹکڑے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔
ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری۔
آج کی شام میں دکھ کے مفہوم سے آگاہی حاصل کرنے والی رابیل اکیلی نہیں تھی ' کوئی اور بھی اس کے ساتھ شریک غم تھا۔
"کیسے کر سکتی ہو تم ایسا ۔۔۔ کیسے؟"
وہ ابھی تک بے یقین تھا۔ اشتعال کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی اور اس نے پوری قوت سے سگریٹ کے ٹکڑے کو دور پھینک دیا۔
چند لمحوں تک وہ گہرے گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کرتا رہا مگر غم اور دکھ اس کے اندر کسی لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔
"تو میری محبت ' میری ذات ' میرا تعلق تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جو تم نے صرف ایک ۔۔۔ صرف ایک لمحے میں سب کچھ برباد کر دیا۔ ہا۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تھے۔

"میں نے ہمیشہ تم کو چاہا اور تم نے ہمیشہ ایک اسی پر شک کیا۔"
وہ کافی دیر تک خاموشی سے ایک جگہ نظریں جمائے اس ایک چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔
"چاہت! بکواس ' بکواس ہے یہ سب ۔۔۔ اور عورت ۔۔۔"
اس کے اندر آگ بھڑکی۔
"زہر کا دوسرا نام ۔۔۔ ایک ایسا زہر جو کہ نس نس میں پھیل کر مرد کو کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں زندگی میں کبھی کسی عورت سے محبت بھی کروں گا اور وہ بھی اس حد تک۔"
"محبت یا پھر کمپرومائز؟" اس نے رک کر سوچا۔
اور یکدم اس پر انکشاف ہوا تھا کہ ان کے تعلق میں محبت سے زیادہ کمپرومائز کا ہاتھ تھا۔
یہ محبت ہی تھی جو کہ سات سال تک میں تم سے کمپرومائز کرتا رہا۔ تمہارے غلط سے غلط اور برے سے برے رویے کو برداشت کیا۔ تمہاری جذباتیت کو تمہارا بچپنا کہہ کر نظر انداز کرتا رہا۔ تم نے جو کہا ' وہ کر رہا۔ ایک انسان محبت میں اور کیا کر سکتا ہے؟" وہ تھک کر سر جھکائے انگلی سے کرسی کے بازو پر نادیدہ لکیریں کھینچنے لگا۔
"تو یہ اہمیت تھی طلال حیدر کی تمہارے لیے؟ اب کدھر گئی ہے تمہاری وہ نام نہاد محبت ' جس کے دعوے تم سات سال تک کرتی رہی ہو۔ سات سال کافی ہوتے ہیں کسی کو جانچنے ' پرکھنے ' آزمانے کے لیے اور وہ عورت سات سالوں میں "طلال حیدر" کو جان نہیں سکی تھی۔ اسے پرکھ نہیں سکی تھی۔ وہ پہلے دن کی طرح اس پر شک کرتی ہے۔ واٹ اے ٹریجڈی۔"
وہ گہرے دکھ اور تاسف میں تھا۔
رشتے ہمیشہ رنجشوں یا نفرتوں کی بنا پر ٹوٹتے ہیں مگر یہ کمال بندھن تھا جو کسی کی محبت کی انتہا کے ہاتھوں ٹوٹا تھا۔
محبت کوئی منفی جذبہ نہیں ہے۔

یہ تو بہت خوب صورت احساسات کا نام ہے۔
یہ عمران مرتضیٰ کی منفی سوچ ہی تھی جس نے اسے یہ دن دکھایا تھا۔
مرد کو عورت اپنی محبت کی دیوار میں چن نہیں سکتی ' اسے قید نہیں کر سکتی ۔۔۔ اور جو ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے ' وہیں یہ غلطی کرتی ہے۔ اس ایک عورت نے ایسا کرنا چاہا تھا اور انجام اس کے سامنے تھا۔
"طلال بھائی!" وہ اس آواز پر بری طرح سے چونکا تھا۔
"تایا جان آپ کو بلا رہے ہیں۔" ریحان نے کہا۔
وہ چند لمحے غائب دماغی سے اسے دیکھتا رہا۔
"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" بے ساختہ ریحان نے پوچھا تھا۔
"ہاں! کیا بات ہے؟" وہ بے زاری سے بولا تھا۔
"آپ ان کی بات سن لیں ۔۔۔ پلیز!" وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ طلال نے ریحان کے یوں کہنے پر پہلی دفعہ اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟"
"کچھ نہیں۔"
وہ خود اس قدر مضطرب اور ٹوٹا ہوا تھا کہ اس نے ریحان سے مزید کوئی بات نہیں کی اور سست روی سے قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"رابی!" پنکی نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے آواز دی۔ اس نے سر اٹھا کر پنکی کو دیکھا۔
"کیا ہے؟" اس نے بمشکل کہا تھا۔ کافی دیر ایک ہی زاویے میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کے بال خراب ہو چکے تھے۔ اس کی کلائیوں میں موجود گجرے بری طرح سے مسلے جا چکے تھے۔ اس کا لباس پرشکن ہو چکا تھا اور کانچ کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ عجیب اجڑی ہوئی سی حالت تھی۔ پنکی نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔
"اٹھو! مہندی کی رسم کرنا ہے۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔
"ہاں ۔۔۔ چلو!" غائب دماغی کے ساتھ بولتے ہوئے اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا گئی۔
پنکی کا دل چاہا کہ کھینچ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ دے مارے مگر وہ ضبط کر گئی۔
پھر پنکی نے اس کا حلیہ ٹھیک کیا۔
اور اسے اسٹیج تک لے آئی۔
اسے کون مہندی لگا رہا ہے ' کون مٹھائی کھلا رہا ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے بالکل بھی معلوم نہیں تھا۔
اس غائب دماغی کی کیفیت میں یکدم اسے ایک نامانوس سا احساس ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

کہیں کچھ کمی تھی۔
جیسا شور و غل اور ہنگامہ تھوڑی دیر پہلے تھا اب ویسا نہیں تھا۔ فضا میں عجیب سوگوار سی خاموشی رچی بسی تھی۔ اس سارے عرصے میں اس نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا اور یکدم ہی اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔
"اماں!" وہ بنا آواز کے بولی تھی۔ بے اختیار اس نے پنکی کو ڈھونڈا۔
"سارہ! پنکی کو بلانا پلیز۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھی سارہ سے کہا۔ وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔
"اماں کہاں ہیں پنکی؟" پنکی کے آنے پر اس نے بے تابی سے پوچھا۔
اسے محسوس ہوا جیسے پنکی اور سارہ نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا تھا۔
"پنکی! اماں کہاں ہیں؟" اب کے وہ گھبرا کر نسبتاً اونچی آواز میں بولی تھی۔
"ادھر ہی ہیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ان کا بی پی تھوڑا شوٹ کر گیا تھا' اس لیے وہ اندر آرام کر رہی ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے نا کہ وہ کتنی ٹینشن لے لیتی ہیں۔"
پنکی کے بجائے سارہ نے جواب دیا تھا۔
رابیل نے دیکھا کہ پنکی اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"اور ابا؟" اس نے پنکی پر سے نظریں ہٹا کر ایک دفعہ پھر سارہ سے پوچھا تھا۔
"کم آن رابی! وہ اندر مہمانوں کی ساتھ بزی ہیں۔ اب کیا وہ انہیں چھوڑ کر تمہارے پاس آ بیٹھیں؟" اب کے سارہ نے قدرے ناراضی سے کہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی مگر اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔
"پنکی! اب بس کرو۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"
چند لمحوں بعد اس نے افنان کو کہتے سنا تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا گھر سو چکا تھا۔ اس کے کمرے میں ان کی تمام کزنز آڑی ترچھی ہو کر سوئی ہوئی تھیں۔
ایک وہ ہی تھی جسے نیند آ رہی تھی اور نہ سکون۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ ٹیرس پر نکل آئی۔ باہر کی سرد ہوا اس کے گالوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ خاموشی سے جا کر چھت پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ذہن میں کوئی سوچ کوئی خیال ٹیک نہ تھا اور اس وقت وہ کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ رات بہت گہری تھی۔ اور اس اندھیری رات کی وحشت کو کل کا سورج بھی ختم نہیں کر سکتا تھا۔ بے ساختہ اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔
"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" پنکی نے پیچھے سے آ کر اس کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا تھا۔ ٹیرس پہ اتنا اندھیرا تھا کہ اسے کچھ بھی واضح نہیں دکھائی دے رہا تھا۔
"تمہیں نیند آ رہی ہے..... یہ بڑی غنیمت ہے تمہارے لیے۔ جاؤ! جا کر سو جاؤ۔ میرے پیچھے کیوں اپنی نیند خراب کرتی ہو۔"
وہ اپنا بازو اس سے چھڑا کر مدھم آواز میں بولی تھی۔
"بکواس مت کرو اور اندر چلو۔" پنکی بگڑ کر بولی تھی۔
"مجھے تنہا چھوڑ دو پلیز۔" اب کے وہ ملتجی لہجے میں بولی تھی۔
پنکی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے اندر لے آئی۔ چند لمحوں تک وہ طیش کے عالم میں اسے گھورتی رہی پھر اکھڑ لہجے میں بولی۔
"انسان اگر بہادر نہ ہو تو اسے بہادر بننے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔"
رابیل نے حیران نظروں کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دودھ کے گلاس کے ساتھ ایک نیند کی گولی لے کر آئی تھی۔
"تمہاری مزید بکواس سننے کے موڈ میں بالکل بھی نہیں ہوں۔ خاموشی سے یہ دودھ پیو اور ٹیبلٹ لے لو ورنہ میں اماں کو جا کر بتا دوں گی۔"
وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولی تھی۔
رابیل نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے کہنے پر عمل کیا تھا۔
"چلو اب لیٹ جاؤ!" اس کے دودھ ختم کرتے ہی اس نے نیا حکم جاری کیا تھا۔
وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ اور جب تک وہ سو نہیں گئی پنکی اسی طرح اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔
جب اسے یقین ہو گیا کہ رابیل مکمل طور پر سو چکی ہے تو اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح اسے سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ صبح اماں اسے اپنے ساتھ لگائے کتنی دیر تک روتی رہی تھیں بالآخر اسے ہی انہیں چپ کرانا پڑا تھا۔ صبح جب سب کے ساتھ وہ ناشتا کر رہی تھی تو افنان قدرے دیر سے آیا تھا اور آتے ہی اس نے رابیل کا منہ چوم کر اس کا سر تھپتھپایا تھا۔ وہ ناشتے سے ہاتھ کھینچ کر اسے دیکھنے لگی۔
اسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں تھا۔ جبکہ اس کے ابا ناشتے کی ٹیبل پر سرے سے موجود ہی نہیں تھے۔
"کیا ہو رہا ہے؟" یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ یکدم اس کا دل ناشتے سمیت ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کرسی دھکیل کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔
"افنان! تم ہی اسے بتا دو یہ نہ ہو کہ بعد میں وہ....."
"کچھ نہیں ہوتا اماں! اسے پہلے سے ٹینس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
افنان نے یکدم ان کی بات کاٹ دی۔
اس نے اپنے پیچھے طاہرہ کو کچھ کہتے سنا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔
اور بالآخر وہ وقت بھی آ گیا' جب اس کا نکاح ہونا تھا۔ اس نے نکاح خواں کے ساتھ اپنے باپ اور حیدر تایا کے ساتھ دو تین آدمیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ عادل کے والد ان کے ساتھ نہیں تھے۔ اسے الجھن ہوئی۔ اصولاً تو انہیں نکاح خواں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ بارات پہنچنے پر جو شور اٹھتا ہے وہ بھی مفقود تھا۔ پنکی صبح سے اس کے پاس تھی اور اس کی باقی کزنز نے بھی اسے بارات کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔
کچھ خلاف معمول ہونے جا رہا تھا یا پھر خلاف معمول ہو چکا تھا۔ اس کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ اسے عادل سے کوئی اچھی امید نہیں تھی۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے اپنے ایک طرف ماں اور دوسری طرف باپ کو بیٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔
اس کے باپ نے بازو بڑھا کر اس کے کندھے کے گرد پھیلایا تھا۔ نکاح خواں اب "بسم اللہ" پڑھ رہا تھا۔

رابیل کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی تھی۔
"رابیل علی ولد علی اکرم! آپ کو پچاس ہزار روپے نقد بعوض حق مہر....."
اس نے پوری دنیا کو سناٹے میں ڈوبا ہوا محسوس کیا تھا۔
"طلال حیدر ولد حیدر اکرم....."
کوئی دھماکا بہت شدت کے ساتھ ہوا تھا۔
وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکی تھی۔ چند لمحوں بعد ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔
"اماں!" اس کی ماں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کی تھی۔
"اپنے نکاح میں قبول ہے؟"
نکاح خواں اب یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔
اسے اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا مگر نکاح خواں ایک دفعہ پھر سے وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔
وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔
اور جب تیسری دفعہ بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا تو حاضرین کو سانپ سونگھ گیا۔
طاہرہ نے بے حد گھبرا کر علی صاحب کو دیکھا تھا۔

ماہنامہ شعاع 159 جون 2012

"رابی! بچے جواب دو۔"
اب کے اس کے باپ نے کپکپاتی آواز میں کہا تھا۔
اس نے چند لمحے سوچنے میں صرف کیے تھے کہ وہ کیا کر سکتی ہے؟
اور وہ ہار گئی تھی۔
پہلے بھی وہ باپ کی عزت کی خاطر ہاری تھی۔۔۔ اور اب بھی وہ عادل کو اگر قبول کر رہی تھی تو باپ کی عزت کی خاطر۔۔۔ سو اب عادل نہیں، طلال تھا اور بات پھر اس کے باپ کی عزت کی ہی تھی۔
"قبول ہے۔" اس کی آواز بمشکل نکاح خواں تک پہنچ سکی تھی۔
یوں جیسے وہ سب کچھ ہار چکی تھی یا پھر ہار کر جیت چکی تھی۔

✲ ✲ ✲

طلال جب اٹھ کر اندر گیا تو اسے کسی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ ہوا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ جب رابیل، عادل سے بات کر رہی تھی تو ہال کی ایکسٹینشن سے علی صاحب نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ انہوں نے بھی عین اسی وقت فون اٹھایا تھا جس وقت رابی نے فون اٹینڈ کیا تھا۔
ان کے علم میں یہ بات اگر شادی کے بعد آتی تب صورت حال کچھ اور ہوتا تھی اب جبکہ ساری بات ان کے علم میں تھی تو وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے کنویں میں نہیں پھینک سکتے تھے۔
یہ اسے زندہ دفن کرنے کے مترادف تھا۔ انہوں نے فوراً اپنے بھائیوں سے مشورہ کیا۔ ان کی بات سن کر سب ہی کو شاک لگا تھا۔ اگر وہ لوگ رابیل کی سسرال کو اصل صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے انکار کر دیتے تو یقیناً اس میں دونوں خاندانوں کی بدنامی ہوتی۔
"بارات کا نہ آنا" رابیل علی کے لیے ایسا دھبہ بن جاتا تھا جو کہ وہ ساری عمر بھی نہیں دھو سکتی تھی۔ چونکہ یہ رشتہ سکندر صاحب کی فیملی کے توسط سے ہوا تھا، سو وہ سب سے زیادہ شرمندہ تھے۔
اس کا حل انہوں نے یہ نکالا تھا کہ شہروز کو رابیل سے نکاح کرنے کے لیے پیش کر دیا تھا۔
حیدر صاحب طلال کی منگنی کی وجہ سے مجبور تھے کیونکہ وہ بھی کسی کی بیٹی ہی تھی جو کہ طلال کے ساتھ منسوب تھی۔ جب طلال اندر داخل ہوا تو سکندر صاحب، شہروز کی شادی کی بات کر رہے تھے۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں سکندر بھائی! وہ رابی سے دس سال چھوٹا ہے۔"
علی صاحب نے پریشانی سے کہا تھا۔
"اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ___"
"معاملہ کیا ہے؟۔۔۔ کیا کوئی مجھے بتانا پسند کرے گا؟" طلال نے بے حد الجھ کر پوچھا۔
اور جب معاملہ اس کے علم میں آیا تو ایک لمحے کے لیے وہ بھی چکرا گیا۔ وہاں اتنی خاموشی طاری ہو چکی تھی کہ کیا کسی قبرستان میں ہوگی۔
"اگر آپ اس کی شادی شہروز سے کریں گے تو یہ رابی کے ساتھ ساتھ شہروز کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔"
چند لمحوں بعد افنان نے خاموشی کو توڑا تھا۔
"تو کیا پھر اس کو ساری عمر کے لیے اس جہنم میں پھینک دیں یا پھر انکار کر کے ایک اور جہنم کا سامان اس کے لیے کر دیں۔ اس سب سے بہتر ہے کہ میں اسے قتل کر دوں۔"
اب کے علی صاحب بھڑک کر بولے تھے۔ ایسی کسی بات کی توقع کم از کم کوئی علی صاحب سے نہیں کر رہا تھا۔
"آپ اس کی شادی شہروز سے مت کریں۔" چند لمحوں بعد طلال نے کہا۔
یک دم اس کے دل میں کرن سے انتقام کے جذبے نے سر اٹھایا تھا۔
"تو پھر کیا کریں؟" علی صاحب تلخ لہجے میں بولے۔
"میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
سب ہی اپنی اپنی جگہ پر دم بخود رہ گئے تھے۔
"اور کرن ___ اس کا ___؟"
"وہ مجھ سے خود ہر تعلق توڑ چکی ہے۔" اپنے باپ کی بات کاٹتے ہوئے اس نے انگوٹھی جیب سے نکال کران کے سامنے رکھ دی تھی۔
وہاں موجود نفوس میں سے کوئی بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا، بلکہ کچھ کہنے کے لیے باقی بچا ہی نہیں تھا۔

✲ ✲ ✲

سات سال تک اللہ نے اس کی دعا قبول نہیں کی تھی۔ کیوں نہیں کی تھی؟
یہ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔
سات سال تک دن رات اس نے جس شخص سے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کوشش میں کیوں ناکام ہوئی تھی۔
یہ بات بھی اب اسے سمجھ میں آئی تھی۔
"وہ" رابیل علی کا تھا۔۔۔ تو کیسے کسی اور کا ہو سکتا تھا۔
رابیل علی یہ بات نہیں جانتی تھی۔۔۔ اللہ جانتا تھا۔ زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے تکلیف دہ واقعات اس لیے نہیں ہوتے کہ وہ انسان کی تکلیف کا باعث بنیں۔ دراصل وہ اس لیے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ اللہ انسان کو ہر چیز کھول کر دکھانا چاہتا ہے۔ ہر چیز کی حقیقت کو اس کی آنکھوں کے سامنے عیاں کر دیتا ہے اور پھر ظاہر اور باطن میں کوئی پردہ نہیں رہتا۔
کسی شک، کسی شے کی گنجائش بچتی ہی نہیں۔
کون کس کے لیے کتنا بہتر ہے؟ کیا اس بات کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں؟ اور کون کس کو کیسے ملتا ہے؟ یہ بات بھی آپ کے طے کرنے کی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو طے شدہ ہے۔ اور ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور بے شک اللہ آپ کے لیے اچھا ہی چاہتا ہے۔

✲ ✲ ✲

"مجھے یقین نہیں آتا طلال! تم یہ کیسے اس کے ساتھ کر سکتے ہو، تم نے تو خود پسند کیا تھا اسے۔" کرن کی بہن فوزیہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا کہ وہ یہ سب میرے ساتھ کیسے کر سکتی ہے حالانکہ اس نے بھی تو مجھ سے محبت کی تھی۔" وہ دکھ سے بولا۔
"دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا، مسلسل رو رہی ہے۔۔۔ وہ مر جائے گی طلال!"
"کوئی نہیں مرتا آپی۔۔۔ کوئی بھی نہیں مرتا۔ میں نہیں مرا۔۔۔ تو اسے کیسے کچھ ہو سکتا ہے۔ جو تکلیف میرے حصے میں آئی ہے، اسے بھی تو اس کا مزا چکھنا چاہیے۔ اسے بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ دکھ کیا ہوتا ہے اور درد کسے کہتے ہیں۔"
"تم جانتے ہو، وہ کس قدر جذباتی ہے اور تم ___ تم نے مجھے تو بتایا ہوتا کہ میں ___"
"آپ کیا کرتیں؟ ایک دفعہ پھر سے صلح کی کوششیں؟ پھر سے معافی تلافی؟ پھر سے میں اسے مناتا؟ وہ کوئی سوچ نہیں رکھتی ___؟ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے ___؟ میں اسے اس کے گھر لینے گیا تھا، تمام تر اختلاف کو بھلا کر اور اس نے ذرا سی بھی قدر نہیں کی ___ ذرا سا بھی خیال نہیں کیا۔ کل کو وہ جذبات میں آ کر مجھ سے خلع بھی تو طلب کر سکتی تھی، پھر آپ لوگ کیا کرتے؟ منگنی کی انگوٹھی اس نے میرے منہ پر دے ماری اور آپ اس بات کو اس کی جذباتیت کہتی ہیں۔ کمال ہے! میں بھی تو غصے میں تھا ___ میں نے تو یہ سب نہیں کیا۔ یہ سب اس نے کیا لہٰذا اب بھگتے۔ جس عورت کے نزدیک رشتوں کی اہمیت صفر سے بھی کم ہے، اس عورت کی حیثیت میرے نزدیک چیونٹی جتنی بھی نہیں ___ اور رابیل سے شادی میرا کوئی انتقامی عمل نہیں ___ یہ وقت کی ضرورت تھی۔ کرن میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی جس سے میں نے محبت کی اور اس لڑکی کی

محبت نے طلال حیدر کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔" وہ بھڑک اٹھا۔

"طلال! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" فوزیہ کے آنسوؤں کی روانی بڑھ گئی تھی۔

"میں اب اگر بات کو سمجھ بھی لوں تو کیا کر سکتا ہوں' میری فیملی اب کسی کمپرومائز پر تیار نہیں ہوگی اور جہاں تک میری بات ہے تو میں بھی کسی بھی قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہیں سوری!" یہ کہہ کر اس نے فون منقطع کردیا۔

کرن کے ماں باپ کو حج سے واپسی پہ یہ اطلاع ملی تھی اور یہ خبران کے لیے کسی بھی طرح سے قیامت سے کم نہیں تھی۔

کرن کے خیال میں اس کے ماں باپ کو تو کم از کم اس کی حمایت کرنی چاہیے تھی۔ مگر ہوا اس کے برعکس تھا۔

"کرن! تو نے ..... تو نے خود منگنی توڑ دی۔ کیسے کر سکتی ہے تو ایسا۔" اس کی ماں اسے جھنجوڑتے ہوئے بولی تھی۔

"کتنا میں نے تجھے سمجھایا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا کہ مت آزما اس شریف آدمی کو نہیں سنی' نہیں سنی تو نے میری بات۔ وہ مرد ہے اور مرد ہو کر اس نے تجھے اتنا لمبا عرصہ برداشت کیا تیری ناراضی' تیرے نخرے سہتا رہا اور تو..... تو نے کیا کیا؟ ذرا سی اس کی بات برداشت نہ کر سکی۔ لعنت ہے تجھ پر۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دیتے ہوئے بولی تھیں۔

"اماں!" فوزیہ نے روتے ہوئے چیخ کر آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا۔

"اب کیوں روتی ہے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد کیا توقع کرتی تھی تو اس سے کہ ہمیشہ کی طرح وہ تیری بے وقوفی کو نظر انداز کردے گا۔ کدھر گئی تھی تیری عقل؟ ٹھیک کیا بالکل ٹھیک کیا اس نے۔ تو اسی قابل تھی' یہ ہی ہونا چاہیے تھا تیرے ساتھ۔

جو اس کے لیے بہتر تھی وہ اسے مل گئی۔ تو اس کے قابل ہی نہیں تھی۔ دفع ہو جا میرے سامنے سے' فوزیہ لے جاؤ اسے یہاں سے" وہ غم اور غصے سے بول رہی تھیں۔

اور اس وقت صحیح معنوں میں اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے کیا کر دیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔ اس کے خیال میں تو طلال اپنی بے عزتی کے ڈر سے اسے منانے چلا آتا' اس کے پاؤں پکڑ لیتا۔ اس نے طلال کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔

وہ بازی ہار چکی تھی۔

اور اس نے بہت بڑی اور بہت بری شکست کھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے بعد کرن نے طلال سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

اس نے بارہا طلال سے رابطہ کرنا چاہا تھا مگر وہ اس کا فون اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات سننا نہیں چاہتا تھا۔

اس خبر نے کہ رابیل اور طلال کی شادی ہو چکی ہے' کرن کے دل میں آگ لگا رکھی تھی۔

وہ کسی طور پر بھی یہ بات قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

اس کا نمبر دیکھ کر ہی طلال فون کاٹ دیتا تھا' لہٰذا اس نے طلال کو دوسرے نمبر سے کال کی تھی۔

"ہیلو!" اس کی آواز..... کتنے عرصے بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔ عجب سا قرار آیا تھا اسے۔

"ہیلو!" وہ خاموشی سے اس کی آواز سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی وہ بولے گی تو طلال فون کاٹ دے گا۔

"ہیلو!" اب کے وہ غصے سے بولا تھا۔

"دیکھو پلیز! فون بند مت کرنا۔ میری بات سن لو ..... خدا کے لیے۔" طلال کے چہرے پر تناؤ کے تاثرات ابھرے تھے مگر وہ خاموش رہا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور پھر بھی تم نے ایسا کیا' کیسے کر سکتے ہو تم ایسا؟ تم نے تو ہمیشہ میری بات مانی ہے تو اب ....." وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

وہ خاموش تھا۔

"میری بات سنو..... تم اسے چھوڑ دو طلال! طلاق دے دو۔ میں' میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔ تم جانتے ہو نا..... میں نے کہا تھا نا تم سے کہ وہ ہم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتی ہے اور دیکھو اس نے ایسا کر دیا۔ تم چھوڑ دو اسے..... واپس لوٹ آؤ پلیز..... میں کیسے تمہارے بغیر زندگی گزاروں گی۔"

وہ اب بھی خاموش تھا۔

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو..... کچھ تو کہو۔" وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟"

اس کے سوال نے کرن کے تمام سوالات کو ختم کر دیا تھا۔ وہ روتے روتے یکدم چپ ہوئی تھی۔ یہ وہ لہجہ نہیں تھا جس کے سننے کی وہ عادی تھی۔ یہ وہ نرم آواز نہیں تھی کہ جس نرم آواز میں وہ اس سے بات کرتا تھا۔

"نن..... نہیں۔" بے ساختہ اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

اس کے جواب دیتے ہی دوسری طرف سے فون کاٹ دیا گیا تھا۔

وہ بے یقینی میں گھری کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ بے اختیار اسے تکلیف ہوئی تھی۔

اسے چند لمحے لگے تھے اس شاک سے باہر آنے کے لیے اور اب ایک دفعہ پھر سے وہ طلال کا نمبر ملا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر فون پہلی بیل پر ہی اٹھا لیا گیا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟" فون ریسیو کرتے ہی وہ بے حد سخت لہجے میں بولا تھا۔

"محبت کرتی ہوں تم سے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"ثبوت دے چکی ہو اس بات کا۔" جواباً خاصے طنز سے اس نے کہا تھا۔

"ایسا مت کرو طلال..... میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ تم اسے نہیں چھوڑنا چاہتے..... مت چھوڑو مگر پلیز! مجھے اس طرح خود سے دور مت کرو۔ میں نے محبت کی ہے تم سے۔ چاہا ہے تمہیں۔ کیا تم یہ بات نہیں جانتے؟" وہ بے تحاشا روتے ہوئے بولی تھی۔

"طلال حیدر نے بھی اگر کسی کو چاہا تھا تو وہ تم تھیں کرن....." وہ شکستگی سے بولا تھا۔

"تو پھر تم نے یہ کیوں کیا؟" تمر لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"میں نے کیا..... یہ میں نے کیا کرن ...! تم مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو؟ تم نے کیا کیا؟ ذرا اس بات کا تو حساب دو۔"

وہ دکھ سے بولا۔

"وہ میری غلطی تھی۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔"

"وہ تمہاری غلطی تھی اور تمہیں غصہ آگیا تھا..... فائن! تم مجھے کیا سمجھتی ہو کرن مرتضیٰ؟ کوئی جانور یا پھر ایک احساس سے عاری انسان۔ کیا مجھے غصہ نہیں آ سکتا؟ کیا میں ہرٹ نہیں ہو سکتا؟"

"طلال!"

"شٹ اپ..... میری بات سنو۔" طلال نے بہت غصے سے اسے چپ کروا دیا تھا۔ "تم جانتی ہو تم نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے میری انا' میرا وقار مجروح کیا ہے۔ مجھے ہرٹ کیا ہے۔ میں نے نہیں مانا کہ تم سے غلطی ہوئی تم نے جان بوجھ کر یہ کیا کرن! مجھے مت بہلاؤ..... میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہیں معلوم تھا کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ مگر تم نے مجھے گرانے کے لیے ایسا کیا سو اب بھگتو۔ تم کیا سمجھتی ہو دکھ' تکلیف' غم' درد اور افسوس صرف تمہیں ہے..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ کیا میں ویسا کا ویسا ہوں؟ جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ ہاں! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تم سے محبت کی مگر....." وہ ذرا سی دیر کو رکا تھا۔

اور کرن کو ہر چیز رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی حتیٰ کہ اپنی سانس بھی۔

"مگر میں نے ایک غلط عورت سے محبت کی اور اس بات کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا۔" اس کا لہجہ اتنا ٹوٹا ہوا تھا کہ کرن کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

"تم نے میرے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا کرن۔۔۔ کچھ بھی نہیں تم نے مجھے برباد کر دیا ہے۔۔۔ مکمل برباد۔

طلال نے فون بند کر دیا۔ کرن کے دل پر گھونسا پڑا۔ "مکمل برباد" چند لمحوں بعد وہ بڑبڑائی تھی۔ اور اس کی آنکھ سے چند آنسو گرے تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ سب لوگ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور یہ رابیل کی شادی کے چند روز کے بعد کی بات تھی۔

وہاں معمول سے زیادہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سوائے چمچ اور کانٹوں کی آواز کے علاوہ وہاں کوئی دوسری آواز تک نہیں تھی۔

افنان نے پانی لینے کے لیے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور بالکل غیر ارادی طور پر اس کی نظر رابی پر پڑی تھی۔ وہ پلیٹ میں موجود کھانے کو گھور رہی تھی۔ یکدم وہ اسے بہت ابنارمل لگی تھی۔

"رابی!" اس نے نرمی سے پکارا۔

"ہوں۔" وہ بری طرح سے چونکی تھی۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"کھانا کھاؤ۔"

"ایکسکیوزمی! مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ یہ کہہ کر کرسی دھکیلتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی تھی۔

افنان نے ماں کو دیکھا تھا۔

"ابھی تک شاک میں ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا افنان! کہ اسے اعتماد میں لے لو مگر تم نے میری بات نہیں سنی۔" وہ پریشانی سے بولی تھیں۔

"ٹھیک ہو جائے گی اماں! آپ کھانا کھائیں۔" وہ ماں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا تھا۔

"پنکی! جاؤ تم اسے دیکھو۔" انہوں نے کہا تھا۔

پنکی اس کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ پورے گھر میں اسے ڈھونڈنے کے بعد وہ اسے گھر کے پچھلے برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔

"رابی!" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولی۔

اس نے سر اٹھا کر پنکی کو دیکھا پنکی کو اس کی آنکھیں نم محسوس ہوئی تھیں۔

"کم آن رابی! کیا بچوں کا سا بی ہیو کر رہی ہو۔"

"بہت مشکل ہے۔۔۔ بہت مشکل یہ سب کچھ قبول کرنا۔" وہ کچھ بے بسی سے بولی تھی۔

"پاگل ہوئی ہو۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔ ٹیک اٹ ایزی یار!" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تم لوگوں نے اسے مجبور کیا ہو گا۔۔۔ ورنہ وہ کرن کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بے حد پریشان تھی۔

"کسی نے طلال بھائی کو مجبور نہیں کیا تھا۔ بڑے تایا تمہارا نکاح شہوز سے کرنا چاہ رہے تھے۔ یہ سن کر طلال بھائی نے کہا کہ میں رابیل سے نکاح کروں گا۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"وہ کیسے خود۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔ کچھ، کچھ غلط ہوا ہے ورنہ۔۔۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس دن اسما آپی اماں سے کہہ رہی تھیں 'جو ہوا اچھا ہوا ورنہ کرن نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔' اب مجھے نہیں معلوم کہ ان کی اس بات کا کیا مطلب تھا۔"

"پتا نہیں اس پاگل نے کیا کیا ہے طلال کے ساتھ جو اس نے اتنا بڑا اسٹیپ لے لیا۔" رابی اب بھی مطمئن نہیں تھی۔

"پنکی! میں طلال کو کیسے۔۔۔ فیس کروں گی۔ مجھ سے یہ نہیں ہو گا۔ میری جان جاتی ہے جب میں یہ سوچتی ہوں کہ۔۔۔"

وہ کس قدر پریشان تھی اس کا اندازہ اب پنکی کو ہوا تھا۔

"ریلیکس یار! میں مانتی ہوں یہ سب کچھ فیس کرنا مشکل کام ہے مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بے شک تھوڑا وقت لگے گا لیکن سب نارمل ہو جائے گا اور ابھی جو تم "طلال" کے نام سے ہی گھبرا رہی ہو نا دیکھنا کہ کل تمہاری زبان "طلال طلال" کرتے نہیں سوکھے گی۔"

"شٹ اپ!" وہ بگڑ کر بولی۔

"خدا کے لیے اب یہ مت کہنا کہ تم نے ایسا کبھی سوچا نہیں تھا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی اور پنکی کی اس بات پر وہ کچھ چور سی ہو گئی۔

"ہاں ایسا کب، کس نے سوچا تھا کہ تم میرے ہو جاؤ گے۔" آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"یا پھر کہ شاید تم میرے ہی تھے۔"

اب کے ایک مدہم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری تھی۔

✡ ✡ ✡

رابیل کا صرف نکاح ہوا تھا کیونکہ رخصتی کو ان حالات میں مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔

یوں وہ طلال سے نکاح کے کچھ دن بعد دوبارہ سے اسلام آباد اپنی تعلیم مکمل کرنے چلی گئی جبکہ طلال اب وہیں جاب کر رہا تھا۔

پہلے تو رابیل ہی طلال سے بھاگتی تھی مگر اب یہ کام طلال بھی کرتا تھا۔ وہ دریا کے دو کناروں کی طرح تھے۔

رابیل کو بہت اچھی طرح سے یاد تھا کہ آخری دفعہ اس کی ملاقات طلال سے اپنی شادی سے کچھ روز پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک ان دونوں نے ملاقات تو کیا ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا۔

اسے وقتی طور پر طلال سے شادی پر حیرت ضرور ہوئی تھی مگر اب یہ چیز اسے حیران نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ بہت اچھی طرح سے یہ بات سمجھ چکی تھی

کہ۔۔۔ وہ اس کا ہی تھا اور اسے اس کے پاس ہی آنا تھا۔۔۔ اور اب اگر وہ بھاگ کر بھی اس سے دور جانا چاہے تو نہیں جا سکتا تھا۔

کرن اس کے لیے کیا ثابت ہوئی۔۔۔ یہ اللہ نے اسے دکھا دیا تھا اور اب رابیل علی اس کے لیے کیا ثابت ہو گی ...

اس بات کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔

✡ ✡ ✡

"کیا پڑھ رہی ہو؟" وہ اس کے پیچھے سے آکر بولے۔

"کچھ خاص نہیں۔" وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور پھر مسکرا کر بولی۔

"اتنی محنت کیوں کرتی ہو؟" خلاف توقع الٹ سوال آیا تھا۔

"کامیابی کے لیے۔"

"کامیابی تمہارے نزدیک کیا ہے؟"

"میں آج جس پوسٹ پر ہوں۔۔۔ آپ اسے میری کامیابی کہہ سکتے ہیں اور اس کے علاوہ کامیابی کیا ہو گی؟ میں نے تعلیم مکمل کی اور نہایت شاندار نمبروں کے ساتھ کی اور اب میں جاب کر رہی ہوں اور وہ بھی ایک اچھی کمپنی میں۔۔۔ آپ کو لگتا ہے کہ کامیابی کی تعریف اس کے علاوہ اور کوئی ہو سکتی ہے؟"

وہ لمحہ بھر خاموش رہے تھے۔۔۔ پھر بولے۔

"تمہاری ماں چاہتی ہے کہ تم جاب چھوڑ دو۔"

"وجہ؟" اس نے ایک ابرو اچکا کر پوچھا تھا۔

"انسان محنت اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ کامیاب ہو سکے اور کامیاب اس لیے ہونا چاہتا ہے تاکہ وہ پیسہ کما سکے۔۔۔ کیا غلط کہا؟" بات کرتے کرتے انہوں نے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔" وہ الجھ کر بولی۔

"تو تم بھی پیسا کمانا چاہتی ہو؟"

"کسی حد تک۔۔۔ مگر یہ پورا سچ نہیں ہے۔"

"اچھا چلو یہ بتاؤ کیا کرو گی؟" وہ چند لمحوں کے لیے

خاموش ہوئی تھی۔

"کچھ پیسے کو انویسٹ کر دوں گی اور پھر ایک اپنا شاندار سا گھر بناؤں گی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"گھر بناؤ گی۔۔۔ کیا گھر صرف پیسے سے بنتا ہے رانی!" انہوں نے بے حد سنجیدگی سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ خاموشی سے سر جھکا گئی۔

"جواب نہیں دیا تم نے؟" چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

"میرے کچھ کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے تایا جان!"

آزردگی سے کہتے ہوئے وہ رخ موڑ کر الماری میں کتاب واپس رکھنے لگی۔

"تم اپنی ماں کی بات مان لو۔"

"معذرت کے ساتھ مگر میں یہ کہوں گی کہ مجھے جاب نہیں چھوڑنی۔ ہاں! البتہ میں ٹرانسفر کروا سکتی ہوں۔"

اس کا اشارہ کس طرف تھا' یہ وہ بخوبی سمجھ گئے تھے۔

"خوش رہو۔" اس کا ماتھا چوم کر وہ چلے گئے۔ وہ خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری؟" کھانے کی میز پر اس کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

"اچھی جا رہی ہے۔" اس نے اپنی پلیٹ میں فرائیڈ رائس نکالتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کافی دنوں بعد آج گھر آیا تھا۔

"تمہارا ارادہ تو اسپیشلائزیشن کا تھا۔ کیا بنا اس کا؟"

"ابھی نہیں! کچھ عرصہ بعد جاؤں گا۔"

وہ کافی رغبت سے کھا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب رابیل کی رخصتی کروا لینی چاہیے۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔" اب کی بار یہ بات انہوں نے رافعہ سے کہی تھی۔

طلال نے یکدم کھانے سے ہاتھ روکا تھا۔ اس کی یہ حرکت کسی سے بھی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا ہوا؟" رافعہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"کھانا تو کھا لینے دیتے اسے۔" اس کے جانے کے بعد رافعہ نے ناراضی سے کہا تھا۔

"اب سب لوگوں نے کیوں ہاتھ روک لیا ہے۔ کھانا کھاؤ۔"

وہ باقی سب لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

★ ★ ★

زندگی میں اتنی بے یقینی اور بے بسی کا شکار وہ کبھی نہیں ہوئی تھی جتنا کہ وہ آج محسوس کر رہی تھی۔

گو کہ وہ گزشتہ دو سالوں سے طلال کے ساتھ اس بندھن میں بندھی ہوئی تھی اور کافی دفعہ وہ اس صورت حال کا تصور بھی کر چکی تھی مگر اب جبکہ حقیقت میں ایسا ہو چکا تھا تو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ یوں بن سنور کر طلال کا انتظار کرنے جیسی حماقت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت اچھی طرح سے اس کے دل میں موجود جذبات کا اندازہ کر سکتی تھی۔

وہ چینج کرنے کے ارادے سے اٹھی ہی تھی کہ دروازہ آہستگی سے کھلا تھا۔

بے اختیار اس کا دل دھڑکا تھا۔ آنے والا کون ہو سکتا ہے۔۔۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے طلال کو اندر آتے دیکھا۔ وہ اس پر سے نظریں ہٹا نہیں سکی۔ وہ سانس تک نہیں لے سکی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے عرصے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ چہرہ آہستہ آہستہ اس کے جسم میں گردش کرنے والے لہو کو گرما رہا تھا۔ قطرہ قطرہ کر کے اس کے اندر سکون انڈیل رہا تھا۔ وہ ان ہی آنکھوں سے اس چہرے

کے ایک ایک نقش کو اپنے دل میں جذب ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔

اس شخص کا چہرہ کمال کر رہا تھا۔۔۔ اور کیا کمال کر رہا تھا' اس بات سے وہ شخص بے خبر تھا۔

وہ چہرہ کسی کی ہستی' کسی کے وجود کو مکمل کر رہا تھا۔ وہ اس کا ہو چکا تھا۔۔۔ وہ اس ایک بات کا یقین کرنا چاہتی تھی مگر کیا بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ اس نے طلال کو اپنے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ خود کو پرسکون کرنا چاہ رہا تھا اور وہ بس اسے پلکیں جھپکائے بنا دیکھ رہی تھی۔

بغیر کسی جنبش کے۔۔۔ بنا کوئی حرکت کیے۔۔۔ بنا سانس لیے۔

جیسے وہ ذرا سی بھی حرکت کرے گی اور وہ خواب ٹوٹ جائے گا۔

بے ساختہ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس لمحے کی حقیقت کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ خواب نہیں تھا۔۔۔ جو آنکھیں کھول دینے پر ٹوٹ جاتا۔ وہ حقیقت تھی۔۔۔ اور اس کے سامنے تھی۔

وہ اب اپنا کوٹ اتار کر اسے ہینگ کر رہا تھا۔ وہ رابیل کو یوں نظر انداز کر رہا تھا جیسے کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ اب وہ شرٹ کے بٹن کھول رہا تھا۔ بے اختیار رابیل کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

وہ مڑی اور خاموشی کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنی جیولری اتارنے لگی۔ جیولری اتارنے کے بعد اس نے جھک کر اپنے پاؤں سے پازیبیں اتاری تھیں سیدھا ہوتے ہوئے اس کی نظر آئینے میں سے ہو کر طلال پر پڑی تھی۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اسے تکلیف ہوئی۔

ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے طلال پر سے نظریں ہٹالیں۔ اس نے دوپٹہ اتار کر ایک طرف رکھا اور کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

اور جب وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی تو طلال سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ اس نے لائٹ آف نہیں کی تھی اور اسی وجہ سے وہ آنکھوں پہ بازو رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔

"وہ اتنا خاموش کیوں تھا۔ کیا وہ پچھتا رہا تھا؟"

اسے الجھن ہوئی۔

ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اس نے لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلایا اور خود خاموشی سے کھڑکی کے پاس رکھے صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

وہ کھڑکی سے باہر طلوع ہونے والے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے گردن موڑ کر طلال کو دیکھا۔

وہ گہری نیند سو رہا تھا اور اس کا بازو اب اس کی آنکھوں پر سے ہٹ گیا تھا۔

اسے باہر نکلنے والے چاند اور طلال میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی بے حد خاموش اور خوب صورت تھے۔ وہ ایک دفعہ پھر سے بے اختیار ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"طلال! اگر میں مر جاؤں تو تمہیں رونا آئے گا۔"

یکدم وہ مسکرائی تھی۔ اسے برسوں پہلے پوچھا جانے والا سوال یاد آیا۔ اسے اور بھی بہت کچھ یاد آیا تھا۔

"اس کا جواب اب کیا ہو گا؟ کیا اب بھی وہ اسی طرح جھنجھلائے گا اور چڑ کر کون سی الٹی سیدھی بات کہے گا۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

بے ساختہ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا جہاں پر ہونے والے زخم کا نشان ابھی تک باقی تھا۔ اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے اسے وہ لمس یاد آیا تھا۔ اور وہ آج۔۔۔ اس وقت اس لمس کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

اپنے ہاتھ سے نظریں ہٹا کر اس نے ایک دفعہ پھر طلال کے چہرے کو دیکھا۔

وہ کتنا بدل چکا تھا اور کس قدر ہینڈسم ہو چکا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ بہت والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ آج اسے مکمل آزادی تھی۔ سو وہ اس آزادی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔

صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے خود کو

پرسکون کیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اتنے ہی آرام اور سکون کے ساتھ سو رہی تھی جتنے۔ آرام کے ساتھ طلال۔

☼ ☼ ☼

رات کو کسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے شدید پیاس لگی تھی۔ یکدم آنکھیں کھولنے پر اس نے خود کو غائب دماغی کی سی کیفیت میں پایا تھا۔

سر کو جھٹکتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے پانی کے جگ میں سے پانی لے کر پیا تھا اور گلاس دوبارہ ٹیبل پر واپس رکھتے ہوئے اس کی نظر رابیل پر پڑی تھی۔

وہ بری طرح سے چونکا تھا۔

زندگی میں شاید ہی اس نے کبھی یہ سوچا ہو کہ اس کے بیڈ روم میں آنے والی عورت کرن کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتی ہے۔

وہ وہاں... اس جگہ پر صرف ایک ہی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سات سال اس نے ایک ہی تمنا' ایک ہی چاہ کی تھی۔ اور کیا مذاق تھا؟ اس کے لاکھ خواہش کرنے' لاکھ چاہنے پر بھی وہ عورت وہاں موجود نہیں تھی جہاں پر اسے ہونا چاہیے تھا۔ اور جو وہاں موجود تھی...

اس نے بے اختیار رابیل کو دیکھا تھا۔

"کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ عادل سے ہی شادی کر لیتی... دوسری بیوی ہی سہی... وہ کم از کم اس کی بیوی تو ہوتی۔ میرے جیسا شخص اسے کیا دے سکتا ہے۔"

بے ساختہ اس کے پچھتاووں میں اضافہ ہوا تھا۔

سات سال تک اس عورت کو میں نے پاگلوں کی طرح چاہا' اس کی ہر غلطی... ہر نادانی کو نظر انداز کیا۔ اس کے نخرے برداشت کیے۔ اس کے ناز اٹھائے۔ اس نے جو کہا میں نے مانا... اور پھر... پھر کیا ہوا؟ جس کے پیچھے میں آنکھیں بند کر کے چلتا رہا' جسے اپنی قسمت' اپنا نصیب سمجھتا رہا... وہ سرے سے میری قسمت' میرے نصیب میں تھی ہی نہیں۔

اور جو تھی... وہ یہاں اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود تھی۔ اسے میری زندگی میں شامل ہونے کے لیے محبت جیسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی تھی بلکہ اسے تو سرے سے کسی سہارے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

اس کا آنا طے تھا... سو وہ آ گئی۔

اور میں... میں کیا ہوں؟

ایک ہارا ہوا شخص...

یا پھر...؟ وہ رک کر سوچنے لگا۔

اس شخص کو کیا کہا جائے گا؟ جس نے جو خواہش کی... وہ اسے مل گیا۔

اور پھر یکدم سات سالوں بعد... اسے بتایا گیا کہ جو چیز جتنی آسانی سے دی جا سکتی ہے... وہ اتنی ہی آسانی کے ساتھ واپس بھی لے جا سکتی ہے۔

اور جو چیز چھن جائے' دے کر لے لی جائے وہ بندے کو مار دیتی ہے۔ سیدھا کھڑا ہونے کے قابل نہیں چھوڑتی۔

اور پھر ساری عمر انسان اپنا توازن ہی برقرار نہیں رکھ سکتا۔

نہ ملنے پر صبر آ جاتا ہے مل کر چھن جانے پر صبر آتا ہے اور نہ سکون۔"

اس نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا تھا۔

کسی کا خواہش سے حسرت تک کا سفر تمام ہوا تھا اور کوئی اس سفر کی شروعات کا مزا چکھ رہا تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر رابیل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ چہرہ کوئی کمال نہیں کر رہا تھا۔

کوئی جادو نہیں جگا رہا تھا۔ کسی ایک احساس' کسی جذبے تک کو ہوا نہیں دے رہا تھا۔

نائٹ بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کے چہرے کے دونوں اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحوں تک خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ بے ساختہ گہرا سانس بھر کر اس نے رابیل پر سے نظریں

ہٹائی تھیں۔

"سات سال کم نہیں ہوتے... زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں اور مجھے لگتا ہے میں نے جتنا جینا تھا ان سات سالوں میں جی لیا۔" اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا تھا۔

بے بسی کس چیز کا نام ہے اور بے چارگی کسے کہتے ہیں...

یہ اس وقت طلال حیدر سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رابیل!" یہ شادی کے پانچ چھ دن بعد کی بات تھی جب طلال نے اسے پکارا تھا۔ وہ کچھ حیران ہو کر پلٹی تھی۔

"مجھے بلایا؟" اس نے بہت حیرت سے پوچھا۔

جواباً اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تھا۔

یہ شادی کے بعد ان دونوں کے درمیان ہونے والی پہلی گفتگو تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ چند لمحوں تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا' میں تم سے کیا بات کروں۔ میرے پاس کوئی لفظ' کوئی حرف' کوئی جملہ' کوئی ایک بات تک نہیں ہے۔"

وہ ایک دفعہ پھر سے خاموش ہوا تھا۔

رابیل کو اس کی خاموشی بری طرح سے چبھی تھی۔

"میں تمہیں لاہور ساتھ نہیں لے کر جانا چاہتا پلیز... یہ تمہارا احسان ہو گا اگر تم..."

"طلال! اگر تم پہلے بتا دیتے تو میں اپنا ٹرانسفر کروا دیتی مگر اب تو وہ ہو چکا۔"

طلال کی بات کاٹ کر کے اس نے ہچکچا کر کہا تھا۔

طلال نے بہت بے چارگی سے اسے دیکھا۔

بے اختیار وہ شرمندہ ہوئی تھی۔

"پلیز! مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اب وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

رابیل بہت تیزی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پیچھے ہٹو! مجھے اپنا ناشتا بنانا ہے۔" اس نے کچن میں آ کر سخت لہجے میں کہا۔

اپنا ناشتا بناتی رابیل کے ہاتھ یکدم ساکت ہوئے تھے۔

"تم دیکھ نہیں رہے کہ میں اپنا ناشتہ بنا رہی ہوں۔" اس نے سر سے لے کر پاؤں تک طلال کو طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھو! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے اپنی عادت کے خلاف نرمی سے کہا تھا۔

"تو میں کیا کروں؟" ادھر بے نیازی اپنے عروج پر تھی۔

"مجھے ناشتا بنا لینے دو پھر تم اپنا ناشتا بنا لینا۔" اب بھی اس نے نہایت تحمل سے بات کی تھی۔

"ایسا میں کس خوشی میں کروں؟" ایک ابرو اچکا کر اس نے سوال کیا تھا۔

طلال اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اس کی بے نیازی اور ہٹ دھری پر اسے بے حد غصہ آیا تھا۔

وہ اپنا ناشتا پلیٹ میں رکھ کر ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف مڑی تھی۔

طلال نے خاموشی سے اس کا ناشتا اٹھایا اور باہر ٹیبل پر بیٹھ کر بہت آرام سے وہ اب اس کا ناشتا کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ دھو کر مڑی اور بھونچکا رہ گئی۔

اسے سمجھنے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں لگی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" کچن سے باہر نکل کر اس نے تیز آواز میں کہا تھا۔

طلال نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس نے ٹائی کی ناٹ درست کی اور بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

بے ساختہ رابیل نے گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اگر وہ اسے اپنا بنایا ہوا ناشتا پیش کرتی تو وہ کبھی بھی نہ لیتا۔ وہ جس طریقے سے لے سکتا تھا اس نے وہی طریقہ استعمال کیا تھا۔

اسے بہت اچھی طرح سے یاد تھا جب وہ پہلے دن طلال کے لیے ناشتا بنانے لگی تھی۔

"ناشتے میں کیا لیں گے؟" اس نے کچھ ہچکچا کر پوچھا تھا۔

وہ اپنے جوتوں کے تسمے باندھ رہا تھا' تسمے باندھنے چھوڑ کر اس نے بہت عجیب سی نظروں کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

"اپنے کام سے کام رکھو۔" چند لمحوں بعد بے حد ٹھنڈے لہجے میں اس نے کہا۔ اسے بری طرح سے اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی۔

یہ اس دن کے ٹھیک دو ہفتوں کے بعد کا واقعہ تھا۔ طلال کو کس طرح ڈیل کرنا ہے' یہ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنے لیے ناشتا تیار کیا اور پھر آفس جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔

اپنی تیاری مکمل کرنے کے بعد اس نے تمام کمروں کو مقفل کیا اور پھر فلیٹ کو بھی مقفل کرکے وہ آفس چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کے درمیان بہت ہی کم بات چیت ہوتی تھی اور جب ہوتی' تلخ کلامی پر ہی مبنی ہوتی تھی۔

اس دن کے بعد سے رابیل نے پھر کبھی اس کے معمولات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔

وہ عموماً اس وقت آتا تھا جب وہ سوچکی ہوتی تھی۔ وہ آکر کھانا کھاتا (جو کہ رابیل نے ہی بنایا ہوتا تھا) ایک کپ چائے کا پیتا اور پھر وہ رات گئے تک نیٹ پر بیٹھا رہتا تھا۔

وہ ایک ہی گھر میں اس طرح سے رہ رہے تھے جس طرح کہ ہاسٹل میں رہا جاتا ہے۔ وہ دونوں اپنا ہر کام خود کرتے تھے۔ رابیل کو بہت اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر وہ اس کی خدمت کرنے کے شوق میں اس کے معمولات میں دخل اندازی کرتی تو وہ الٹا اس سے بیزار ہوجاتا۔ لہٰذا اسے چڑا کر غصہ دلا کر وہ اسے مجبور کردیتی تھی سو وہ غصے میں آکر وہی کام کرتا تھا جو رابیل چاہتی تھی۔

وہ بہت محو ہوکر ٹی وی دیکھ رہی تھی جب اس نے طلال کو خلاف معمول گھر آتے دیکھا۔

بظاہر اس کی محویت کچھ اور بڑھ گئی تھی مگر اس کی ساری حسیات طلال کی جانب ہی متوجہ تھیں۔ لاؤنج سے بیڈ روم کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

اس نے آتے ہی بریف کیس بیڈ پہ پھینکا اور وارڈ روب کھول کر کھڑا ہوگیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے طلال کو سیاہ جینز نکالتے ہوئے دیکھا۔

اب اس کے ساتھ اسے سفید شرٹ چاہیے ہوگی اور اس کی سفید کیا تمام کی تمام شرٹس میلی پڑی ہیں۔ "اب پتا نہیں کون سا طوفان آئے گا۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

اور ہوا بھی یہی تھا۔ اس نے سفید شرٹ نکالی تھی جو کہ گندی تھی۔ کچھ کوفت کے عالم میں اس نے شرٹ کو کارپٹ پہ پھینکا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک اور شرٹ نکال رہا تھا مگر وہ بھی گندی تھی اور اس طرح کرکے اس نے تقریباً ساری گندی شرٹس کا ڈھیر کارپٹ پہ لگا دیا تھا۔

"جب مجھے کہتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو تو یہی ہونا تھا نا۔ دو ہفتوں سے اس کی عقل کیا گھاس چرنے گئی تھی یا پھر اس نے سوچ لیا تھا کہ اس کے کپڑے خود بخود لانڈری سے دھل کر آجائیں گے۔"

ایک دفعہ پھر سے وہ بڑبڑائی تھی۔

"کس قدر جاہل اور پھوہڑ عورت ہو تم۔" اس کا غصہ یقیناً آخری حد بھی کراس کرچکا تھا لہٰذا اب وہ کمرے کے دروازے پہ کھڑا مشتعل ہوکر کہہ رہا تھا۔

رابیل نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میرا قصور؟"

"میرے سارے کپڑے میلے ہیں اور تمہیں ٹی وی سے ہی فرصت نہیں۔"

"اگر تمہارے کپڑے میلے ہیں تو میں کیا کروں؟ میں تو تمہارے کپڑے نہیں دھوتی۔ بندے کو خود خیال ہونا چاہیے۔"

وہ بگڑ کر بولی تھی۔

"سارے خیال میں رکھوں تو تم کس حیثیت سے یہاں موجود ہو؟" وہ بھڑک کر بولا۔

رابیل کا دل یکدم کھلکھلا کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ وہ اسے اس کی حیثیت بتا رہا تھا۔ "تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

اچانک ریموٹ کو صوفے پر پٹخ کر وہ کھڑی ہوکر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"ثابت کیا کرنا ہے' جو کچھ ہے' وہ سامنے نظر آرہا ہے۔" وہ بے حد طنزیہ لہجے میں بولا۔

چند لمحوں تک وہ طیش کے عالم میں اسے گھورتی رہی' پھر ایک جھٹکے سے اسے کمرے کے دروازے سے ہٹا کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

"ابھی بتاتی ہوں کہ رابیل ہے کیا؟" اسے چیلنج کرنے کے سے انداز میں کہتی وہ کمرے سے نکل کر چلی گئی تھی۔ اس ہاتھ میں وہی سفید شرٹ تھی۔

وہ جھنجلا کر ایک دفعہ پھر سے وارڈ روب سے کوئی معقول شرٹ تلاش کرنے لگا تھا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اس کی میلی شرٹ کو دھو کر' اور پھر پریس کرکے لے آئی تھی۔

"اب بتاؤ' پھوہڑ کون ہے اور جاہل کسے کہا تھا تم نے؟" وہ اس کے پیچھے سے آکر بولی تھی۔

وہ اس کے ہاتھ میں دھلی دھلائی شرٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے کچھ غصے کے عالم میں شرٹ کو بیڈ پر پھینکا تھا۔

"آئندہ اگر مجھے جاہل کہا تو مجھ سے برا کوئی اور نہیں ہوگا۔ سمجھے تم۔" وہ اب انگلی اٹھا کر اسے خبردار کررہی تھی۔

"دماغ مت کھاؤ میرا۔" وہ چڑ کر بولا۔

آج اسے ایک انتہائی اہم ڈنر پر جانا تھا اور اسی وجہ سے وہ جلدی گھر آگیا تھا۔

یقیناً اس کا آج کا ڈنر مس ہوجاتا اگر رابیل بروقت اپنے سگھڑاپے کا عملی مظاہرہ نہ کرتی تو۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح خلاف معمول اور حیران کردینے والی تھی۔ اس کے کپڑے استری شدہ تھے' جوتے پالش تھے اور اب وہ پانی پینے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو وہاں پانی کے جگ کی بجائے تازہ جوس سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ناشتے کے تمام لوازمات بھی موجود تھے۔

اس کی حیرانی اب پریشانی میں بدل رہی تھی۔ کیونکہ یہ شادی کے چار ماہ کے بعد ہونے والا اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔

اس نے کچن میں مصروف رابیل پہ ایک نظر ڈالی تھی۔ یکدم اسے رابیل کی دماغی حالت پہ شبہ ہوا تھا۔ لیکن پہلے دن کی طرح اسے یہ سب برا نہیں لگا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ کچن میں اس کے پاس جاکر بولا۔

"لگتا ہے تمہارے گلاسز کا نمبر بڑھ گیا ہے۔" اس نے رخ موڑ کر تیکھے لہجے میں کہا تھا۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔" وہ بدمزا ہوکر بولا۔

"اسے اردو میں "ناشتا" اور انگلش میں "بریک فاسٹ" کہتے ہیں۔ فارسی کیا کہتے ہیں۔۔۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔" اس نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

"مگر میں تم سے۔۔۔"

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔ کل تم نے مجھ کہا تھا کہ میں پھوہڑ ہوں' جاہل ہوں اور کل کو تم یہ بھی کہو گے کہ میں کام چور ہوں اور تمہارے پیسوں پر عیش کرتی ہوں مزید تم نے یہ کہا کہ میں کس حیثیت سے یہاں موجود ہوں تو مجھے خیال آیا کہ کل کو تم یقیناً یہ بھی کہو گے کہ میری زندگی اس نکمی' کاہل' بدسلیقہ

غود ستے نے تباہ کر کے رکھ دی ہے۔

"سو یہ سب اسی بات کا ثبوت ہے کہ میں پھوہڑ جاہل ہوں اور نہ ہی کام چور مزید یہ کہ اب تمہیں میں بتاؤں گی کہ میں کس حیثیت سے یہاں موجود ہوں۔"

وہ ہکا بکا ہو کر اس کی فرانٹے بھرتی زبان کے جوہر دیکھ رہا تھا۔

"اب جاؤ یہاں سے۔۔۔ صبح ہی صبح میرا موڈ خراب کرنے آ گئے ہو۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر لڑاکا عورتوں کی طرح بولی تھی۔

طلال بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

حیرت انگیز طور پر اسے غصہ آیا تھا اور نہ ہی مشتعل ہوا تھا بلکہ بے ساختہ اس نے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

جب سے اس نے رابیل سے شادی کی تھی اس کی زندگی عجیب سی ٹینشن کا شکار ہو گئی تھی۔

وہ رات دیر تک کام کرتا رہتا اور پھر اسے صبح جلدی اٹھنا پڑتا تھا تاکہ وہ وقت پر اپنا ناشتا بنا سکے اور یہ کام وہ رابیل سے پہلے کر سکے مگر اکثر وہ اس میں ناکام رہتا تھا۔ یوں اس کا صبح کا ناشتا رہ جاتا تھا اور ہسپتال جا کر اتنے بکھیڑے ہوتے تھے کہ وہ لنچ میں ہی کچھ کھانے کے قابل ہوتا تھا۔ ٹینشن کی حد صرف یہیں تک نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی دھیان رکھنا ہوتا تھا کہ اپنے کپڑے کب لانڈری میں دینے ہیں اور کب لے کر آنے ہیں۔ وہ اکثر دو دو دن تک جوتے پالش نہیں کرتا تھا۔ ایک دن کی پہنی ہوئی شرٹ کو بھی وہ دو تین دن تک چلاتا رہتا تھا۔

یہ تمام چیزیں مل کر اسے بدمزاج، چڑچڑا اور غصیلا بنا رہی تھیں۔ اس دن کے بعد سے طلال کو یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو یوں جیسے اس نے بہت دنوں بعد کھل کر سانس لیا ہو۔ اس کی زندگی میں سکون نہ سہی مگر ٹھہراؤ ضرور آ گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رابیل اس کی زندگی پر اثر انداز ہو مگر اس کے باوجود ایسا ہو چکا تھا۔

بہت کچھ ایسا ہوا تھا جو کہ اس کی خواہش کے برعکس ہوا تھا اور اب ایک چیز اور سہی۔

اسے بیٹھے بٹھائے بنا کوئی ہاتھ پاؤں ہلائے سب کچھ تیار مل رہا تھا تو وہ یقیناً "پاگل" نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"طلال!" وہ سگریٹ پیتے ہوئے لیپ ٹاپ پر اپنا کام کر رہا تھا جب اسے رابیل کی آواز سنائی دی تھی۔

اس نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے تھوڑی دیر کے لیے تمہارا لیپ ٹاپ چاہیے تھا۔ نیٹ یوز کرنا تھا۔"

وہ اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنا کام وائنڈ اپ کیا اور لیپ ٹاپ ٹیبل پر سے تھوڑا پرے کھسکا کر اسے اشارہ کیا تھا۔

رابیل لیپ ٹاپ اٹھا کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی میلز چیک کر رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے وہاں سے طلال کو اٹھتے ہوئے اور پھر ٹیرس پہ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"اب یہ پاگلوں کی طرح سگریٹ پھونکے گا۔ دنیا کا شاید یہ واحد ڈاکٹر ہے جو خود بھی سگریٹ پیتا ہے اور اپنے مریضوں کو منع بھی کرتا ہے۔" وہ سر جھٹک کر بڑبڑائی تھی۔

طلال نے کافی دیر بعد گردن موڑ کر رابیل کو دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک لیپ ٹاپ پر مصروف تھی۔

"اور یہ اس کی تھوڑی دیر ہے۔" وہ جھنجلا کر زیر لب بولا تھا۔

اس کی ایک کولیگ کی پچھلے دنوں شادی ہوئی تھی اسی نے رابیل کو اپنی شادی کی تصاویر میل کی تھیں جن میں رابیل کی بھی تصویریں شامل تھیں۔

میلز چیک کرتے ہوئے اور ان کے جوابات لکھتے ہوئے اس نے وہ تصویریں بھی ڈاؤن لوڈ کرنا شروع کر دی تھیں۔

اچانک اسے اپنے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی تھی۔ آواز اس کے بیڈ روم سے آ رہی تھی۔ وہ ڈاؤن لوڈنگ کو بہ دستور یں چھوڑ کر فون سننے گئی تھی۔

طلال نے پھر اسے دیکھا۔ اس کی وجہ سے طلال کے کام کا حرج ہو رہا تھا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

"بتا نہیں سکتی تھی کیا؟" وہ ناگوار سے بولا تھا۔

اور جب وہ ٹیرس سے آ کر لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر لیپ ٹاپ کو اپنی گود میں رکھنا چاہا تو بڑے بے ساختہ انداز میں اس کی نظریں اسکرین پر پڑی تھیں۔

اس کا بڑھا ہوا ہاتھ وہیں پر ساکت ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہی سہی مگر وہ اسکرین پر سے نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت بہترین تصویر تھی۔

اس کا حسن اس تصویر میں بہت واضح ہو کر سامنے آیا تھا۔ رابیل ابھی تک فون پر مصروف تھی۔ طلال نے اپنے اندر ایک شدید اشتعال کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔ اس نے خاموشی سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے وہ مسلسل تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ کی طرح اس تصویر کا ایک ایک نقش اسے سلگا رہا تھا۔

رابیل فون سن کر باہر آئی۔

طلال اسکرین کو پلکیں جھپکائے بنا دیکھ رہا تھا۔

"اوہ۔۔۔۔ یہ ہو گئی۔" صوفے پر اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ اس کے آگے سے اٹھا کر اپنے سامنے کرتے ہوئے عام سے انداز میں بولی۔ طلال نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے گھورا۔

"تم ایسی حرکتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو رابیل علی؟" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ اس نے حیران ہو کر طلال کو دیکھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہاری اس حسین تصویر کو دیکھنے کے بعد میں تمہارے حسن کے قصیدے پڑھنے لگوں گا یا پھر تم پر فدا ہو جاؤں گا۔ جب تم بذات خود مجھ پر اثر نہیں کر سکیں تو یہ تصویر کیا چیز ہے؟"

اب کے اس نے تنفر سے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

"تم تمام عورتیں ایسا ہی کرتی ہو۔ خود کو نمایاں کرنے کے لیے "اپنی تعریفیں وصول کرنے کے لیے" تمہیں جتنی بھی گھٹیا حرکت کرنی پڑیں تم کرتی ہو۔"

وہ اب سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے کو پاؤں کے نیچے مسل رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا وہ سگریٹ کا ٹکڑا نہیں اس کا وجود اپنے پاؤں کے نیچے مسل رہا تھا۔

"تم ہو، کرن ہو یا پھر کوئی تیسری عورت سب ہی ایک جیسی ہو۔"

"تم مجھے کرن کے ساتھ مت ملاؤ۔" اچانک اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"کرن کیا تھی۔۔۔ یہ تم نے دیکھ لیا۔ رابیل کیا ہے؟ یہ تمہیں ابھی دیکھنا ہے۔ اور تم میرے محرم ہو خود کو تمہارے سامنے نمایاں کرنے کے لیے یہ تصویر کیا۔۔۔ میں اس سے بھی آگے جا سکتی ہوں۔ شوہر ہو تم میرے۔ تمہاری تعریف وصول کرنے پر حق ہے میرا اور اس کے لیے بھی میں کسی بھی حد کو پار کر سکتی ہوں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو رابیل کو تمہیں متاثر کرنے کے لیے ایسی کسی تصویر کی ضرورت ہے؟" وہ تصویر کی طرف اشارہ کر کے نخوت سے بولی۔

"تم میرے ہو۔۔۔۔ یہ بات کب تمہیں سمجھ میں آئے گی۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا۔۔۔۔ جس نے طلال کو خاموش رہنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ کچھ اور بول ہی نہیں سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

معمول کا کام انجام دینے کے بعد وہ اپنے لیے کافی کا مگ تیار کر کے ٹیرس پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت سوا دس بج رہے تھے۔ وہ آتی سردیوں کی ایک خوشگوار رات تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی میں کافی کا مگ اسے عجیب سا لطف دے رہا تھا۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑی موسم اور کافی کو

انجوائے کرتی رہی تھی۔ کافی ختم کرکے وہ کچن میں گئی' کافی کا مگ دھو کر ریک میں رکھا اور لائٹ آف کر کے وہ لاؤنج میں آگئی تھی۔

ٹی وی کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر وقت دیکھا تو بری طرح سے چونکی تھی۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

"طلال ابھی تک نہیں آیا۔" وہ بڑبڑائی۔

اس کا دیر سے آنا کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی لیکن تمام تر کشیدگی' تکلف اور گریز کے باوجود اگر اس نے لیٹ نائٹ آنا ہوتا یا پھر وہ نائٹ ڈیوٹی پہ ہوتا تو اسے ضرور مطلع کر دیا کرتا تھا۔

"ہو سکتا ہے ابھی اس کا فون آجائے یا پھر وہ خود ہی آجائے۔"

یہ سوچتے ہوئے اس نے ٹی وی دیکھنا شروع کیا تھا۔ چند لمحوں بعد اسے نیند آنے لگی تھی۔

ٹی وی آف کرکے ۔۔۔ تمام کمروں اور بیرونی دروازے لاک کرنے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

وہ جب بھی آتا دوسری چابی سے دروازہ کھول کر اندر آسکتا تھا۔ اس چیز سے بظاہر وہ مطمئن تھی' لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں اس کے لاشعور میں یہ بات موجود تھی کہ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وہ بمشکل آدھا گھنٹہ بھی نہیں سو پائی تھی کہ اس کی آنکھ دوبارہ کھل گئی تھی' طلال ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اس نے وقت دیکھنا چاہا تھا لیکن نیند کے غلبے کے باعث وہ ایسا کر نہیں پائی تھی اور دوبارہ سو گئی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ دو بج چکے تھے اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"کیا وہ ابھی تک نہیں آیا؟" وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

"ہو سکتا ہے وہ آچکا ہو اور لاؤنج میں بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر کام کر رہا ہو۔" وہ اٹھ کر لاؤنج میں آئی وہاں کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا سوائے خاموشی اور سناٹے کے۔

اس کے پورے بدن میں سر سے لے کر پاؤں تک ایک لہر سی دوڑی تھی۔ بے اختیار اس کے ہاتھ کپکپائے تھے۔ اس نے طلال کا نمبر ڈائل کیا۔

اس کا نمبر آف تھا۔ رابیل کا دل ڈوبا تھا۔

اب کی بار اس نے فون انڈیکس سے اس کے ہسپتال کا نمبر تلاش کیا اور لینڈ لائن سے اس کے نمبر پر کال کی تھی۔

"ڈاکٹر طلال سے بات ہو سکتی ہے؟"

اس نے ڈیوٹی پر موجود شخص سے کپکپاتے لہجے میں پوچھا تھا۔

"آپ ......"

"مسز طلال۔" وہ اس کے پوچھنے سے پہلے بول پڑی تھی۔

"ہولڈ آمنٹ میم۔" اور اس ایک منٹ میں اس نے اپنی بے تحاشا' بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو محسوس کیا تھا۔

وہ ایک منٹ ۔۔۔ ایک منٹ نہیں رہا تھا۔ یوں جیسے وہ ایک منٹ ایک صدی ہو گیا تھا۔

"میم! وہ ابھی ابھی ہسپتال سے گھر کے لیے نکلے ہیں وہ ایک ایمرجنسی کیس کو ڈیل کر رہے تھے۔" وہ شخص بہت مہذب لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ بول نہیں سکتی تھی' حتیٰ کہ وہ اس شخص کو تھینکس تک نہیں کہہ پائی اور اس نے خاموشی سے فون رکھ دیا تھا۔

یہ اس کے بے حد تیزی سے امڈ کر آنے والے آنسو تھے جس کی وجہ سے وہ بات نہیں کر پائی تھی۔ وہ وہیں لاؤنج میں پڑے صوفے پر دونوں پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ دونوں بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر اس نے اپنا سر ان پر رکھ دیا تھا۔ وہ بے حد خاموشی کے ساتھ رو رہی تھی اور بے تحاشا رو رہی تھی۔ بنا کوئی آواز پیدا کیے اور اک تسلسل کے ساتھ۔

چند لمحوں بعد اسے فلیٹ کے نیچے گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی اور اب اسے معلوم تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا ہو گا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس نے فلیٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

وہ اٹھی اور ٹیرس پہ چلی گئی۔ وہ کم از کم اس وقت اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

طلال نے قدرے حیران ہو کر اس کی پشت کو دیکھا۔

"یہ ابھی تک جاگ رہی ہے۔" وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب وہ سونے کے لیے لیٹنے لگا تو اسے یہ دیکھ کر ایک دفعہ پھر سے حیران ہونا پڑا تھا کہ رابیل ابھی تک ٹیرس پر ہی کھڑی تھی۔

یکدم اسے احساس ہوا کہ اس نے کیا کر دیا تھا۔

"آدھی رات کو تم یہاں کر رہی ہو؟" اس نے رابیل کے پیچھے آکر سوال کیا تھا۔

(حالانکہ اسے اس سوال کے کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ جانتا تھا) وہ خاموش رہی۔

"تم سوئیں کیوں نہیں؟" چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ پوچھا حالانکہ وہ یہ بات بھی جانتا تھا۔

رابیل اب بھی خاموش رہی تھی۔

طلال بے ساختہ جھنجلایا "کیا قوت گویائی کھو گئی ہے تمہاری؟"

پیچھے سے اسے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے وہ بگڑ کر بولا۔ پھر یکدم اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کیوں خاموش تھی۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی۔

یوں رخ موڑنے پر ٹیرس پہ جلنے والی لائٹ سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور طلال بخوبی اس کی سرخ ہوتی آنکھیں اور بھیگی پلکیں دیکھ سکتا تھا۔

اس سے اپنے آنسو چھپانے کے لیے رابیل نے فوراً ہی آستین سے چہرہ صاف کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اب کی بار اس نے بے حد نرمی سے پوچھا۔ طلال کے اس انداز پر اسے اور رونا آیا تھا۔

"رو کیوں رہی ہو؟" اس سوال پر وہ سر جھکا گئی تھی تاکہ اس کے آنسوؤں میں آنے والی روانی وہ نہ دیکھ سکے۔

وہ چند لمحوں تک اسے یونہی آنسو بہاتا دیکھتا رہا۔

"اس طرح رونے سے تمہیں لگتا ہے کہ تمہارا مسئلہ میری سمجھ میں آجائے گا۔" کب کے وہ ذرا غصے سے بولا تھا۔

رابیل نے اس کی سائیڈ سے ہو کر اندر جانے کی کوشش کی۔

یکدم طلال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔ یہ ایک لاشعوری حرکت تھی۔

اس لمس کو آخری بار اس نے کب محسوس کیا تھا' وہ یاد نہیں کر پائی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی حدت کے نیچے اپنے لہو کی تیز ہوتی گردش محسوس کر سکتی تھی۔ یوں جیسے اس لمس نے پانی میں آگ لگا دی تھی۔

"تمہیں میرے مسئلوں سے اتنا ہی لاپروا ہونا چاہیے جتنا کہ تم خود میری ذات سے لاپروا ہو۔" وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے بھیگی آواز میں بولی۔

"ایک ایمرجنسی کیس تھا' چاہ کر بھی تمہیں انفارم نہیں کر سکا' میرا خیال تھا کہ تم سو چکی ہو گی۔" وہ رخ موڑ کر بولا۔

اس سارے عرصے میں اس نے پہلی دفعہ طلال کو دیکھا تھا۔

"تو تمہیں میرے رونے کی وجہ معلوم تھی!" اس کے احساسات عجیب سے ہو گئے۔

"جب تمہیں میرے رونے کی وجہ معلوم ہے تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں کس قدر پریشان ہو جاتی ہوں اور تم نے ۔۔۔"

"جاؤ ۔۔۔ جا کر سو جاؤ۔" اس نے سر جھکا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا۔

اور اسے ایک دفعہ پھر سے ٹوٹ کر رونا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پچھلے کافی دنوں سے رابیل کی خاموشی اور سنجیدگی کو نوٹ کر رہا تھا۔ ایسا اس دن کے واقعہ کے بعد ہوا تھا۔ وہ پہلے کون سا بہت زیادہ بولتی تھی مگر پھر بھی وہ اس کی حد سے زیادہ خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔

وہ بہت گم صم اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تھا جو اس نے نوٹ کیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے رابیل کے سیل کی رنگ ٹون سنی تھی۔

اور اب وہ فون سننے کے ساتھ ساتھ کچن کے کام بھی کر رہی تھی۔ اس نے سیل فون کو کندھے اور چہرے کے درمیان دبایا ہوا تھا۔ طلال اس وقت لاؤنج میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ٹی وی بھی چل رہا تھا۔

"بات کرلو... پنکی ہے۔" رابیل نے آکر کہا۔

اس کے ہاتھ سے فون لے کر وہ پنکی سے بات کرنے میں مشغول ہو گیا تھا اور رابیل واپس مڑ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد طلال کو عجیب سا احساس ہوا تھا۔ یکدم خاموش ہو کر اس نے سامنے دیکھا۔ رابیل ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ طلال نے کچھ حیرت سے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تھا اور اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ شاید ٹی وی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ ایک جوڑا بے حد خوشگوار موڈ میں کسی ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ دونوں کسی بات پہ ہنسے تھے اور ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا۔ ایک دفعہ پھر سے اس نے رابیل کو دیکھا۔ وہ کسی بُت کی ساکت وہ منظر دیکھ رہی تھی۔

"رابیل!"

"ہوں!" وہ جیسے خواب سے جاگی تھی۔

"یہ لو!" اس نے سیل اس کی طرف بڑھایا۔

وہ سیل لے کر دوبارہ کچن میں چلی گئی تھی۔

اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایسا کئی دفعہ پہلے بھی کر چکی تھی۔

یہ کچھ دن پہلے کی بات تھی۔ اسے تیار ہوتا دیکھ کر طلال نے اس سے کہا تھا۔

"آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ خود بھی کہیں جا رہا تھا۔

"مون مارکیٹ جانا ہے... واپس بھی لے کر آؤ گے تو ٹھیک ہے ورنہ رہنے دو۔" اس کی آفر کے جواب میں اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کیوں... مگر وہ تیار ہو گیا تھا۔

وہ اچھی بھلی شاپنگ کر رہی تھی جب ایک دکان میں طلال نے اسے اسی طرح سے ٹھٹک کر رکتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ منظر بھی کم و بیش ٹی وی پہ چلنے والے سین کی طرح کا ہی تھا۔

اور ابھی کل کی بات تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے گھر آئے تھے۔

رابیل فلیٹ کا دروازہ کھول رہی تھی اور طلال اوپر آنے والی سیڑھیوں کے اختتام پر تھا۔ اس نے چابی لاک میں ڈال کر گھمائی تھی اور پھر یوں جیسے وہ اسے کھولنا بھول گئی تھی۔

وہ گردن موڑ کر ساتھ والے فلیٹ کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس فلیٹ میں چند دن پہلے ہی ایک نیا جوڑا آیا تھا۔

وہ دونوں شاید کسی بات پہ لڑ رہے تھے یا پھر ویسے ہی نوک جھونک ہو رہی تھی۔ بہر حال وہ ہر لحاظ سے آسودہ لگ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد رابیل نے سر جھٹک کر اس منظر سے نگاہیں ہٹائی تھیں۔

وہ کیا چاہ رہی تھی... کیا محسوس کر رہی تھی۔ طلال اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔

کتنے ماہ ہو گئے ہماری شادی کو؟ اس نے آنکھیں سکیڑ کر سوچنے کی کوشش کی تھی۔ چھ ماہ یا شاید سات یا پھر آٹھ... اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آیا تھا۔

ایسا کب تک چلے گا؟ اس نے اضطراری انداز میں کچن کی طرف دیکھا تھا۔

کیا کبھی اس عورت کے لیے میرے دل میں گنجائش نکل سکے گی؟ یا پھر ساری عمر اسی طرح سے گزرے گی۔

ظلم کیا تھا؟ وہ جو عادل، رابیل پہ کرنے جا رہا تھا یا پھر جو میں کر رہا ہوں... اس نے بے چینی سے سگریٹ سلگایا۔

اس کی بھی تو منگنی ہوئی تھی، اس نے بھی عادل کو اسی طرح سے چاہا ہو گا جس طرح کہ میں نے کرن کو... تو پھر یہ اتنی مطمئن کیسے ہے؟

اس کی بے چینی سگریٹ پینے سے بھی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

میرے ساتھ تو سانحہ صرف اس سے نکاح کرنے کی صورت میں ہوا تھا، اسے تو ٹھکرایا گیا تھا۔

اس سب کے باوجود وہ حقیقت کو قبول کر سکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں؟

لیکن نہیں... مجھے بھی تو ٹھکرایا ہی گیا تھا، سانحہ میرے ساتھ بھی تو کم نہیں ہوا تھا۔ وہ بری طرح سے الجھ رہا تھا۔

تو کیا وہ مجھ سے زیادہ پریکٹیکل ہے اور میں مرد ہو کر بھی... بے ساختہ اس نے ہونٹ بھینچے تھے۔ ہو سکتا ہے عادل کے رد عمل نے اس کے دل میں نفرت بھری ہو اور اس طرح سے وہ میرے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو... اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

تو کیا کرن کے عمل نے تمہارے دل میں اس کے لیے پیار بھر اتھا یا کہ اس پیار میں اور اضافہ ہوا تھا؟ کہیں سے کوئی آواز ابھری تھی اور وہ اپنی جگہ پہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

تو کیا میں نے رابیل سے شادی... اب کے جو سوچ اس کے ذہن میں ابھری تھی وہ یہ بات سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

بہت مضطرب ہو کر اس نے ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑے کو پھینک کر پاؤں تلے مسلا۔ پھر اس نے ریموٹ اٹھا کر والیوم اونچا کر دیا تھا۔

لیکن چند ہی لمحوں بعد اسے اندازہ ہوا تھا اس سوچ سے وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"واثق یار! کیا ضرورت ہے اس کی۔ رہنے دو اور اب تو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔"

اس نے اپنے دوست کو منع کرنے کی آخری سی کوشش کی تھی۔

"کتنا عرصہ ہوا ہے، کیا دس سال گزر چکے ہیں؟ تمہاری مزید کوئی بکواس میں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اسی لیے تمہیں صبح صبح انفارم کر رہا ہوں کہ آج شام کا کھانا تم لوگوں کا ہمارے گھر ہے... سمجھ میں آیا۔

اور اگر عین کھانے کے وقت مجھے تمہاری کوئی کال موصول ہوئی کہ تم نہیں آسکتے، ایمرجنسی کیس آگیا ہے وغیرہ وغیرہ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" دوسری طرف واثق بگڑ کر کہہ رہا تھا۔

"اوکے!" اس نے کچھ بددل ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے پھر شام کو ملاقات ہو گی۔" یہ کہتے ہوئے واثق نے فون بند کر دیا۔

اسی لیے وہ سہ پہر کے بعد ہی گھر آگیا تھا۔ وہ جب گھر آیا تھا تو رابیل سو رہی تھی۔ طلال نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

مغرب سے کچھ پہلے رابیل اٹھ گئی تھی۔ وہ طلال کو دیکھ کر حیران ضرور ہوئی مگر بولی کچھ نہیں تھی۔

"تیار ہو جاؤ... ایک ڈنر پہ جانا ہے۔" وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔

طلال کے اس طرح کہنے پر رابیل نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے نہیں جانا... تم چلے جاؤ۔" وہ کمال بے نیازی سے بولی۔

"میں تمہارے آرڈرز پہ نہیں چلتا۔" طلال کو

غصہ آگیا۔

"اور تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ایسا ہی کرتی ہوں۔" ایک ابرو چڑھا کر اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"فضول کا سین کری ایٹ مت کرو۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے اس نے بہت اصرار کے ساتھ بلایا ہے میں اسے انکار نہیں کر سکا۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔" اس کی بے نیازی میں فرق نہیں آیا تھا۔

"تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟" وہ بے اختیار تملایا۔

"پہلے اس بات کی وضاحت تم اپنے حوالے سے تو کرو۔ پھر میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ہمیشہ اس طرح سے آرڈر کرتے ہو جیسے۔"

"اوکے میں ریکوئسٹ کر لیتا ہوں۔" اس نے چڑ کر کہا۔ وہ تیار ہونے چل پڑی۔

واثق کی فیملی سے مل کر اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بہت اچھے لوگ تھے خاص طور پر واثق کی مسز آمنہ بہت باتونی تھی۔ واثق اور طلال کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دوست بھی تھے۔ کھانے کے دوران بھی آمنہ کی باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں وہ کھا کم اور بات زیادہ کر رہی تھی۔

"حماد کیا کر رہا ہے آج کل؟" کھانا کھاتے ہوئے طلال نے واثق سے پوچھا۔ اس نے پوچھ کر غلطی کی تھی۔

"نام مت لو اس گھٹیا انسان کا۔" واثق کھانا چھوڑ کر غصے سے بولا۔

اس کے اس طرح سے جواب دینے پر سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"کیوں ایسا کیا کر دیا اس نے؟"

"سامعہ نہیں تھی۔۔۔ اس کی کزن۔" اور طلال کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔۔۔ بے ساختہ اسے کسی تکلیف کا احساس ہوا تھا۔

"ہاں!" اب کے وعنیتا" دھیمی آواز میں بولا۔

"پسند کرتے تھے ایک دوسرے کو مگر سامعہ کے والدین نہیں مانے۔ کوئی فیملی کلیش تھا۔ حماد سامعہ کو کورٹ میرج پہ مجبور کرتا رہا مگر وہ نہیں مانی۔ ظاہر ہے یہ کوئی معقول حرکت نہیں تھی۔ سامعہ نے والدین کی مرضی سے شادی کر لی مگر چند ماہ بعد ہی بے چاری بیوہ ہو گئی تھی اور اس حماد نے۔۔۔ محض اس سے انتقام لینے کے لیے اس سے شادی کر لی۔ وہ ڈاکٹر ہے۔۔۔ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر۔ وہ نہ تو اسے پریکٹس کرنے دیتا ہے اور نہ ہی گھر سے باہر نکلنے دیتا ہے۔ وہ کسی ناکارہ چیز کی طرح گھر میں پڑی سڑ رہی ہے اور تو اور خود بھی اسے پوچھتا تک نہیں ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ اس نے سامعہ سے شادی کر کے انسانیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ سامعہ کو طلاق دے دے۔ کوئی اور اس سے اس طرح کا سلوک تو نہیں کرے گا نا۔۔۔ اس عذاب سے تو اس کی جان چھوٹے۔"

"ہمدردی۔۔۔ انتقام۔۔۔ شادی۔۔۔ پوچھتا تک نہیں ہے۔" یہ چند الفاظ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر پڑے تھے۔

اس کے منہ میں موجود نوالہ حلق میں ہی کہیں پھنس گیا تھا۔ بہت نامحسوس طریقے سے اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

"اگر شادی کر ہی لی تھی تو پھر اسے نبھاتے۔۔۔ یہ تو کوئی مردوں والی بات نہ ہوئی۔ کچھ تو خدا کا خوف کرے۔"

"آزاد کیوں نہیں کرتا اسے۔۔۔ ہو سکتا ہے سامعہ کو کوئی بہت اچھا انسان مل جائے۔" واثق اب کہ بہت جوش سے بول رہا تھا۔

اور طلال کو محسوس ہوا کہ اس کا دل کہیں نیچے ہی نیچے ڈوب رہا تھا۔

بے ساختہ اس نے رانیل کو دیکھا تھا۔ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر واثق کو سن رہی تھی۔

اس نے یکدم فضا میں حبس بڑھتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اسے مکمل کر سانس لینے میں دشواری پیش آئی تھی۔

★★★

رانیل چند دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ طلال بہت الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا۔ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا

تھا کہ اب وہ اکثر و بیشتر اسے بہت خاموش نظروں سے دیکھتا بھی رہتا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہو۔ رانیل کو اس کا رویہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یہ آٹھ ماہ میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔

اسے لگا تھا کہ شاید وہ پریشان تھا یا پھر اسے کوئی مسئلہ درپیش تھا بہرحال وہ ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ آخر طلال کو ہوا کیا تھا۔ یہ چیز اس کی الجھن اور پریشانی کو بڑھا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر سے طلال کو نوٹ کر رہی تھی۔ پہلے وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا مسلسل سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ آج اپنا کام نہیں کر رہا تھا اور پھر وہ اٹھ کر ٹیرس پہ چلا گیا تھا۔ وہاں بھی اس نے اپنا مشغلہ جاری رکھا تھا۔

بہرحال وہ اسے نظر انداز کرتی اپنے روم میں آ گئی تھی۔ آج خلاف معمول اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سڈنی شیلڈن کا ناول پڑھ رہی تھی جب طلال کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کتاب پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ بے حد مدھم آواز میں بولا تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے اس میں بک مارک رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ اب کھڑکی میں کھڑا لائٹر سے ایک اور سگریٹ سلگا رہا تھا۔ بے اختیار اسے کوفت ہوئی تھی۔

"تم اس کے بغیر بھی بات کر سکتے ہو۔" وہ سگریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

طلال نے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر دوبارہ رخ موڑ لیا۔ اس نے رانیل کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

"میں اسپیشلائزیشن کے لیے لندن جا رہا ہوں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

رانیل کا دل بے اختیار ڈوبا تھا۔

"کتنے عرصے کے لیے؟" اس نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"میں کافی دنوں سے اپنے اور تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے رانیل کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

رانیل کی ساری حسیات یکدم بیدار ہوئی تھیں۔

"کتنا عرصہ ہوا ہم سے میری شادی کو۔۔۔ آٹھ ماہ۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ عادل سے بھی بڑا ظلم کیا ہے۔"

رانیل کو شدید جھٹکا لگا۔ "وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔"

"ان آٹھ ماہ میں دن رات تمہارے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں خود کو سمجھا نہیں پایا۔ میری زندگی میں۔۔۔" وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہوا۔ اور اس کی سانس رکی تھی یا دھڑکن وہ اندازہ نہیں کر پائی تھی۔

"میری زندگی میں اب کسی عورت کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔" کوئی تکلیف دہ سا احساس تھا جو سر سے لے کر پیر تک اسے کاٹتا چلا گیا تھا۔

"کمی تم میں نہیں مجھ میں ہے۔ تم بہت اچھی ہو۔۔۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارو ایک اچھی لائف اور ایک اچھا لائف پارٹنر ڈیزرو کرتی ہو تم اور میں۔۔۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

"کیا دے سکتا ہے میرے جیسا شخص کسی عورت کو؟" اب کے وہ تلخی سے بولا تھا۔

"تم سے شادی کے پیچھے شاید لاشعوری طور پر کرن سے انتقام لینے کا جذبہ کارفرما تھا۔۔۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تمہاری زندگی خراب کرنے میں میرا بڑا ہاتھ ہے۔ میں وہ شخص نہیں تھا جو تمہیں خوشیاں دے سکتا۔"

آٹھ ماہ میں پہلی دفعہ وہ اتنی طویل گفتگو کر رہا تھا۔

"وہ یہ فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہے کہ اس نے میری زندگی خراب کی یا سنواری؟" رانیل نے عجیب سی کیفیات میں گھر کر سوچا۔

"اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ـــ" وہ رکا تھا۔

"کہ میں تمہیں آزاد کر دوں۔"

طویل بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے وہ بامشکل بولا۔

رابیل کو لگا کہ اس نے کچھ غلط سنا تھا لیکن اس کی سماعت ایک سو ایک فیصد ٹھیک تھی تو پھر اس نے کیا سنا تھا؟

اور جب اس کی سمجھ میں آیا کہ طلال نے کیا کہا ہے تو اس نے اپنا دماغ بھک سے اڑتا ہوا محسوس کیا۔ یکدم اس کی رنگت فق ہوئی تھی۔

اسے محسوس ہوا کہ ان الفاظ نے اس کے جسم میں دوڑتے خون کو ابلتے ہوئے لاوے میں تبدیل کیا تھا۔

"تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو کہ تم میرے لیے بہتر ہو یا نہیں؟" ایک جھٹکے سے اس کی شرٹ پکڑ کر وہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"اور یہ فیصلہ بھی تم کیسے کر سکتے ہو کہ تمہاری زندگی میں رابیل کی گنجائش نہیں رہی۔" وہ بھڑک کر بول رہی تھی۔ طلال کو اس کی دماغی صحت پہ شبہ ہوا تھا۔

"تم کیا خدا ہو' یا پھر خدا بننا چاہ رہے ہو؟ تم ایک انسان ہو ـــ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی حیثیت میں ہی رہو۔" وہ انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کرتے ہوئے بولی۔

"تم نے کرن کو چاہا ـــ تمہارے چاہنے کے باوجود وہ تمہیں نہیں ملی۔ تمہیں وہ عورت ملی جسے تم نے کبھی ایک نظر کے قابل بھی نہیں جانا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی یا پھر..... ظلم ہوا؟ نہیں ـــ ناانصافی تو تب ہوتی جب تم اس عورت کو نہ ملتے جس نے دس سال تم سے محبت کی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"ظلم تو تب ہوتا جب تمہاری زندگی میں کرن آتی۔ یہ اللہ کا فیصلہ تھا اور بے شک اللہ بہترین انصاف کرنے والا ہے۔"

اس نے ایک آیت کا مفہوم پڑھا تھا۔ اس کے آنسو موتیوں کی لڑی کی طرح اس کے چہرے پہ پھسل رہے تھے۔

اور طلال دم بخود' بہت بے چینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دس سال تک اللہ نے کسی آزمائش کی طرح تمہاری محبت کو میرے دل میں قائم رکھا اور سات سال تک اس نے تمہیں کرن کی محبت میں اندھا رکھا مگر سات سال بعد ہوا کیا؟" کیا تم اب بھی نہیں سمجھ پائے کہ کیا ہوا؟" وہ نم لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"ایک عرصے تک تم اس عورت کو چاہتے رہے اور وہ تمہارے لیے کیا ثابت ہوئی؟ صبر نہیں تھا نا اس میں' مگر میں نے صبر کیا۔ دس سال میں نے صبر کیا۔ تمہیں پتا ہے کہ محبت کے باوجود کبھی بھی تم میری دعاؤں میں شامل نہیں رہے' کبھی میں نے تمہیں اللہ سے نہیں مانگا' تم میرے ہی تھے اور تمہیں مجھ تک ہی آنا تھا۔ تم میرے صبر کا اجر تھے ـــ وہ کیسے کسی اور کو یہ دے دیتا۔ وہ تو بس آزما رہا تھا۔ تمہیں' مجھے اور کرن کو ـــ اور اب تم یہ کہتے ہو کہ تم مجھے آزاد کرنا چاہتے ہو۔" اس کے چہرے کی نمی میں یک دم اضافہ ہوا تھا اور اس کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

"کون ہوتے ہو تم یہ فیصلہ کرنے والے؟" اس نے اپنا چہرہ آستین سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

وہ کچھ بول نہیں سکا تھا۔ اس کے پاس رابیل کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ ایک خاموش اور طویل وقفہ ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔

"میں نے ایک لمبے عرصے تک محبت جیسی حماقت کی۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم بھی ایسی ہی کسی احمقوں کی جنت میں رہ رہی ہو۔"

کافی دیر بعد وہ سرد آواز میں بولا۔ وہ رابیل کی طرف دیکھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔ رابیل بری طرح سے چونکی۔

"اس حماقت کا کیا انجام ہوتا ہے ـــ میں یہ بھی جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے تمہیں ابھی یہ بات جاننے

میں وقت لگے گا۔" اب کے وہ تلخی سے بولا۔

"تم محبت کو حماقت کا نام مت دو طلال!" رابیل نے تکلیف سے کہا۔

"میں نے کہا نا! تمہیں ابھی وقت لگے گا اور میں تمہیں وقت دوں گا تاکہ ـــ"

"تمہیں جانا ہے نا! جاؤ ـــ رابیل علی تمہیں آزاد کرتی ہے مگر تم ـــ"

وہ رکی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنے اور طلال کے مابین فاصلے کو مزید کم کیا۔

"اب تم مجھ سے آزاد ہو کر دکھاؤ ـــ تمہیں ابھی میری حیثیت کا اندازہ نہیں ہوا۔" اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بہت عجیب سے انداز میں بولی۔

اور طلال ایک دفعہ پھر سے لاجواب ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

اگلے چند دنوں میں طلال کے جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ ان آٹھ ماہ میں پہلی دفعہ طلال کے ساتھ گجرات گئی تھی۔ اپنی روانگی سے دو دن پہلے طلال سب سے ملنے کے لیے گجرات آیا تھا۔ سب رشتے داروں اور دوست احباب سے ملنے میں دو دن بہت تیزی سے گزر گئے۔

تیسرے دن شام کو وہ لاہور پہنچے تھے اور اگلی صبح دس بجے اس کی فلائٹ تھی۔ رابیل نے اس کے کہے بغیر اس کی ساری پیکنگ کر دی تھی۔

"ایک دفعہ چیک کر لو۔ ہو سکتا ہے کوئی چیز رہ گئی ہو۔" وہ بیگ کی زپ بند کرنے سے پہلے بولی۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔" طلال نے جواب دیا۔

اس نے بیگ کی زپ بند کر کے ایک دفعہ پھر سے اس کے تمام سامان کا جائزہ لیا۔

"لیپ ٹاپ ہاتھ میں پکڑ لینا اور اس کے بیگ کی پاکٹ میں کچھ چیزیں پڑی ہیں' یہ نہ ہو کہ تم ـــ"

"میں دیکھ لوں گا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

رابیل یکدم چپ ہوئی۔ اسے محسوس ہوا وہ تنہائی چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی۔

کافی دیر تک وہ بے مقصد ٹی وی کے چینلز بدلتی رہی پھر بددل ہو کر اس نے ٹی وی آف کر دیا اس کا دل بے حد اداس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کرن کا مقام کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتی مگر اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دفعہ اس کی زندگی میں آنے کے بعد وہ اسے چھوڑ بھی سکتا تھا ـــ اس سے جدا بھی ہو سکتا ہے۔

"تو گویا وہ مجھے اپنی حماقت کے ادراک تک کا وقت دے رہا ہے اور اس کے بعد ـــ اس کے بعد وہ کیا کرے گا؟"

اس نے انگلی کی پور سے آنکھ سے باہر نکلنے والے آنسو کو صاف کیا۔

"صبح وہ چلا جائے گا اور اس کے بعد وہ کون سا دن طلوع ہو گا جب میں اس کا چہرہ دیکھ سکوں گی اور شاید ایسا کوئی دن ـــ"

اسے لگا تھا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر دبایا تھا۔ وہ اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس رات وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر جاگتے رہے تھے۔ کروٹیں بدلتے رہے تھے۔ نیند ان دونوں کو ہی نہیں آ رہی تھی۔

اور وہ دونوں ہی ان کیفیات کو ایک دوسرے سے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔

ان میں سے کبھی کوئی پانی پینے کے بہانے اٹھتا' کوئی تکیہ سیدھا کرنے لگتا تھا اور پھر کوئی خوامخواہ ـــ پردے صحیح کرنے کے بہانے اٹھ جاتا عجیب صورت حال تھی۔

رات کے کسی پہر طلال کی آنکھ لگ گئی لیکن رابیل جاگتی رہی تھی۔

صبح کو یہ بات اس کا ستا ہوا چہرہ بتا رہا تھا۔

اس صبح وہ اپنے حلیے سے بہت فریش دکھائی دینے کی کوشش کر رہی تھی صرف اس کا چہرہ اس بات کی

چغلی کھا رہا تھا کہ وہ فریش نہیں ہے۔

اس نے سرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے نم بال کھلے ہوئے تھے۔ اور زندگی میں پہلی بار اس نے اتنی صبح صبح ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔

وہ اسے ناشتے کے لیے اٹھانے آئی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اپنی تیاری کرنے لگا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی ساری چیزیں تیار تھیں۔ وہ خاموشی سے اسے تیار ہوتا دیکھتی رہی اور جب وہ ٹائی باندھنے شیشے کے سامنے کھڑا ہوا تو رابیل نے پرفیوم اٹھا کر اس پر اسپرے کیا۔

وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

اسپرے کرنے کے بعد وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

بریف کیس میں کچھ ضروری ڈاکومنٹس چیک کرنے کے بعد اس نے اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ وغیرہ شرٹ کی جیب میں رکھے تھے۔ "گھڑی نہیں باندھی تم نے۔" رابیل نے گھڑی اس کی طرف بڑھائی۔

وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ رابیل کے ہاتھ سے لے کر اس نے گھڑی باندھی تھی۔ "واثق کو میں راستے سے پک کرلوں گا' وہ تمہیں گاڑی کی چابیاں دے جائے گا۔ اکیلی مت رہنا ادھر۔ مناسب سمجھو تو ریحان کر دینا اگر نہیں کرنا تو پھر ممی یا پھر ابو کو بلا لینا۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔

ضبط کی وجہ سے رابیل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے صرف سر ہلایا تھا۔

"ایئرپورٹ تم نہیں چلو گی میرے ساتھ!" اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں!"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں وہاں تمہیں چھوڑ کر نہیں آسکتی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"یہاں سے بھی تو میں تمہیں چھوڑ کر ہی جا رہا ہوں۔"

"ہاں! لیکن یہاں سے تم جا رہے ہو۔" کب کے وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔

"اللہ حافظ۔" وہ اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

وہ چند لمحے یونہی کھڑا رہا تھا۔ شاید اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ پھر جانے کے لیے مڑا۔

"طلال!" یکدم رابیل نے اسے آواز دی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا جبکہ رابیل لاؤنج میں ہی کھڑی تھی۔ وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔

اس کے بعد جو ہوا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے طلال کے حواس معطل کر دیے تھے۔

وہ اس کے سینے سے لگی تھی اور اب وہ اس کی شرٹ کو مٹھیوں میں جکڑے ہوئے کسی بچے کی طرف پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اس کا سر طلال کے سینے کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ چند لمحے وہ یونہی غائب دماغی کے ساتھ کھڑا رہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا بریف کیس اس نے زمین پہ رکھ کر کچھ جھجکتے ہوئے اس نے اپنا بازو رابیل کے گرد پھیلایا تھا۔

وہ اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی نمی اس کی شرٹ کے نیچے سے ہوتی ہوئی اس کے دل پر بڑے عجیب سے انداز میں اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ اس لمحے اس وقت اپنی بانہوں میں موجود وجود کی خوشبو کو محسوس کر سکتا تھا۔

بالکل غیر ارادی طور پر اس نے رابیل کے کھلے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیر اتھایوں جیسے وہ اسے چپ کروانا چاہتا ہو۔

وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کی تیز ہوتی دھڑکن کی آواز سن سکتا تھا۔ پہلی دفعہ اس نے وہ لمس محسوس کیا تھا۔ اس کے وجود کی حدت سے آشنا ہوا تھا۔

اچھا خاصا رو لینے کے بعد رابیل جھینپتے ہوئے سرخ چہرے لیے الگ ہوئی آنسوؤں سے نم چہرہ اپنی عادت کے مطابق قمیص کی آستین سے صاف کیا۔

اس کے کھلے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے کے دونوں اطراف میں چپکی ہوئی تھیں۔

طلال نے ہاتھ بڑھا کر انہیں اس کے کانوں کے پیچھے کیا اور اس کا گال تھپتھپایا۔

"اب مت رونا!" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ اور پھر وہ چلا گیا تھا۔

"طلال واپس آئے گا یا نہیں؟" وہ نہیں جانتی تھی!

☼ ☼ ☼

"بھابھی نہیں آئیں تمہارے ساتھ؟" واثق نے اسے اکیلا دیکھ کر بہت حیرانی سے کہا۔

"وہ کہتی ہے کہ وہ مجھے ایئرپورٹ پر "چھوڑ" کر نہیں آسکتی۔" واثق کو دیکھتے ہوئے طلال نے مسکرا کر کہا تھا۔

"اس کا خیال رکھنا واثق! ہو سکے تو بھابھی کو لے کر اس کے پاس چلے جانا۔ وہ یقیناً" ابھی تک رو رہی ہو گی۔"

"ایئرپورٹ پر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے بڑے بے ساختہ انداز میں طلال نے کہا تھا۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔ وہ صبح سے اٹھا ہوا تھا اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے اپنی شرٹ پر ہاتھ پھیرا وہاں رابیل کے سختی سے پکڑنے کی وجہ سے بے شمار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور پوری شرٹ میں سے وہ بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔ لاشعوری طور پر اس نے وہ نمی محسوس کرنا چاہی مگر اب وہ نم جگہ خشک ہو چلی تھی۔ لیکن وہ کہیں اندر تک اپنا بہت گہرا نشان چھوڑ چکی تھی۔

کسی کے آنسو اس کے اندر ہلچل مچا چکے تھے مگر وہ بات کو حماقت کہنے والا شخص ابھی اس بات سے بے خبر تھا۔

☼ ☼ ☼

طلال کے چلے جانے کے بعد اس نے استعفیٰ نہیں دیا تھا' کبھی رفیعہ اور کبھی اس کی اماں اس کے پاس آکر رہنے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک بیوہ عورت کو بطور ملازمہ بھی اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کا گھر تھا اور وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ جب لندن آیا تھا تو اسے سیٹل ہونے اور دوسرے معاملات نپٹانے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

اسے سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا اور اسی وجہ سے وہ ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہا تھا' بہرحال اب یہ مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا تھا۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے بہت محنت کرنا پڑتی تھی' اتنی مصروفیت میں اسے کسی کو یاد کرنے کی کہاں فرصت تھی۔

اس کے برعکس رابیل کی تمام مصروفیات یکدم ختم ہو گئی تھیں۔ اس کے لیے وقت گزارنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا طلال کے لیے آسان تھا۔

گھر والوں نے زور دیا تھا کہ وہ استعفیٰ دے کے گجرات واپس چلی آئے مگر وہ نہیں مانی تھی۔ اسے وہیں رہنا تھا یہ طے تھا۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں ایسٹر کے تہوار کی وجہ سے تعطیلات تھیں اور وہ جیسے یکدم فارغ ہو گیا تھا۔ اسی فراغت کی وجہ سے اس پر بیزاری اور بوریت کے دورے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔

اس دن وہ اپنے اپارٹمنٹ کے نزدیکی پارک میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

بیٹھنے سے پہلے اس نے سرسری طور پر سامنے دیکھا تھا۔ وہاں ایک بارہ' تیرہ سال کی لڑکی واکنگ ٹریک پر اسکیٹنگ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ نسبتاً" ایک بڑی عمر کی لڑکی اسے سکھا رہی تھی۔ وہ ایک نظر انہیں دیکھنے کے بعد کتاب پڑھنے لگا۔

چند لمحوں بعد اس نے ایک زوردار چیخ کی آواز سنی تو گھبرا کر کتاب پر سے سر اٹھایا۔ وہ اسکیٹنگ سیکھنے

والی لڑکی شاید توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی اور بری طرح سے گری تھی۔

وہ دونوں اس کے سامنے والے بنچ پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔ اسے شاید کچھ زیادہ ہی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

وہ کتاب بند کرکے اٹھ کر ان کے پاس گیا تھا۔

اس کی کہنی اور گھٹنے بری طرح سے چھل گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا جبکہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے بھی ایک زخم کا نشان تھا۔

"اگر تم اسے میرے اپارٹمنٹ تک لے آؤ تو میں اس کی پٹی کر دیتا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں۔"

وہ لڑکی اب سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور پھر اس نے سر جھکا کر اپنی شرٹ کی آستین سے اپنا چہرہ صاف کیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ بالکل ساکت ہو کر رہ گیا۔ کوئی اور بھی تو تھا جو بالکل ایسے ہی اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا کرتا تھا۔ اس کی حرکت اسے دور کہیں کسی کے پاس لے گئی تھی۔ لڑکی نے طلال کو دیکھا۔

اس کی آنکھیں نم اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور اسے کسی اور کی بھیگی پلکیں اور نم آنکھیں یاد آئی تھیں۔ کوئی مانوس سا احساس ابھرا تھا۔

وہ اسے کیسے اور کس طرح سے یاد آئی تھی۔

"بڈی۔" دوسری لڑکی نے اس کا کندھا ہلا کر اسے متوجہ کیا۔ وہ جیسے چونک کر کسی خواب سے جاگا تھا۔

اس کے ایک ایشین دوست نے ڈنر پہ انوائٹ کیا تھا۔ اس نے خاص طور پر طلال کے لیے پاکستانی ڈشز بنوائی تھیں۔ وہاں اپنے دوست کے گھر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے وہ پلاؤ کھا رہا تھا۔

"تم کبھی پاکستان آنا۔ میں تمہیں اپنی مسز کے ہاتھ کی بنی یہ ڈش کھلاؤں گا تم یاد کرو گے کہ کبھی کسی پاکستانی خاتون کے ہاتھ کا پلاؤ کھایا تھا۔" بے حد غیر ارادی طور پر اور بہت اچانک اس کے منہ سے یہ جملہ پھسلا۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ خود بھی دم بخود رہ گیا۔ اپنی اس بے اختیاری پر اس نے نہایت لاچاری محسوس کی تھی۔ کچھ بے بس ہو کر اس نے چمچ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"مانا کہ تمہاری مسز بہت اچھا پلاؤ بناتی ہو گی لیکن یار! یہ اتنا برا تو نہیں بنا۔" اس کا دوست اسے یوں کھانے سے ہاتھ روکتے دیکھ کر بولا۔

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ دراصل اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

"اور کیا میں اس کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔" اس رات بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"نہیں! یہ صرف آٹھ ماہ اس کے ساتھ رہنے کا اثر ہے۔" چند لمحوں بعد اس نے سختی سے ان سوچوں کی تردید کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم میں شرم نامی چیز باقی ہے یا نہیں طلال؟" وہ اسما تھی جو بے حد غصے میں اس سے فون پر مخاطب تھی۔ بے ساختہ وہ مسکرایا تھا۔

"آپ جانتی ہیں کہ انگلینڈ جیسے ملک میں اتنی نادر چیز کو ڈھونڈنا کتنا مشکل کام ہے بہرحال میں کوشش کروں گا۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"آپی! سچ ٹائم نہیں ملا۔"

"ایک فون کال کرنے کے لیے کتنا ٹائم چاہیے ہوتا ہے' دس منٹ' پندرہ منٹ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ' تو تمہارے پاس اپنی اکلوتی بہن کے لیے وہ بھی نہیں ہیں۔"

"آپی پلیز! کیا آپ کا آج صرف شکوے سنانے کا پروگرام ہے؟" وہ زچ ہو کر بولا۔

اچانک اس نے اسما کے پیچھے سے کسی کے بولنے کی آواز سنی تھی۔ وہ چونکا اسما یکدم قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تمہاری مسز تمہارے بارے میں کچھ ارشاد فرما رہی ہیں۔" طلال کی مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی۔

"کیا کہہ رہی ہے؟"

"یہی کہ تم ایک انتہائی بور' سڑے ہوئے اور کھڑوس شخص ہو اور یہ کہ یہ اس کا ہی کمال ہے جو آج تک تمہارے ساتھ گزارا کر رہی ہے اگر کوئی اور ہوتی تو اب تک تو وہ تمہیں دن میں تارے کیا سیارے بھی دکھا چکی ہوتی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تو یہ محترمہ آپ کے پاس آئی ہوئی ہیں۔"

"ہاں! لو بات کرو۔" اسما نے کہا۔

"السلام علیکم!" طلال نے فون کے دوسری طرف اس کی آواز سنی۔

"وعلیکم السلام! جی محترمہ کیا فرما رہی تھیں آپ ذرا ہم بھی تو سنیں۔" وہ بہت خوشگوار انداز میں بولا۔ اس کا خیال تھا رابیل ایسی کوئی بات اس کے منہ پر نہیں کہہ سکتی۔

"فرما تو میں چکی ہوں اور اگر آپ دوبارہ سننے کے خواہش مند ہیں تو میں ریپیٹ کر دیتی ہوں کہ آپ ایک سڑے ہوئے' بور اور کھڑوس شخص ہیں اور......"

"میں سڑا ہوا' بور اور کھڑوس ہوں..... اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولا تھا۔

"میں' میں ایک خوش مزاج خاتون ہوں۔" اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اے خوش مزاج خاتون! یاد رکھیے اگر میری جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اسی بات پر آپ کو تاروں بلکہ سیاروں کی سیر کروا دیتا۔"

"اوہ! تو آپ مذاق بھی کر لیتے ہیں۔"

"تو آپ کیا سمجھتی ہیں تمام حسیں صرف آپ کے پاس ہی ہیں۔"

"نہیں! اب ایسی بھی بات نہیں۔ یہ تو ہم مانتے ہیں کہ آپ حسیات کے معاملے میں کافی تیز واقع ہوئے ہیں بس ذرا دل کے معاملے میں پتھر واقع ہوئے ہیں۔"

وہ روانی میں غلط بول گئی اس بات کا اندازہ اسے دوسری طرف اچانک چھا جانے والی خاموشی سے ہوا۔

"ہیلو! طلال!" اس نے آہستگی سے پکارا۔

"پھر بات کریں گے۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رابیل نے ایک گہرا سانس بھرا۔

اتنے دنوں بعد اس سے بات ہوئی تھی اور اس کا موڈ بھی اچھا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ میں اول فول بکتی۔ اس نے جھنجلا کر ریسیور کریڈل پر پٹخا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد وہ کتنی دیر تک دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے' انہیں ہونٹوں پہ رکھے بیٹھا رہا تھا۔

وہ جب انگلینڈ آیا تھا تو اس کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ اسے رابیل کو اسی کی بہتری کے لیے آزاد کرنا ہے مگر اب جیسے وہ یہ بات بھولتا جا رہا تھا۔

بہت آہستگی سے وہ اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ یوں جیسے باقاعدگی کے ساتھ دیا جانے والا نشہ آور زہر۔

"تو کیا میں اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگا ہوں؟" ایک سوال ابھرا تھا۔

اک عجیب سی بے بسی اس نے خود پر حاوی ہوتے ہوئے محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"طلال کب آ رہا ہے؟" کھانے کی میز پر بے حد اچانک علی صاحب نے رابیل سے پوچھا۔

اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ پوری طرح سے سنجیدہ تھے۔

"پتا نہیں ابا! ابھی ذکر ہی نہیں کیا اس نے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"تم نے بھی نہیں پوچھا؟" یکدم وہ کھانا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"نہیں۔" وہ کچھ الجھ کر بولی۔ انہوں نے ناراض نظروں سے اس کو دیکھا۔

"اس سے کہو' اس کی ایجوکیشن مکمل ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔ کم از کم ایک چکر تو پاکستان کا لگائے وہ' ادھر جا کر تمہیں بھول ہی گیا ہے۔"

ابا کے اس قدر صحیح اندازہ لگانے پر اسے نوالہ حلق میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔

"نہیں ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فون آتا رہتا ہے اس کا۔" بے اختیار اس نے وضاحت کی۔

جواباً" انہوں نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا اس سے رابیل کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ انہوں نے اس کی بات کا کتنا یقین کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

چھٹیوں کے دوران اس کے ٹیچر نے اسے ایک اسائنمنٹ دی تھی جسے وہ اپنی سستی کے ہاتھوں مکمل نہیں کر پایا تھا۔

اس دن مسٹر جوزف نے آتے ہی اس سے اس اسائنمنٹ کے بارے میں پوچھا۔

"سوری سر! میں مکمل نہیں کر سکا۔" اس نے کچھ شرمندگی سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ اسائنمنٹ تمہیں دینا ہی نہیں چاہیے تھی۔ کسی اور کو دیتا تو اب تک کب کا مکمل کر چکا ہوتا۔" مسٹر جوزف نے سخت لہجے میں کہا۔

بے ساختہ طلال کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ اسے بری طرح سے انسلٹ فیل ہوئی تھی۔

"with in a day میں اسے مکمل کر لوں گا سر!" وہ جھکے سر کے ساتھ بولا تھا۔

"چلو ینگ مین! تمہیں ایک چانس اور دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ with in a day کا تمہارے نزدیک مطلب کیا ہے؟ میں تو اسے ایک دن ہی سمجھتا ہوں۔" انہوں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

طلال کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہوا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

اس اسائنمنٹ پہ کچھ کام تو وہ مکمل کر چکا تھا اور باقی کا کام اس نے اسی دن کلاس بنک کر کے مکمل کیا تھا اور پھر صبح ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا۔ وہ شام کو مسٹر جوزف کے اپارٹمنٹ کے سامنے موجود تھا۔ اس نے ان کے اپارٹمنٹ کی بیل بجائی تھی۔

دروازہ کھولنے والی شخصیت اس کے ٹیچر ہی تھی۔

"میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میرے نزدیک with in a day کا مطلب کیا ہے سر!" پیپرز ان کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بہت فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولا مسٹر جوزف اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے۔

"تمہیں پتا ہے مسٹر طلال! تمہیں چڑا کر غصہ دلا کر اپنی مرضی کا کام نکلوانا کس قدر آسان ہے ۔۔۔ اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم یقیناً" یہ اسائنمنٹ اگلے ایک ہفتے میں بھی مکمل کرنے والے نہیں تھے۔" وہ پیپرز اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولے۔

اور طلال کے چہرے سے مسکراہٹ یکدم غائب ہوئی تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے پر اس پر ایک انکشاف ہوا تھا۔ کتنے ہی لمحے وہ حرکت نہیں کر سکا تھا۔

مسٹر جوزف کو اسائنمنٹ دینے کے بعد اسے ایک دوست کے ہاں جانا تھا' وہ وہاں نہیں گیا۔ اس کے بعد اسے ڈنر کرنا تھا۔ اس نے یہ کام بھی نہیں کیا۔ وہ سیدھا واپس اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا۔ مسٹر جوزف کے ایک جملے نے اس پر بہت سی حقیقتیں واضح کر دی تھیں۔ وہ شاکڈ تھا۔

اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا اور بہت کچھ سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ میری روٹین کس قدر سخت تھی اور اوپر سے ناشتا بنانا' کپڑے پریس کرنا وغیرہ وغیرہ تو اس نے صرف میری خاطر' مجھے چڑا کر' غصہ دلا کر میرے یہ کام اپنے ذمے لے لیے۔ اور میں ۔۔۔ میں سمجھ ہی نہ سکا۔ اس نے میری ہر سخت بات برداشت کی' میرے غصے کو پیا' میں نے اسے بری طرح سے نظر انداز کیا مگر پھر بھی ۔۔۔ پھر بھی اس نے ۔۔۔ میرے خدا ۔۔۔" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

مجھ سے محبت کی دعوے دار تو کرن بھی تھی مگر رابیل ۔۔۔ اس کی محبت یوں جیسے خاموشی سے برسنے والی بارش بہت عجیب ہے یہ سب ۔۔۔ بہت عجیب۔

ٹھیک ہے دنیا کے تمام مردوں کی بیویاں ان کے لیے یہ سب ہی کام کرتی ہیں مگر میرے اور اس کے تعلق میں ایسی کسی چیز کی گنجائش تھی ہی نہیں اور اس نے یہ گنجائش خود پیدا کر لی اور میں جان ہی نہ سکا۔ اور مجھے دعوا ہے کہ میں بہت ذہین ہوں۔

وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

میں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ میں اسے اتنا مس کروں گا کہ ہر چیز اس کا عکس بن کر سامنے آئے گی ہر بات' ہر واقعہ مجھے اس کی یاد دلائے گا۔

وہ میز کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔

' اور حیرت کی بات ہے کہ میں خود اس چیز سے پیچھا نہیں چھڑانا چاہتا ۔۔۔ میں' میں اسے یاد کرنا چاہتا ہوں اسے' اسے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔' صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ کسی کے آنسوؤں کی نمی ابھی بھی تازہ ہوئی ہے۔ کسی کے وجود کی خوشبو اس کے چاروں طرف بکھری تھی۔ اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سینے پر تھا۔

"یہ محبت نہیں ہے ۔۔۔ یہ کچھ اور ہے۔" چند لموں بعد اس نے بے حد آہستگی سے زیر لب کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے مارتھا کو دیکھا' وہ کلاس میں داخل ہو رہی تھی اور بے ساختہ اس کا منہ بن گیا۔ وہ اس وقت سرخ رنگ کا لانگ کوٹ پہنے ہوئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے ریڈ کلر صرف اسی کے لیے بنا ہے" وہ سر جھکا کر بڑبڑایا تھا۔

اسے بے اختیار پاکستان میں اپنا آخری دن یاد آیا تھا اس دن رابیل نے سرخ لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور مارتھا کو دیکھ کر بے اختیار ہی اس نے موازنہ کیا تھا اور اب اسے اس بات میں حیرت نہیں ہوتی تھی۔ وہ جیسے اس چیز کا عادی ہو چکا تھا۔ ہر چیز اس کا عکس بن کر سامنے آئے یا پھر اس کی یاد دلائے ۔۔۔ اسی دن شام میں وہ مارکیٹ گیا تھا۔ وہ رابیل کے لیے کچھ لینا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے اس نے رابیل کے لیے ریڈ پل اوور خریدا' پھر ریڈ کلر کی لپ اسٹک اور اس کے بعد ریڈ کلر کا ہی ایک پرس خریدا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ سرخ رنگ اس پر بہت جچتا تھا۔

اس نے صرف اسی رنگ میں رابیل کو غور سے دیکھا تھا اور اگر وہ عام حالات میں بھی اس پر غور کرتا تو یہ بات جان لیتا کہ اس پر سارے ہی رنگ بہت جچتے تھے۔

وہ اب اکثر اسے فون کرنے لگا تھا۔ مگر وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ وہ اسے سننا چاہتا تھا' اسے محسوس کرنا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا تھا وہ جب بھی رابیل کو فون کرتا اس کی خاموشی کے جواب میں دوسری طرف بھی خاموشی ہی ہوتی تھی۔

"تم کچھ کہتے کیوں نہیں ہو طلال؟" اس دن' اس کی خاموشی کے جواب میں بالآخر رابیل بول ہی پڑی۔

"کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔" وہ بہت آہستگی سے بولا۔ رابیل کو محسوس ہوا یوں جیسے وہ دل گرفتہ کیفیت میں تھا۔

"پھر فون کیوں کرتے ہو؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب نہیں کروں گا۔" اس نے یک دم فون بند کر دیا۔

"طلال میرا یہ مطلب ۔۔۔"

وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ اس نے دوبارہ طلال کا نمبر ملایا ۔۔۔ وہ اب آف جا رہا تھا۔

"او میرے خدا!" وہ بری طرح سے خوف زدہ ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی کہ میں کیوں فون کرتا

ہوں۔" وہ بہت تپا ہوا تھا۔ اس کی بے چینی حد سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے اضطراری انداز میں سگریٹ نکال کر سلگایا۔

وہ جب رابیل سے بات کر رہا تھا تو آفس میں تھا' باہر نکلا تو بارش ہو رہی تھی اور اس بارش نے جیسے کہیں آگ سی لگائی تھی۔

وہ بہت دیر تک یونہی' بے مقصد سڑکوں پر پھرتا رہا۔ رات گئے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آیا تھا۔

کوٹ اتار کر اس نے صوفے پر پھینکا' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اتارتے ہوئے وہ بھی اس نے کوٹ کے اوپر پھینکی تھی اور پھر صوفے پر بیٹھ کر وہ جوتوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔ چند لمحوں تک وہ صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا تھا۔

اس وقت اسے کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس کی فرمائش پوری کرتا۔ اسے بے اختیار رابیل یاد آگئی وہ بہت اچھی کافی بناتی تھی۔

"کیا میں دوبارہ محبت میں مبتلا ہو رہا ہوں۔" وہ بے یقینی سے بڑبڑایا۔

اس ایک بات کو جاننے کے لیے مجھے پورا ایک سال لگا۔ مجھے' طلال حیدر کو جو کہ خود کو بہت ذہین اور شارپ سمجھتا ہے اور جو کہ ایک گولڈ میڈلسٹ ہے اسے یہ بات سمجھنے کے لیے پورا ایک سال لگا مائے گڈنیس! سات سال میں ایک عورت سے محبت کا دعوے دار رہا اور پھر مجھے پتا چلا کہ وہ تو سرے سے محبت تھی ہی نہیں۔ اور اب۔۔۔ اب ایک دفعہ پھر۔۔۔ کیا یہ مجھے احمق ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اس کے تاسف میں اضافہ ہوا۔ وہ چند لمحوں تک خاموشی سے باہر دیکھتا رہا۔

وہ جانتی تھی۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر میں اسی کی طرف لوٹ کر آؤں گا۔ اسے یقین تھا وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں اس کے علاوہ کہیں اور نہیں جا سکتا۔ اور میں چلا تھا اسے آزاد کرنے۔ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

"رابیل علی! تمہیں آزاد کرتی ہے۔" ایک آواز لہرائی تھی۔

اور وہ کیسے پابند ہوا تھا۔

بجھے ہوئے سگریٹ کو نیچے پھینک کر اس نے پاؤں کے نیچے مسلا اور اپنا لیپ ٹاپ اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک چہرہ پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا تھا۔ ایک دفعہ وہ اس تصویر کو دیکھ کر ساکت ہوا تھا' آج مبہوت ہو رہا تھا۔

وہ چہرہ آج کمال کر رہا تھا۔ کوئی جادو سا جگا رہا تھا۔

وہ عجیب سے ملال میں گرفتار تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے' اس کے دل کی حالت بھی عجیب ہوتی جا رہی تھی۔

"واقعی! میں کون ہوتا ہوں تمام فیصلے کرنے والا۔" اچانک وہ شکستہ آواز میں بڑبڑایا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ حقیقی محبت اسے رابیل سے ہی ہوئی تھی۔ وہ محبت کے ہاتھوں ہارنے والا کوئی پہلا شخص نہیں تھا اور وہ آخری بھی نہیں تھا۔

اور

محبت۔۔۔ فاتح عالم!

☼ ☼ ☼

"بھابھی! کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں واثق بھائی! آپ سنائیے۔" وہ واثق کا فون سن کر کچھ حیران ہوئی۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ سے ایک کام تھا۔"

"جی کہیے۔"

"کام کیا۔۔۔ فرمائش تھی۔"

"جی۔۔۔" اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔

"دراصل میں اور میری وائف آپ کے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ آپ کے ہاتھوں کا بنا پلاؤ اور کباب کھانے۔"۔۔۔

وہ واثق اور اس کی فیملی سے اتنی فری نہیں تھی کہ

اور نہ ہی اس طرح کے فیملی ٹرمز بن سکے تھے کہ وہ اس سے ایسی کوئی فرمائش کرتا' وہ یکدم خاموش ہوگئی۔

"کیوں کیا ہوا بھابھی؟"

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔ بات دراصل یہ ہے واثق بھائی میں۔۔۔ مجھے کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے مگر میں آج گجرات جا رہی ہوں۔ ملازمہ کو بھی میں نے چھٹی دے دی ہے اگر وہ ہوتی تو پھر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں ادھر رات رک سکتی تھی مگر اب یہ ناممکن سا ہو گیا ہے۔ آپ پہلے انفارم کر دیتے تو۔۔۔" اس نے بہت ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہی نہیں بھابھی! آپ ہمارے لیے ڈنر تیار کریں۔ میں آمنہ کو آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔" اس کا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل ہوا تھا۔

"جی۔ ٹھیک ہے۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا تھا۔

وہ گجرات جانے کے لیے بالکل تیار تھی' اس کی ساری پیکنگ مکمل تھی اور اب یہ فرمائش اسے یکدم پڑنے والی مصیبت کی طرح لگی تھی۔

نہایت بے دلی سے اس نے رات کے کھانے کی تیاری شروع کی۔

☼ ☼ ☼

"ہو گیا کام؟"

"ہاں! ہو گیا۔"

"مگر مجھے تیرے اس چکر کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تو سمجھ کر کیا کرے گا' تو نے کبھی عشق کیا ہو تو تجھے پتا چلے۔" وہ خلاف معمول بہت خوشگوار انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ابھی جا کر تیرا پول کھولتا ہوں۔" واثق کچھ چڑ کر بولا۔

"اس کے بعد میں تیرا سر کھول لوں گا۔ سمجھے! اب شرافت سے سائڈ پر ہو جا۔" وہ اسے دھمکی دیتے ہوئے بولا تھا۔

آٹھ بجے تک کھانا تیار ہو چکا تھا مگر واثق اور اس کی وائف کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

کھانا تیار کرنے کے بعد اس نے چینج کرنے کے لیے شاور لیا۔ اس کے تمام کپڑے پیک ہو چکے تھے البتہ چند ایک جوڑے اس کی الماری میں موجود تھے۔ مگر وہ تمام عام پہننے والے کپڑے تھے۔

اس نے سرخ رنگ کا لباس نکالا جو کہ شاید اس نے صرف ایک دفعہ ہی استعمال کیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ہلکا سا میک اپ کیا بال گیلے ہونے کی وجہ سے کھلے ہی چھوڑ دیے تھے۔

جب وہ تیار ہو کر آئی تو نو بج چکے تھے۔ اب اسے غصہ کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی اکیلی نہیں رہی تھی۔ اس نے واثق کو فون ملایا مگر وہ آف جا رہا تھا۔ اب اسے غصے سے زیادہ پریشانی لاحق ہونے لگی تھی۔

وہ دس دس منٹ کے وقفے سے واثق کو فون ملا رہی تھی مگر اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ وہ ایک دفعہ پھر سے واثق کا نمبر ٹرائی کرنے لگی تھی کہ اچانک بیل ہوئی تھی۔ اس کی پریشانی یکدم شدید غصے میں بدلی "یہ کوئی ٹائم ہے کسی کے گھر ڈنر پہ آنے کا؟"

وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے' بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی دروازے تک آئی اور ایک جھٹکے سے اس نے دروازہ کھولا۔ مگر دروازہ کھولتے ہی جیسے وہ گونگی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ساری حسیات بھی منجمد ہو گئی تھیں۔

وہ بولنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر اس کی آواز کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایکسپریشن کا اظہار کرنا چاہتی تھی مگر یوں جیسے کسی نے جادو کے زور سے اسے پتھر کا کر دیا ہو۔

اس نے بہت نرمی سے اسے دروازے سے ہٹایا اور اپنا سامان اندر لانے کے بعد آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اسے دیکھ کر کھل کر مسکرایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی حالت ایسی ہی ہو گی۔ وہ حیران نہیں۔۔۔ شاکڈ تھی۔ اس کے قریب آتے ہوئے طلال نے اس

کے جوڑے میں بندھے بال ہاتھ بڑھا کر کھول دیے تھے۔ وہ کسی آبشار کی طرح اس کے کندھوں کے اطراف میں گرے تھے۔

"اس سے زیادہ خوب صورت چیز اور کیا ہوگی؟"

بے اختیار اس نے سوچا تھا۔

بے حد آہستگی سے اس نے رابیل کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے شانے کے گرد لپٹا تھا۔ وہ اس وقت کیا محسوس کر رہا تھا۔ بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اچانک اسے اپنی شرٹ نم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے تیزی سے رابیل کو خود سے الگ کیا تھا۔

وہ آج بھی رو رہی تھی خاموشی سے' اک تسلسل کے ساتھ۔

چند لمحوں تک وہ اس کے گالوں پہ پھسلنے والے آنسو دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور طلال کا دل بے اختیار چاہا تھا کہ وہ اپنی گیلی پلکوں کو اٹھا کر اسے دیکھے۔ وہ اس کی نم آنکھوں میں ڈوبنا چاہتا تھا۔

"بھوک بہت شدید لگی ہے' کھانا تیار ہے؟"

رابیل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر' اسے دیکھا۔ وہ اس جملے کی اس وقت کم از کم طلال سے توقع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی متورم نم آنکھوں میں پھیلتی حیرانی طلال کو بہت دل کش لگی تھی۔

وہ محظوظ ہو کر مسکرایا۔

اس کی مسکراہٹ سے خائف ہو کر وہ وہاں سے ہٹ گئی اور خاموشی سے کھانا لگانے لگی۔

وہ بھول چکی تھی کہ طلال کے بجائے واثق اور اس کی بیوی کو آنا تھا اور یہی کیا اس وقت تو وہ خود کو بھی بھول رہی تھی۔ اس کے اعصاب اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"کھانا لگ گیا ہے۔" اس نے بے حد مدھم آواز میں طلال کو اطلاع دی۔

"ہوں۔۔۔ چلو آؤ کھاتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے؟" وہ اب بھی مدھم آواز میں ہی بولی تھی۔

"کیوں؟" طلال نے اس کے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے بے حد پیار سے پوچھا۔

بے ساختہ اس کا دل بھر آیا۔

"پہلے کھانا کھالو۔۔۔ بعد میں رو لینا۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولا اور اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ٹیبل پر لے آیا تھا۔

وہ دونوں اب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

طلال بے حد رغبت سے کھا رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے۔۔۔ میں نے تمہارے ہاتھ کے ذائقے کو وہاں کتنا مس کیا ہے؟" وہ اچانک بولا۔

وہ آج اسے قدم قدم پر حیران کر رہا تھا۔

"کباب کدھر ہیں۔۔۔ وہ نہیں بنائے تم نے؟"

اس نے پوچھا۔

"بنائے ہیں۔ میں لاتی ہوں۔۔۔" وہ یکدم کہتے ہوئے اٹھی۔ جتنی تیزی سے اٹھی تھی' اتنی تیزی سے رک بھی گئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں نے کباب بنائے ہیں؟"

اس نے حیرت سے کہا تھا۔

طلال کھانا چھوڑ کر ہاتھوں کی مٹھی ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بے ساختہ ہنسا۔ اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ اس وقت بہت نمایاں تھی۔

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ ڈنر میں نے نہیں' تمہارے مہمانوں نے کرنا تھا۔" وہ محظوظ ہو کر بولا۔

"ہاں! وہ واثق بھائی؟ ابھی تک آئے ہی نہیں اور فون بھی آف ہے۔" اسے جیسے یکدم یاد آیا تھا۔

"ہاں ہاں۔ فون کرو۔ پوچھو اس سے' وہ آیا کیوں نہیں ابھی تک۔" وہ دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو کر بولا تھا۔

اس نے کچھ الجھتے ہوئے واثق کا نمبر ملایا تھا اور اب کی بار نمبر مل گیا تھا۔

"آپ کدھر ہیں؟ ٹائم دیکھا ہے آپ نے؟ شاید آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے فرمائش کر کے مجھ سے آج رات کا کھانا پکوایا ہے۔" وہ کچھ غصے سے بولی۔

"بھابھی! فرمائش میری نہیں اس گدھے کی تھی جو آپ کے سامنے بیٹھا اس وقت کھانا تناول کر رہا ہے۔" دوسری طرف سے واثق نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اب کی بار اس نے گھور کر طلال کو دیکھا تھا۔

"کباب!" وہ اس کے یوں گھورنے پر بولا۔

کبابوں کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ ناراضی کے اظہار کے طور پر وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ طلال اس کے پیچھے آئے گا مگر وہ آرام سے کبابوں سے انصاف کرتا رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے آیا تھا۔

"کافی ملے گی؟" اس نے آتے ہی فرمائش کی۔

رابیل نے شدید ناراضی سے اسے گھورا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم پاکستان صرف کھانے پینے کے ارادے سے آئے ہو۔" وہ جل کر بولی۔

"کہہ سکتی ہو۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

رابیل کی تلملاہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔

بہرحال کافی تو اسے بنانی ہی تھی۔ کافی بنا کر اس نے لا کر طلال کے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر رابیل کے چہرے پر ابھی تک خفگی کے آثار موجود تھے۔ وہ دونوں وہاں بے حد خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے۔ رات کا فسوں ان دونوں پر طاری ہو رہا تھا۔

"رابی!" اس نے بے حد نرم آواز میں اسے پکارا۔ اب کی بار وہ بری طرح سے چونکی تھی۔ اس نے کتنے عرصے بعد اسے اس نام سے پکارا تھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ میں نے تمہیں کتنا مس کیا؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر بات نہیں کر رہا تھا' سامنے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

"لگتا کہ ہر چیز جیسے تمہارا عکس بن گئی تھی' ہر رات جیسے تمہاری یاد بن کر سامنے آتی تھی۔" وہ بے حد دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ رابیل سانس روکے اسے سن رہی تھی۔ وہ دنیا کے کسی بھی شخص سے اس بات کی توقع کر سکتی تھی مگر طلال سے ہرگز نہیں۔

"تم کیا کہہ رہے ہو طلال؟" طلال نے آسمان سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بیک وقت بے یقینی اور گھبراہٹ تھی۔

وہ چند لمحے اس چہرے کو دیکھتا رہا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اس چہرے کو چھونے کی خواہش کی تھی۔ تب وہ اس کے پاس نہیں تھا اور آج جب پاس تھا تو۔۔۔ بے بے اختیار اس نے گہرا سانس بھرا۔

"میں نے تمہیں لندن میں بہت مس کیا ہے رابی!" وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔ "کیا اب میں تمہیں اس بات کا ثبوت دوں؟ کیا میرا یہاں ہونا کافی نہیں ہے؟" یکدم وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ وہ طلال کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی یا پھر یہ اس کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔

"میں تم سے اپنے تعلق کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی ڈیفائن کر سکتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ میرا دل تمہاری طرف کھنچتا ہے۔۔۔ کیوں؟ مجھے نہیں معلوم۔ تم شاید کوئی ابدی سکون ہو۔۔۔ جو قطرہ قطرہ کر کے میرے اندر اترتی ہو۔ یا پھر شاید۔۔۔" اس نے بے بسی سے سر جھٹکا۔

اس کا ہاتھ ابھی تک طلال کے ہاتھ میں تھا اور اس گرم ہاتھ کی حدت سے اسے اپنے اندر زندگی کی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔

"سات سال پہلے میری زندگی میں ایک عورت آئی اور مجھے لگا جیسے میں اس سے محبت کرتا اور آج ۔۔۔۔ یہاں تمہارے سامنے کھڑے ہو کر مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ تو سرے سے محبت تھی ہی نہیں یوں جیسے وہ سب مذاق تھا' اک خواب تھا' کوئی فسانہ تھا۔ اور اب حقیقت تمہارے سوا کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔" وہ اس کے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے بولا تھا۔

"شاید یہ محبت ہے۔۔۔ یا پھر یہ محبت ہی ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا تھا۔

جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے' اس نے رخ بدلا تھا وہ ایک دفعہ پھر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا رابی! اگر ن کیا تھی؟ میں نے دیکھ لیا۔ تم کیا ہو؟ یہ بھی میں نے جان لیا۔ اور اب کس چیز کی گنجائش بچتی ہے۔" رابیل کو محسوس ہوا تھا جیسے اس کی آواز نم تھی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں بھی نمی اتری تھی۔

"اک عرصے سے میں مزاحمت کی کیفیت میں تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب جان گیا ہوں۔"

وہ ریلنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے بے حد مدھم آواز میں بولا تھا۔

"میں صرف تمہارے لیے تھا اور میں واقعی تمہارا ہی ہوں۔"

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں شکستگی نمایاں تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یکدم اسے محسوس ہوا کہ جیسے رابیل کی آنکھوں کی جگمگاہٹ بہت بڑھ گئی تھی۔ طلال کو وہ جگمگاہٹ آسمان کے تاروں سے بھی زیادہ روشن لگی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرائی تھی۔

طلال کو وہ مسکراہٹ دنیا کی کسی بھی مسکراہٹ سے زیادہ حسین لگی تھی۔ وہ چند لمحے تک اسے دیکھتا رہا پھر بے ساختہ وہ دونوں ہنس دیے تھے۔ یکدم طلال کو کچھ یاد آیا۔

"تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے میں نے۔" اچانک ہی اس نے ٹون بھی بدلی تھی۔

"ریئلی۔۔۔ تم صحیح کہہ رہے ہو۔" اس نے حیرانی سے کہا۔

"آؤ۔۔۔ دکھاتا ہوں تمہیں۔" وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ "یہ دیکھو یہ پل اوور ہے۔" اس نے ایک بیگ کی زپ کھولتے ہوئے' چند لمحوں کی تلاش کے بعد وہ پل اوور برآمد کیا۔

اس کو دیکھ کر رابیل کی چہرے کی خوشی تھوڑی ماند پڑ گئی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی سمٹی تھی۔

"یہ پرس' یہ لپ اسٹک' یہ جوتے' یہ۔۔۔" وہ ایک ایک کر کے چیزیں نکالتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی رابیل کی مسکراہٹ غائب ہوتی جا رہی تھی۔

"کیسا لگا؟" اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں پسند نہیں آیا۔" وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ گیا تھا۔

"تم ایک کام کرو گے طلال؟"

"ہاں کہو!"

"تم آئندہ میرے لیے شاپنگ نہیں کرو گے۔"

"کیوں؟" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"کیوں۔۔۔ ذرا ان چیزوں کو غور سے دیکھو تم یہ سب ریڈ کلر میں اٹھا لائے ہو' دنیا میں اور بھی رنگ ہوتے ہیں طلال!" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"مجھے لگا ریڈ کلر تم پر سوٹ کرتا ہے!" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"اور بھی کلرز مجھ پر سوٹ کرتے ہیں اگر کبھی غور سے دیکھا ہو تو!" اس نے تپ کر کہا۔

"تم۔۔۔ تم ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہو۔ کبھی جو میری کوئی بات' کوئی چیز تمہیں پسند آئی ہو' تم شروع ہی سے ایسی ہو صرف مجھ سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی ہو۔" اسے غصہ آگیا۔

"واٹ۔۔۔ میں ایسے کرتی ہوں؟ اور تم' تم کیا کرتے ہو؟" ہمیشہ تم نے مجھے جلانے اور چڑانے کی کوشش کی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب بھی تم نے صرف مجھے چڑانے کے لیے کیا ہے؟" وہ بھی غصے سے بولی تھی۔

"واٹ ربش۔۔۔ میں ہزاروں پاؤنڈز ان پر خرچ کر کے آیا ہوں اور تم کہتی ہو کہ۔۔۔"

وہ دونوں اپنی سابقہ حالت میں پہنچ چکے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے پر تھوک کے حساب سے الزامات کی بارش کر رہے تھے۔ آپ کو لگتا ہے کہ ان دونوں کا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس مسئلے کا کوئی حل ہے؟

✡

آمنہ ریاض

ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرو اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرو چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے' جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ہادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ نفیس کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ہادی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

منیبہ العباس طبیعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ

پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ 'تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ 'تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی ان سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس' ثروت دانیال کی اولاد ہے' جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور غصیلا بنادیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال' ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کرلیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد' زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً" ہادی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے۔ جس سے ہادی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ہادی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ہادی اس کی طبیعت صاف کردیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ہادی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں' لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ' ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ہادی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ہادی' ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان' ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ' ہادی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر' نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد' بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت تند آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے' لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد' جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت' دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن' ثروت کو فون کرکے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہوگئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ' ہادی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس' ہادی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ہادی کے باپ' رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ' ہادی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جاکر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ہادی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کرسکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کرلیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کردیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ہادی آرٹس نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ہادی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کرچکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ہادی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کرسکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہادی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

ہادی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ہادی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ہادی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ہادی کا دشمن ہوگیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ہادی سے بات کرنے سے منع کردیا۔ ہادی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کردی۔ انہوں نے ہادی کے سامنے شبیہہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انیبا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کردیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ہادی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پُراسراریت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کرلی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی' جب ہی ایک صبح اسے شبیہہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔

۲۳
تیئسویں قسط

ہادی بالکونی میں کھڑی تھی۔ معاً" اسے ڈرائیو وے پر کچھ گاڑیاں دکھائی دیں۔ ایک گاڑی کے پاس شبیہہ العباس کھڑا کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔ ہادی کی چھٹی حس یک دم بیدار ہوئی' اس نے بغور عورت کو دیکھا۔ اس کا مجموعی تاثر خوب صورتی کا تھا۔

"ہو نہ ہو یہی جنت بیگم ہے۔" ہادی نے زیرلب کہا۔

وہ عورت دور سے دیکھنے پر جتنی دلکش لگتی تھی۔ قریب آنے پر اس کی دلکشی اور خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ

ہوا تھا۔

بہت ہی شاہانہ سا رکھ رکھاؤ تھا' وقار تھا جو جنت بیگم کی شخصیت سے جھلکتا تھا۔

ماوی اس کے سامنے کھڑی دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی۔ جبکہ جنت بیگم کی آنکھوں میں الجھن بھرا استفہام تیر رہا تھا۔

ماوی یکدم آگے بڑھی اور بڑی بے تکلفی سے جنت بیگم کے گلے لگ گئی۔

"آپ سے مل کر مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔"

اتنا والہانہ پن..... جنت بیگم کا چہرہ ایک انجانی مسرت سے دمکنے لگا تھا' انہوں نے پیار سے ماوی کو دیکھا اور اس کے چہرے میں پہچان کا رنگ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ماوی نے دیکھا۔ جنت بیگم کی گہری بھوری آنکھوں میں اپنی پذیرائی کی چمک تھی تو اس کی طرف سے الجھن بھی تیر رہی تھی۔

"تم..... میں نے پہچانا نہیں؟" جنت بیگم نے الجھن آمیز نرم لہجے میں کہا۔ ماوی نے جانا' جتنی وہ خوب صورت تھی اس سے زیادہ دلکش اس کی آواز تھی۔

"آپ انہیں نہیں پہچان سکتیں بی جان! کیونکہ آپ نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے۔" اس سے پہلے کہ ماوی کوئی جواب دیتی' شبیہہ العباس نے ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کو زور سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ماوی رجب علی ہیں۔ دادا جان کے سب سے بڑے بیٹے کی اکلوتی دختر نیک اختر..... آئرلینڈ سے بطور خاص آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائی ہیں۔"

جنت بیگم کے عقب میں کھڑا اپنی پشت پر دونوں ہاتھ باندھے وہ گہری نظروں سے ماوی کو دیکھتا بے حد طنزیہ لہجے میں بول رہا تھا۔

جنت بیگم تو جنت بیگم دوسری طرف کھڑا جلال بھی اس اطلاع پر دم بخود رہ گیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ گاڑی کی دوسری سمت میں تھا' اس لیے اس کے تاثرات تو ماوی دیکھ نہیں سکی البتہ جنت بیگم کے چہرے پر بدلتے رنگوں کو ماوی نے دیکھا تھا اور دل ہی دل میں جی بھر کر محظوظ بھی ہوئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ دادی جان؟" اس نے فرط جذبات سے ایک بار پھر انہیں گلے لگانا چاہا لیکن اس بار جنت بیگم بدک کر پیچھے ہٹی' اپنے سابقہ تاثرات کی طرح وہ یہ تاثرات بھی چھپا نہیں پا رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں..... کچھ دیر آرام کروں گی۔" جنت بیگم نے یک دم خود پر قابو پاتے ہوئے لاتعلقی سے کہا۔ ایک نخوت بھری نظر ماوی پر ڈالی اور مخالف سمت میں چلی گئی۔ حرم اور عالیہ جھٹ پٹ ان کے عقب میں چل دی تھیں۔

شبیہہ العباس مستقل ماوی کو طنزیہ نظروں سے گھور رہا تھا جبکہ جلال ابھی تک اس اچانک لگنے والے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلا تھا۔

ماوی کی نظر جوں ہی اس پر پڑی' وہ گڑبڑا کر تیزی سے دوسری طرف چل دی تھی۔ اسے جنت بیگم کا سامنا کرنے سے اتنی گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جتنا ڈر جلال کا سامنا کرنے سے لگ رہا تھا۔

"ممی نے اسے برا پھنسایا ہے۔" صرف جلال کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں یہ جملہ گونجنے لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسا لگا سرپرائز!"

ماوی کو تیز قدموں سے جاتا دیکھ کر شبیہہ العباس نے کہا' اس کا مخاطب بجا طور پر جلال الدین تھا جو تقریباً "ہکا بکا" کھڑا ماوی کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

شبیہہ العباس نے گردن موڑ کر جلال کو دیکھا اور اس کے تاثرات دیکھ کر اپنی ہنسی چھپا نہیں پایا۔

"میں نے کہا' جلال الدین صاحب' اپنی پیاری سہیلی کو دیکھ کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" جلال بری طرح گڑبڑایا تھا۔

"بکواس نہیں کر رہا۔ صرف تمہاری رائے جاننا چاہ رہا تھا کہ اتنے زبردست سرپرائز پر کیسا محسوس کر رہے ہو' اتنی اچھی دوست ہے یہ لڑکی تمہاری اور اب اتنی قریبی رشتہ داری بھی نکل آئی ہے۔ یقیناً" تمہیں بڑی خوشی ہو رہی ہوگی۔" اس نے بغور جلال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیوں خوشی ہوگی؟" جلال فوری طور پر بات سنبھال نہیں پا رہا تھا نہ ہی اپنے تاثرات چھپا پا رہا تھا۔

"تو کیا تمہیں افسوس ہو رہا ہے؟" شبیہہ نے کریدا۔

"نہیں..... ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا تو پھر.....؟"

"پھر یہ کہ میں حیران ضرور ہوا ہوں۔" جلال نے محض اتنا کہا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو جلال! کہ تم صرف حیران ہوئے ہو۔ تمہیں اچھا خاصا شاک لگا ہے۔" شبیہہ کا انداز اچھا خاصا استہزائیہ تھا جلال بری طرح چڑ گیا۔

"تم یہاں کھڑے ہو کر اندازے لگاتے رہو۔ میں اتنی لمبی فلائیٹ سے تھک گیا ہوں۔ تھوڑا آرام کروں گا تو شاید تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں سننے کے لیے دماغ تیار ہو جائے۔" جلال نے اکتا کر کہا اور چلتا بنا۔ بغیر پلٹ کر شبیہہ کی طرف دیکھے بھی وہ جانتا تھا کہ وہ مستقل مسکرا رہا ہے۔ یوں جیسے اس کی چوری پکڑی ہو اور یہی خیال اس کے قدموں میں مزید تیزی بھر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ لڑکی حویلی میں کیا کر رہی ہے؟"

جنت بیگم نے بے حد سرد لہجے میں پوچھا تھا۔ سوال بلاشبہ ماوی کے بارے میں ہی کیا گیا تھا۔ مستقیم اور منصور کوئی بھی جواب نہ دے سکے۔ اتنی عمریں گزار کر بھی ان دونوں میں اتنی ہمت نہ آئی تھی کہ ماں سے اپنے حق کے لیے بول سکیں۔ اس وقت تو یوں بھی وہ طیش میں تھی اور اس کا انداز کہتا تھا کہ کوئی بھی وضاحت سننے پر راضی نہ ہو گی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں تم دونوں سے؟" انہیں مستقل خاموش پا کر جنت بیگم نے مزید بھڑک کر کہا۔ "کس نے اجازت دی اسے حویلی میں رہنے کی؟"

"ابا نے۔" بالآخر شبیہہ نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔

شبیہہ کی بات سن کر جنت بیگم پر جیسے بجلی گری تھی۔ اس نے بے یقینی سے مستقیم بھٹی کو دیکھا۔

"کیا شبیہہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

مستقیم بھٹی نے ناچار اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس بات نے جنت بیگم کے غصے کو دوگنا بڑھا دیا۔

"تم..... تم نے..... یہ حرکت منصور نے کی ہوتی تو میں مان بھی لیتی۔ اس کے پاس عقل کی کمی ہمیشہ سے رہی

ہے لیکن... لیکن مستقیم تم۔" دونوں کے چہروں پر رنگ گزرے تھے۔

"اماں! میری بات تو سنیں۔" مستقیم بھٹی نے کہنا چاہا۔

"کون سے کارنامے انجام دیے ہیں تم نے جن کو میں سنوں؟ اپنی طرف دیکھو مستقیم! سر میں ایک بھی بال ایسا نہیں جو سفید نہ ہو چکا ہو۔ میں نے اپنی پوری عمر گزار دی تاکہ تم لوگوں کی کچھ بھلائی ہو سکے لیکن تم بھائیوں کو عقل آنی تھی سو نہ آئی۔" وہ بہت بھڑک کر بول رہی تھی۔

"کیسی کیسی قربانیاں نہیں دیں میں نے تم لوگوں کے لیے اور تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ میرے ایک فیصلے کا مان ہی رکھ لو۔"

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں اماں!" مستقیم بھٹی نے تڑپ کر کہا۔

"غلط سمجھ رہی ہوں؟ ہرگز نہیں... کیا تم نہیں جانتے رجب اور اس کی بیوی بچی کو اس حویلی اور جائیداد سے دستبردار کروانے کے لیے میں نے کتنے جتن کیے تھے؟ سب کچھ جانتے بوجھتے تم نے پھر اس لڑکی کو حویلی میں گھسا لیا۔"

"صرف اس لیے اماں! کیونکہ مجھے لگتا ہے جو بھی ہوا' وہ غلط تھا۔" مستقیم بھٹی نے جلدی سے کہا' مبادا اس بار بھی اسے بولنے سے روک دیا جائے۔

"آپ نے کبھی غور کیا ہے اماں! کہ ہماری زندگی میں سکون کی کس قدر کمی ہے۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک لگتا ہے جیسے ہم سب مکمل اور بھرپور زندگیاں گزار رہے ہوں لیکن ہم سب اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ اتنے بے سکون کیوں ہیں ہم اماں! آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ایسی کیفیت تب سے ہے جب سے رجب کا انتقال ہوا ہے۔ آپ نے زبردستی اس کی بیوی اور بیٹی کو حویلی سے نکال دیا۔"

"بس اب اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا مستقیم!" جنت بیگم نے بھڑک کر کہا۔ کمرے میں چند منٹوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔

"بڑھاپا تم پر اب آیا ہے لیکن سٹھیا تو تم کئی سال پہلے ہی گئے تھے۔ ایسی باتیں میں آج نہیں سن رہی' کئی سالوں سے سن رہی ہوں کیے کرائے پر پانی پھیرنا کوئی تم جیسی اولاد سے سیکھے۔" جنت بیگم نے تنفر سے کہا۔

"تم سب لوگ فی الحال یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے تنہا رہ کر اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس لڑکی سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے۔"

جنت بیگم نے آرڈر جاری کیا۔ سر جھکا کر کمرے سے نکلنے والوں میں مستقیم بھٹی پہلا شخص تھا۔

٭ ٭ ٭

جلال کی بے چینی شبیہہ العباس سے مخفی نہ رہی تھی یا یوں کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ وہ اپنی بے چینی جمع پریشانی چھپا ہی نہ پا رہا تھا۔ دوسرے شبیہہ کے دل میں اس کی طرف سے پہلے ہی کچھ شک سا آیا ہوا تھا تب ہی وہ زیادہ دیر خاموش بھی نہ رہ سکا۔

"تم خود بتاؤ گے کہ مسئلہ کیا ہے یا میں بتا دوں؟"

"مسئلہ... کیسا مسئلہ؟" جلال اس کی بات پر ایک دم ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگا۔

"وہی مسئلہ جس کے لیے تم پریشان ہو۔"

"پریشان... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ خفیف سا ہنسا۔

"ہاہاہا... پریشانی تو تمہارے چہرے پر لکھی ہے۔"

"شبیہہ! فضول نہ بول یار!"

"اس میں فضول کیا ہے۔ سچ کہو کیا تم ہادی کی وجہ سے پریشان نہیں ہو؟" شبیہہ نے جیسے ناک کے وار کیا تھا۔ جلال کچھ بولتا' اس سے قبل ہی وہ پھر بول اٹھا۔

"مجھے اندازہ تھا اس لڑکی کو دیکھ کر تم چونک جاؤ گے' حیران ہو گے لیکن پریشان ہو گے۔ اس کا رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تمہاری اچھی دوست ہے' اسے دیکھ کر پریشان ہونے کی وجہ میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"شبیہہ! کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہر بات سے متعلق اندازے لگاتے رہو؟" جلال نے جیسے چڑ کر کہا تھا۔

شبیہہ بے ساختہ ہنسا۔

"اس کا مطلب میرے اندازے درست ہیں؟"

"شبیہہ! اللہ کو مانو یار! جان بخشو میری۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ معاف کیا... تم بھی کیا یاد کرو گے لیکن ہادی سے متعلق وہ راز کی بات تمہیں مجھے بتانا ہی پڑے گی جو تم نے اپنے دل میں دبا رکھی ہے۔"

"شبیہہ! تو پاگل تو نہیں ہو گیا! کس طرح کی باتیں کر رہا ہے؟"

"کوئی آج سے نہیں جانتا میں تمہیں جلال! جتنی تمہاری اور میری عمر ہے' اتنے ہی عرصے سے جانتا ہوں۔ تمہارے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا میرے لیے کبھی بھی مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ہاں اندازے کی سو فیصد درستی کا دعوا نہیں کرتا۔"

"میں کچھ دیر اور یہاں رکا تو ایسی باتیں کر کر کے تم میرا دماغ ہی چاٹ جاؤ گے۔ اس لیے بہتر ہے میں یہاں سے چلا ہی جاؤں۔ غضب خدا کا' رائی ہوتی ہے تو لوگ پہاڑ بناتے ہیں تم تو بنا رائی کے ہی پہاڑ بنانے لگے ہو۔" وہ ایک بار پھر چڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ٹھیک ہے جلال میاں! اگر تم نے ٹھان لی ہے کہ اپنے راز زبان نہ اگلو گے تو میرے پاس بھی اصل بات نکلوانے کے طریقے کم نہیں ہیں۔ اب میں اس بات کا پتا لگا کر ہی رہوں گا۔" شبیہہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

تند مزاج تو خیر وہ ہمیشہ سے رہی تھی۔

لیکن اتنی بھی نہیں کہ فوراً "انتقام" کے لیے سوچنے لگے۔

ایسا پہلی بار ہی ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن نے فوراً "کوئی لائحہ عمل ترتیب دینا شروع کر دیا تھا۔

یا شاید ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا تب ہی تو آج وہ اس مقام پر تھی۔

اور اس مقام پر بھی وہ ہمیشہ سے ہی تھی۔ بلا شرکت غیرے' ہر طرح کا اچھا برا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد۔

بچپن سے ہی وہ یہ دیکھتی آ رہی تھی کہ اسے ہمیشہ خاص مقام ملتا' اس کے باپ نے اسے یہی سکھایا تھا کہ وہ بہت خاص ہے۔ خوب صورتی اور ذہانت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔

اس کے فیصلے پتھر پر لکیر کی طرح ہیں جو مٹ نہیں سکتے' وقت کے ساتھ معدوم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہ رات کو دن کہنا چاہے تو دیگر افراد پر فرض ہے کہ وہ بھی دن کو رات مان لیں۔

اور دن کو رات کہہ دے تو کوئی اس سے بھی منحرف نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان سے ادا ہوا ہر لفظ سچا ہے۔

وہ معصومیت میں فرشتوں کو مات کرتی ہے۔

اب وہ فرشتوں کو مات کرتی تھی یا نہیں لیکن اسے ایسا ہی لگنے لگا تھا۔ جو انسان اس طرح کی باتیں سنتا پروان چڑھا ہو۔ اس سے بھلائی کی توقع ذرا کم کم ہی کی جا سکتی ہے۔

جب سوتیلی ماں اس کے راستے میں حائل ہونے لگی تو اس نے مہارت سے سوتیلی ماں کو پچھاڑ دیا۔

شوہر نے اڑی کی تو اسے راستے سے ہٹا دیا۔

بلکہ اس نے تو راستے میں آئے ہر اس پتھر کو مہارت سے ہٹایا تھا جس سے اسے ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ رجب کا پتھر راستے سے ہٹ جانے کے بعد وہ ثمینہ اور اس کی بیٹی کو کانٹا بن کر اپنے حلق میں اٹکا رہنے دیتی۔ اس نے بڑی مہارت سے ان کے پتے بھی صاف کر دیے تھے۔

ہاں ایک بار تھوڑی بھلائی ذہن میں آئی جو در حقیقت اس کے اپنے فائدے کی ہی تھی تو پھر سے ثمینہ کے در پر پہنچی لیکن اس بار ثمینہ نے اسے رد کر دیا تھا۔

جنت بی بی اشتعال سے بھر گئی۔ بس نہ چلتا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ دو ٹکے کی عورت نے اسے انکار کر دیا۔ کیوں؟ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی؟ تب وہ اسے دھمکا کر واپس چلی آئی۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس کا غصہ بڑی مشکلوں سے ٹھنڈا ہوا تھا اب پھر ثمینہ کی بیٹی اس کے سینے پر مونگ دلنے چلی آئی تھی۔

جنت بی بی کو اس لڑکی سے کوئی خدشہ نہ تھا' جہاں اپنوں کا مقابلہ کر لیا' وہاں یہ نازک سی لڑکی کیا چیز تھی۔

صدمہ تھا' غصہ تھا تو صرف اس بات کا کہ بیٹے نے اس کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا۔

وہ تو ماں کا پلو پکڑ کر چلنے کا عادی تھا۔ ماں کی ہر بات آنکھیں اور کان بند کر کے ماننے کا پابند۔ پھر وہ منحرف کیسے ہو رہا تھا۔ آخر ایسی کون سی جادوگری کی تھی اس لڑکی نے کہ مستقیم اسے ہی صحیح قرار دینے لگا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ مستقیم بھٹی نے پھر ماں کے کمرے میں جھانکا۔

”تم یہاں سے چلے جاؤ مستقیم! بے حد غصہ ہے مجھے تم پر۔“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

”اماں! کیا مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا ایک موقع بھی نہیں دیں گی آپ؟“ مستقیم بھٹی کے دل پر ماں کی خفگی کے خیال سے ٹھیس سی لگی۔

”صفائی پیش کرنے کا موقع۔۔۔؟“ جنت بیگم نے سرد مہری سے کہا۔ ”کیا تم میں خود عقل نہیں ہے جو اس لڑکی کو حویلی میں گھسا لیا؟“

”اماں! آپ مادی سے ایک بار بات تو کر کے دیکھیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ بری لڑکی نہیں ہے۔“ مستقیم نے گھگھیا کر کہا۔

”مجھے اس کی اچھائی' برائی سے کیا لینا دینا۔ میں نے کون سا اسے اپنی بہو بنانا ہے جو اس بات پر دھیان دوں۔“ جنت بیگم نے نخوت سے کہا۔

”اماں۔۔۔!“

”بس۔۔۔“ جنت بیگم نے سرد مہری سے اسے ٹوک دیا۔

”اس لڑکی کو میرے پاس بھیجو۔ دیکھوں تو سہی بٹیا کتنے پانی میں ہے۔ ثمینہ کی بھی بڑی ہمت ہے۔ جو جوان جہان بیٹی کو اٹھا کر اتنی حوصلہ مندی سے حویلی بھجوا دیا۔ کیا وہ جانتی نہیں ہے مجھے۔“

یہ آخری جملہ خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔ مستقیم بھٹی کے لیے یہی بہت تھا کہ "پیاری اماں" مادی سے بات کرنے پر راضی ہو گئی ہیں۔

☼ ☼ ☼

اور مادی کتنے پانی میں ہے۔ اس بات کا اندازہ جنت بیگم کو اگلے چند منٹوں میں بخوبی ہو گیا تھا۔ جب مادی نے ملازمہ کو یہ کہہ کر واپس بجھوا دیا کہ ابھی وہ آرام کر رہی ہے اور عصر کی نماز کے بعد جنت بیگم سے ملنے آئے گی۔ جنت بیگم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اتنی ہمت تو ان کے بچوں اور پھر آگے ان کے بچوں نے بھی کبھی نہ کی تھی کہ وہ بلوائے اور کوئی آنے سے انکار کر دے۔

وہ تن فن کرتی مادی کے سر پر پہنچی۔ مادی بی بی پلنگ پر نیم دراز کانوں پر ہیڈ فون لگائے کسی دھن پر گردن اور پیر ایک ساتھ ہلا رہی تھی۔

جنت بیگم کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی اور نزاکت سے ہیڈ فون اتارتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"آپ نے کیوں زحمت کی دادی جان! میں عصر کے بعد خود آجاتی آپ سے ملنے۔"

"پہلے تو کچھ باتیں ذہن نشین کر لو' ایک تو یہ کہ میں تمہاری دادی نہیں ہوں۔ تمہارے باپ کی ماں اس کے بچپن میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی اور مجھے لے پالک بچے پالنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس لیے اگلی بار تم مجھے دادی کہہ کر مخاطب مت کرو تو اچھا ہو گا۔

دوسری بات یہ کہ اگلی بار میں تمہیں بلواؤں تو فوراً آنا۔ میری بات سے انکار کی جرأت آج تک اس حویلی میں کسی نے نہیں کی اور تم جب تک اس حویلی میں ہو' اس اصول کی پیروی کرو تو تمہارے حق میں بہت ہی اچھا ہو گا۔" جنت بیگم نے سرد مہری سے کہا۔

"چھوٹی سی دو باتیں۔۔۔ لیکن اتنے غصے میں۔۔۔ اور یوں کھڑے کھڑے۔" مادی نے حسب سابق مسکرا کر کہا۔

"اب اگر آپ میرے کمرے میں آ ہی گئی ہیں تو آئیے نا! اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" بھگو بھگو کر لگانے میں تو اسے یوں بھی ملکہ حاصل تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جنت بیگم کو بخش دیتی۔ اس کی بات پر جنت بیگم نے بری طرح پیچ و تاب کھایا تھا۔

"یہ کمرا تمہارا ہرگز نہیں ہے۔ ہاں! تمہیں عارضی طور پر چند روز کے لیے ضرور دیا گیا ہے۔ یہ حویلی میری ہے اور اس کا ہر کمرا بھی میرا ہے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے مجھے کسی کی دعوت یا اجازت کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔" جنت بیگم نے اسٹائلش سی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ واضح طور پر گہری ہوئی تھی۔ لیکن اس بار وہ خاموش رہی اور پلنگ کے کنارے پر ٹک کر جنت بیگم کی اگلی بات کا انتظار کرنے لگی۔

"دیکھو لڑکی! جو بھی تمہارا نام ہے۔" جنت بیگم نے نخوت سے سر جھٹکا۔ "مجھے تم سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی' صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟ کس مقصد کے لیے آئی ہو تم حویلی میں؟"

"میں آپ لوگوں سے ملنے۔۔۔ اس حویلی میں رہنے۔۔۔" مادی نے کہنا چاہا' جنت بیگم نے درشتی سے ٹوک دیا۔

"تمہارے اس جھوٹ پر مستقیم یقین کر سکتا ہے' میں نہیں۔" اس نے کڑی نظروں سے مادی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہو گا کہ مجھے باتوں میں الجھانے کے بجائے تم اصل بات بتاؤ۔ شکل سے تو اچھی خاصی چالاک لگتی ہو' میرا نہیں خیال کہ تم محض یہاں کسی سے ملنے آئی ہو۔"

مادی کھل کر مسکرائی' پھر مسکراتے مسکراتے ہنس دی۔

"چلیں۔ آپ کے بارے میں میرا یہ اندازہ تو درست ثابت ہوا کہ آپ شکل دیکھ کر انسان کو پہچان لیتی ہیں۔" اس کا انداز صاف مذاق اڑاتا ہوا تھا۔ "اور اب آپ کو پتا چل ہی چکا ہے کہ میں بہت چالاک ہوں تو جھوٹ بول کر میں کیا کروں گی۔ آپ صحیح سمجھ رہی ہیں' میں اس حویلی میں محض آپ لوگوں سے ملنے نہیں آئی' بلکہ میرا مقصد کچھ اور ہے۔" وہ مزے سے بول رہی تھی۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مختصر لفظوں میں وہی مقصد بیان کر دو۔" جنت بیگم نے سلگ کر کہا۔ "اتنے سالوں کے بعد آخر تمہیں یا تمہاری ماں کو کیا سوجھی کہ تمہیں اٹھا کر یہاں بجھوا دیا' آخر کوئی نہ کوئی مقصد تو ہو گا۔"

"ظاہر ہے۔" وہ حسب سابق مسکرائی۔ "ویسے بھی اتنے مصروف دور میں اتنا فضول وقت کس کے پاس ہے کہ محض رشتہ داروں سے تعلق قائم رکھنے کو اتنی دور آتا پھرے۔" اس نے بنا کسی لاگ لپیٹ کے کہا تھا۔

جنت بیگم کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ اسے اتنی صاف گوئی کی توقع بھی نہیں تھی۔

"تو پھر۔۔۔؟"

"مجھے اپنے دادا کی وراثت میں سے اپنے بابا کا حصہ چاہیے۔"

"ہاہاہا۔۔۔ وہ تو تمہیں نہیں مل سکتا۔" جنت بیگم نے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔ "کیونکہ تمہارا باپ اپنا حصہ پہلے ہی وصول کر چکا ہے۔"

"کوئی ثبوت؟" مادی نے تیکھے انداز سے پوچھا۔

"تمہیں ثبوت دینے کی پابند نہیں ہوں میں۔"

"ثبوت تو آپ کو دینا ہی پڑے گا۔ چاہیں تو اسے چیلنج سمجھ لیں۔"

"تم بھی اسے چیلنج سمجھو۔ ڈھونڈ سکتی ہو تو خود ثبوت ڈھونڈ لو۔ مجھ سے تعاون کی امید مت رکھنا۔" جنت بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈھونڈ تو میں لوں گی اور تعاون بھی آپ کو کرنا پڑے گا۔ اسپیشلی میرے بابا کے قاتل کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے میں تو آپ کو ہی تعاون کرنا پڑے گا۔"

جنت بیگم تڑپ کر پلٹی' "کیا کہا تم نے؟"

"وہی جو آپ نے سنا۔" مادی نے بے مروتی سے کہا اور جنت بیگم کے تاثرات کو بغور جانچا۔

"جب آپ میرے ساتھ کوئی لحاظ' مروت رکھنے کو تیار نہیں ہیں تو مجھے بھی فرشتہ نہ سمجھیں کہ میں تمیز سے پیش آؤں گی۔ میرے بابا کا قاتل کون ہے' میں نہیں جانتی' لیکن آپ اور آپ کے بچے میرے شک کے دائرے میں سب سے پہلے آتے ہیں۔"

"تو تم ہمارے خلاف ثبوت ڈھونڈو گی؟"

"آپ نے میری بات غور سے نہیں سنی شاید۔ میں نے کہا میں قاتل کے خلاف ثبوت لینے آئی ہوں۔" اس ایک جملے میں اس نے بہت کچھ جتا دیا تھا۔ جنت بیگم کا پورا وجود پہلے حیرانی اور پھر غصے سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔ اس نے بری طرح مادی کو گھورا' پھر تمسخرانہ ہنس دی۔

"تمہارے پاس صرف چار دن ہیں۔ جو ڈھونڈنا ہے ڈھونڈ لو' ٹھیک چوتھے دن میں تمہیں اس حویلی سے باہر پھنکوا دوں گی۔"

"میرا دل چاہے گا تو میں چار دن رکوں گی اور دل چاہے گا تو چار مہینے۔"

"اتنا بڑا دعوا مت کرو لڑکی! منہ کے بل گرنے میں ایک منٹ ہی لگتا ہے۔"

"دوسروں کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر کے انہیں گرانے کا آپ کو بہت شوق ہے' لیکن افسوس' اس بار

آپ خود کو اوور اسٹیمیٹ کر رہی ہیں۔"

"پہلی بار تمہارا جنت بیگم سے سامنا ہوا ہے۔ اسی لیے اتنا اونچا اڑ رہی ہو۔ چند روز کی بات ہے سب سمجھ آجائے گا۔"

"اور آپ کا سامنا آج تک جن لوگوں سے ہوا وہ بودے لوگ تھے۔ آپ بھی مجھ سے پہلی بار مل رہی ہیں۔ اتنی جلدی میرے بارے میں آپ بھی کوئی بھی اندازہ نہ لگائیں۔ میں جس مقصد کے لیے آئی ہوں اسے پورا کرکے ہی جاؤں گی۔"

جنت بیگم تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اسی وقت ملازمہ مہمانوں کی آمد کا پیغام لیے چلی آئی "حرم باجی کی ساس اور نند آئی ہیں۔"

جنت بیگم نے اسے جانے کا اشارہ کر کے ماوی کو دیکھا۔ "صرف چار دن...... یاد رکھنا۔" اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ماوی کے لبوں پر گہری مسکراہٹ آگئی۔

☆ ☆ ☆

انبیا باہر نکلی تو دیکھا فیضان برآمدے میں پریشان سے ٹہل رہے تھے۔

"خیریت تو ہے آپ پریشان لگ رہے ہیں۔" انبیا نے آگے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... میں ماوی کے لیے پریشان ہوں۔" فیضان نے کہا۔

"کیا مطلب کیا ہوا ہے ماوی کو؟" انبیا نے بھی پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہی تو پتا نہیں..... لیکن وہ کل سے واپس نہیں آئی نہ ہی میرا اس سے فون پر رابطہ ہو پا رہا ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلوایا تھا کہ تمہیں اس کے ہاسٹل کے بارے میں کچھ علم ہے کہ....."

وہ الجھے الجھے سے بول رہے تھے۔ انبیا نے دیکھا ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سنہری دھوپ منتشر بن کر پھیل گئی تھی۔ انبیا کا دل چاہا ان کی آنکھوں سے ساری پریشانی چن لے لیکن.....

"ماوی کے ہاسٹل کا علم مجھے کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے بارے میں تو آپ کو ثمینہ آنٹی سے پوچھنا چاہیے۔"

اس نے خفیف سا سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے نکالنا چاہا۔ جس کا شکار وہ فیضان کو دیکھ کر ہو جاتی تھی۔

"میں آپا سے پوچھ چکا ہوں۔ وہ کہتی ہیں ان کے ڈیلی جانے تک وہ یہیں رہ رہی تھی لیکن اب اس طرح اچانک غائب ہو گئی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" فیضان نے کہا تو انبیا بری طرح چونکی۔

"ڈیلی جانے کے بعد.....؟" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"آپ اس کے ڈپارٹمنٹ سے پتا کریں، ہو سکتا ہے اس نے کوئی پرائیویٹ ہاسٹل لیا ہو یا....." لیکن اس کا جملہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ ولید کی آواز نے مداخلت کی۔

انبیا نے گردن موڑ کر دیکھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر ان دونوں کے پاس آگیا تھا۔

"السلام علیکم فیضان بھائی..... آپ کب آئے؟"

"کل دوپہر میں آیا ہوں۔" فیضان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تم کیسے ہو ولید! بہت کمزور ہو گئے ہو۔"

وہ کئی روز بعد اسے دیکھ رہے تھے اور اس کی شخصیت میں آئی تبدیلی کو صحیح نام دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ بظاہر کچھ بھی نہیں تھا، لیکن کچھ نہ کچھ تو ایسا تھا جو چونکانے کا سبب بنا تھا۔ ولید کی رنگت میں واضح طور پر زردی

کھلی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی واضح نظر آرہے تھے۔

"بس پڑھائی کا برڈن بہت زیادہ ہو گیا ہے فیضان بھائی! اچھا آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔ انو! تم ذرا آنا، مجھے کام ہے تم سے۔"

انبیا نے ایک معذرت خواہانہ نظر فیضان پر ڈالی اور ولید کے پیچھے چل دی۔

☆ ☆ ☆

جنت بیگم کے غصے کی انتہا نہیں رہی تھی۔ جب اس نے ماوی کو ڈرائنگ روم میں آتے دیکھا۔

ماوی نہ صرف یہ کہ بنا اجازت اندر آئی تھی، بلکہ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا تعارف بھی کروا دیا تھا اور اب وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجائے مزے سے بیٹھی باتیں مٹھار رہی تھی۔

"آپ نے کبھی جتایا ہی نہیں کہ آپ کے بڑے بیٹے کا انتقال ہو چکا ہے۔" حرم کی ساس نے روئے سخن جنت بیگم کی طرف موڑتے ہوئے کہا تھا۔

"ایکچوئیلی! ابا کی وفات کے بعد ممی مجھے اپنے بھائی کے پاس دبئی لے گئی تھیں۔ جب ہم یہاں تھے ہی نہیں تو یقیناً "دادی جان" نے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہو گا۔"

جنت بیگم کی بجائے ماوی نے جھٹ سے کہا۔ جنت بیگم تلملا کر رہ گئی۔ لیکن خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسری جانب ماوی بے حد اطمینان محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہاں جنت بیگم کے چیلنج کا سامنا کرنے ہی آئی تھی، لیکن حرم کی ساس اور نند کو دیکھ کر بھی اسے خاصا اطمینان حاصل ہوا تھا۔ ورنہ حرم کے منگیتر کی تصویر نے تو اسے اچھا خاصا مایوس کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بڑی عمر کا اور بے حد واجبی شکل و صورت کا مالک تھا۔

"پاکستان آئی ہو تو اچھا ہے حرم کی شادی میں بھی شرکت کر لو گی۔" حرم کی نند نے ماوی سے بے تکلف ہونے میں بڑی جلدی دکھائی تھی۔ اس کی ساس نے جاتے ہوئے بطور خاص ماوی کو بھی اپنے یہاں آنے کی دعوت دی

تھی۔ وہ لوگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ رکیں۔ اس دوران ہادی مستعدی سے بیٹھی جنت بیگم کا دل جلاتی رہی اور جیسے ہی مہمان خواتین رخصت ہوئیں' ہادی بھی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ تیر چلا آئی تھی اور بخوبی جانتی تھی کہ تیر نشانے پر ہی لگے گا۔ حسب توقع جنت بیگم نے فوراً ہی مستقیم کے سر پہ برسنا شروع کر دیا تھا۔

"اس لڑکی کو ابھی فوراً حویلی سے نکال دو۔ میں اس کی موجودگی ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اماں! آپ کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو بڑی غیر مناسب بات ہوگی کہ اسے اس طرح سے نکال دیا جائے۔" اصل معاملے سے بے خبر مستقیم نے دبے لفظوں میں کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی' بے تکی بات ہے تو یوں ہی سہی۔" جنت بیگم نے سلگ کر کہا۔

"آپ کو حرم کی شادی تک تو انتظار کرنا ہی پڑے گا اماں! کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔" مستقیم نے کہا۔

"کہہ دیں گے کہ وہ واپس چلی گئی ہے۔" جنت بیگم نے فوراً کہا۔

"ممکن نہیں بی بی جان!" شبیہہ نے بڑی سنجیدگی سے مداخلت کی تھی۔ "حرم کی سسرال کا معاملہ نہ ہوتا تو باآسانی کچھ بھی کہا جا سکتا تھا لیکن اب ہمیں بہت خیال رکھنا پڑے گا۔"

بات معقول تھی' جنت بیگم کے دل کو لگی اور ناچار اسے چپ ہونا پڑا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ ہادی کو اس کی اوقات سمجھانے میں ایک منٹ بھی نہ لگائے۔ دوسری جانب ہادی کی تمسخر اڑاتی مسکراہٹ کا تصور اسے سلگا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

فیضان نے درست کہا تھا۔ ولید واقعی کمزور ہو گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ولید کے لیے متفکر رہنے کے باوجود انبیا یہ بات محسوس نہیں کر سکی تھی اور اب فیضان کی نشاندہی کے بعد اسے ولید سچ مچ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ انبیا نے ایک محبت بھری متفکر نظر سوئے ہوئے ولید پر ڈالی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔

ولید نے اس سے پانی میں سرکہ ملا کر دینے کے لیے کہا تھا اور پورا گلاس وہ غٹاغٹ چڑھا کر سو گیا تھا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ انبیا کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن اپنی پریشانی وہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی بھی اس نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ فیضان نے بغور' لیکن الجھن آمیز انداز میں ولید کو دیکھا ہے تو جو تبدیلی وہ یا کوئی بھی دوسرا شخص ولید میں محسوس کر سکتا ہے' وہ ڈیڈی کو دکھائی کیوں نہیں دے رہی۔

فیضان کا خیال آتے ہی اس کا ذہن فوراً ہادی کی طرف چلا گیا' اور اسے فیضان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ کچھ دیر ان باتوں پر غور کرتی رہی لیکن جب الجھی ہوئی گتھی کا کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تو اٹھ کر انیکسی کی طرف آ گئی۔

فیضان انیکسی کے سامنے والے برآمدے میں ادھر ادھر مضطرب انداز میں چکر لگاتے ہوئے موبائل فون کان سے لگائے ثمینہ سے بات کر رہے تھے۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ثمینہ آپا! اگر آپ اسے یہیں چھوڑ کر گئی تھیں تو اب کیا اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ میں کل سے ہادی کے لیے پریشان بیٹھا ہوں۔ اگر وہ ہاسٹل میں بھی رہنے لگی ہے تو کم سے کم یہاں

کسی کو تو پتا ہونا چاہیے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ اتنی لاپروا کب سے ہو گئیں کہ بیٹی کی [illegible]
بالکل درست' لیکن میں اسے تلاش بھی کروں تو کہاں؟ اس کا ایڈریس آپ کے پاس ہے یا کوئی کانٹیکٹ نمبر۔
حد کرتی ہیں آپ آپا۔ ایسی بھی کیا لاعلمی۔ بچپن میں تو آپ ہادی کو کسی فرینڈ کے گھر بھی نہیں جانے دیتی تھیں اور اب۔ ٹھیک ہے۔ کوشش کریں اور پھر مجھے بتائیں۔"

انہوں نے کان سے موبائل ہٹایا تو ان کی نظر انبیا پر پڑی۔

"تم' کب آئیں؟" ان کا لہجہ اکتایا ہوا ضرور تھا' لیکن نرم تھا۔

"ابھی چند منٹ پہلے۔" انبیا نے بتا کر پوچھا۔ "ہادی کا کچھ پتا چلا؟"

فیضان نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کہ اسے کہاں تلاش کروں؟"

"یہاں بیٹھ کر تو آپ اسے تلاش کر بھی نہیں سکتے۔ اس کے لیے تو آپ کو ڈبلن جانا پڑے گا۔" انبیا نے برآمدے میں نصب لکڑی کے جھولے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ڈبلن جا کر کیا کروں گا' جبکہ ہادی پاکستان میں لاپتا ہوئی ہے۔" فیضان نے کسی قدر حیرانی سے کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے' ہادی پاکستان میں نہیں تھی۔ وہ تو ثمینہ آنٹی سے بھی چند روز پہلے واپس آئرلینڈ چلی گئی تھی۔" انبیا نے جیسے انہیں اطلاع دی۔

"کیا؟" فیضان بری طرح چونکے۔

"ہاں! بالکل۔ اور یہ بھی مجھے ثمینہ آنٹی نے بتایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے بتایا تھا۔ ہادی پہلے جا رہی ہے' چونکہ ان دونوں کو ایک فلائٹ کی سیٹیں نہیں مل سکیں۔ اس لیے وہ خود چند روز کے بعد جائیں گی' تب ہی وہ جاتے ہوئے انیکسی خالی کر گئی تھیں۔ ورنہ آپ خود سوچیں! اگر ہادی یہاں رہ رہی ہوتی تو اس کا کچھ سامان تو یہاں پڑا ہوتا۔" بات میں وزن تھا۔ فیضان سوچ میں پڑ گئے۔

"لیکن۔ آپا نے تو کہا تھا وہ یہاں ایڈمیشن لے چکی ہے اور تم لوگوں کی انیکسی میں رہ رہی ہے۔" فیضان الجھن آمیز لہجے میں بولے۔

"کہا تو ہادی نے مجھ سے بھی یہی تھا۔ لیکن پھر ایک روز اچانک وہ چلی گئی۔ مجھ سے ملی بھی نہیں۔ میں نے اسے جاتے دیکھ کر ثمینہ آنٹی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا وہ آج کی فلائٹ سے واپس آئرلینڈ جا رہی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" فیضان کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

"عجیب تو مجھے بھی لگا تھا کہ وہ اس طرح اچانک کیوں جا رہی ہے۔ لیکن ان دنوں میں خود اتنی پریشان تھی کہ اس بات پر زیادہ غور ہی نہیں کر سکی۔"

"تم۔ تم کیوں پریشان تھیں؟"

انبیا پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"ابھی آپ خود بہت پریشان ہیں۔ یہ گتھی سلجھا لیں' پھر بتاؤں گی۔" اس نے جھولے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ فیضان محض سر ہلا کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

ثمینہ نے فوراً ہادی سے بات کی۔
"میرے لیے تو اچھی خاصی مصیبت ہو گئی۔ فیضان اچانک اٹھ کر پاکستان پہنچ گیا ہے اور اسے پتا چل گیا ہے کہ تم وہاں نہیں ہو۔ میں نے بات سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اب میری سمجھ میں نہیں آرہا فیضان کو کس طرح مطمئن کروں۔ وہ تو بال کی کھال نکال کر چھوڑے گا۔" وہ بہت متفکر سی بول رہی تھیں۔
"اب میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" ہادی نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔
"بھئی! مجھے مشورہ تو دو۔" ثمینہ جھنجلا کر بولیں۔ "فیضان کو بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے تمہیں حویلی بھیجا ہے تو وہ تو میری جان کو آجائے گا۔"
"مجھے ڈبلن سے پاکستان لانے اور پھر حویلی بھجوانے تک کی پلاننگ تو آپ نے بخوبی کرلی تھی۔ اب فیضان ماما کو مطمئن کرنے کی ترکیب بھی خود ہی سوچیں۔ کم سے کم اس معاملے میں مجھ سے کسی تعاون کی امید نہ رکھیں تو بہت اچھا ہو گا۔" ہادی نے دوٹوک کہا۔
"لیکن ہادی! میں اکیلی یہاں کیسے بات سنبھالوں؟"
"جب میں یہاں اکیلی بہت سارے مسائل کا سامنا کر سکتی ہوں تو آپ اکیلی بات کیوں نہیں سنبھال سکتیں؟" ہادی کے انداز میں تلخی تھی۔ "اور ویسے بھی اس پہلو پر بھی آپ کو پہلے سے سوچ کر رکھنا چاہیے تھا۔"
"تم کبھی کبھی حد کر دیتی ہو ہادی! اتنی لاتعلق ہو جاتی ہو جیسے مجھ سے۔ اس سارے معاملے سے تمہارا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔"
"واسطہ ضرور ہے ممی! لیکن آپ نے اس سارے معاملے کو میرے لیے اتنا کومپلیکیٹڈ بنا دیا ہے کہ میری پوزیشن بہت عجیب سی لگتی ہے۔" ہادی نے سرد مہری سے کہا۔
ثمینہ چند لمحے چپ سی رہ گئیں۔
"اچھا! جنت بیگم کا رسپانس کیسا رہا؟" ثمینہ نے اگلے ہی لمحے ہتھیار ڈال دیے کہ انہیں یہ بات سمجھ میں آگئی تھی اس معاملے میں وہ کوئی تعاون نہ کرے گی۔
اس سے قبل کہ ہادی کوئی جواب دیتی اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور جنت بیگم کو دیکھ کر پل بھر کے لیے گڑبڑائی۔ لیکن اگلے ہی لمحے مطمئن ہو گئی کہ جنت بیگم کے انداز سے لگتا تھا' وہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی ہے۔
"میں آپ سے پھر بات کروں گی۔" اس نے فون بند کرنے میں ایک پل بھی صرف نہیں کیا تھا۔ اس کی نظریں جنت بیگم پر تھیں۔
"آپ نے دوبارہ زحمت کی۔ اس بار تو مجھے بلوالیا ہوتا۔" اس کا انداز سادہ سا تھا۔
"میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ اگر تمہاری آج کی حرکت پر میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو تم اسے میری کمزوری ہرگز نہ سمجھو۔"
"اوکے۔ فائن۔ اور کچھ؟" ہادی نے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ چہرے کے آگے لہراتے ہوئے پوچھا۔
"تم انتہائی بدتمیز اور بدتہذیب لڑکی ہو۔" جنت بیگم نے دانت یوں کچکچائے گویا یقین ہو دانتوں تلے ہادی کی گردن ہے۔

"اوہ... ہولڈ آن... اتنی بھی بدتمیز یا بدتہذیب نہیں ہوں۔" اس کا انداز دوستانہ ہوگیا۔ "دراصل! میں آپ کو بری ہی بہت لگی ہوں' تب ہی آپ میری کوئی بات برداشت نہیں کرپا رہیں۔ بس دادی جان! اس سارے معاملے کو جنگ کی طرح ہینڈل نہ کریں تو بہتر ہے۔ میں یہاں اپنا جو حق لینے آئی ہوں' اس کی ڈیمانڈ کرنا تو بہرحال میرا حق بنتا ہے۔"

"مجھے باتوں میں مت الجھاؤ اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ حرم کی شادی میں اگر تمہاری وجہ سے کوئی بدمزگی ہوئی تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گی اور شادی کے بعد تو میں ویسے بھی تمہیں حویلی سے باہر پھنکوا ہی دوں گی۔"

جنت بیگم کا انداز تنبیہی تھا۔ ماوی کا مفاہمت آمیز رویہ بھک سے اڑ گیا۔

"آپ نے تو چار دن بعد کے بارے میں بھی یہی کہا تھا۔"

وہ جان بوجھ کر زور سے بولی' کیونکہ جنت بیگم اپنی بات مکمل کرکے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جلال نے شبیہہ کے سوالوں سے تو پیچھا چھڑا لیا' لیکن خود یہ گتھی کسی طرح سلجھا نہ پا رہا تھا کہ ماوی حویلی میں کیا کررہی ہے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح ماوی سے بات کرنے کا موقع مل جائے' لیکن ایسی کوئی صورت حال بن ہی نہ پا رہی تھی۔ ایک تو حویلی میں لوگ ہی اتنے تھے کہ کسی کی نظروں سے بچ کر بات کرپانا ممکن ہی نہ تھا۔ دوسرے ماوی کبھی تنہا نظر ہی نہ آئی تھی۔ وہ عموماً حرم' تنوی یا نمل میں سے کسی کے ساتھ دکھائی دیتی۔

تھک ہار کر جلال نے رات کے وقت اس کے کمرے میں جانے کا سوچا۔ گو کہ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو وہ بری طرح پھنس جاتا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ اس کے بغیر گزارہ بھی نہ تھا۔

لہٰذا رات کے پچھلے پہر جب اسے یقین ہوگیا کہ حویلی کے تمام مکین سوچکے ہیں' اس نے ماوی کے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔

☼ ☼ ☼

اگلی دستک اس سے زوردار تھی۔ تیسری دستک اس سے بھی زیادہ۔

زوردار آواز۔ سنسان راہداری میں گونجی۔ جلال بے اختیار پچھتایا۔

اسی وقت ماوی کے کمرے کی لائٹیں جل اٹھیں۔ چند لمحے کے فرق سے اس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ لیکن جھری سی بنا کر باہر جھانکا۔

جلال نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بنا دروازے پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے اور پوری قوت سے اسے دھکیلا اور اندر داخل ہو کر اسی سرعت سے دروازہ بند کردیا۔

"تم... یہاں کیا کررہے ہو جلال؟" ماوی سٹپٹا گئی۔

"یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ تم یہاں کیا کررہی ہو؟" جلال نے دبی آواز میں' لیکن زور دے کر کہا۔

"یہ بات صبح بھی ہوسکتی ہے۔" ماوی نے کہا۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ صبح بھی تم بات کرنے کا موقع نہیں دوگی۔ سارا وقت جان بوجھ کر تم حرم لوگوں کے ساتھ لگی رہتی ہو تاکہ مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔"

"جلال اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے' جتنا لگتا ہے۔" ماوی نے بے اختیار سوچا۔

"اب تم یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟" جلال نے کہا۔

ماوی تھکے ہوئے انداز میں پلنگ کے کنارے پر ٹک گئی۔ اسے یقین ہوچکا تھا کہ جلال کے سوالوں سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

"ممی نے تمہیں ہمارے رشتہ داروں کے متعلق بتایا تھا نا اور میری سوتیلی دادی کا بھی... تو وہ رشتہ دار تم لوگ ہی ہو۔"

"لیکن..." جلال نے کہنا چاہا۔

"پلیز! مجھے کہنے دو۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں جلال! کیونکہ یہاں آنے تک میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم سے اتنا قریبی رشتہ نکل آئے گا۔ میں تو یہاں اپنے بابا کی جائیداد کا مطالبہ کرنے آئی تھی اور ان کے قاتل کا سراغ ڈھونڈنے' لیکن..."

اس کے خوب صورت چہرے پر ادھوری نیند تحریر تھی۔ کھلے ہوئے بال بے ترتیبی سے چہرے کے اطراف میں بکھرے تھے۔ اس نے لمبی قمیص کے ساتھ چیک دار ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور اس حلیے میں بھی وہ اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کا دل نہ چاہتا تھا۔

"اس میں شرمندہ ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔" جلال نے فکرمندی سے کہا۔ "مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اب دادی جان کو کس طرح مناؤں گا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا پایا ہوں' وہ تمہیں کچھ خاص پسند نہیں کرتیں۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے اور ظاہر ہے' وہ مجھے پسند کریں گی بھی کیوں؟ میں ان ہی سے تو جائیداد کا مطالبہ کررہی ہوں اور قاتل کے خلاف ثبوت کا بھی۔" ماوی نے کہا۔

"جائیداد میں سے حصہ تو خیر! وہ تمہیں دیں گی' لیکن قاتل کے خلاف ثبوت... معاف کرنا! تمہارا شک بے بنیاد ہے' کیونکہ اس حویلی میں کوئی تمہارے بابا کا قاتل نہیں ہے۔" جلال کا لہجہ پریقین تھا۔ ماوی کو اس کا یقین توڑنا اچھا نہیں لگا۔

"تم جاؤ جلال! کسی کو پتا چلا کہ تم اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو تو نہ جانے کیا سوچے۔"

"ہوں۔" جلال مایوسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارے پاس میرا سیل نمبر ہے نا' کسی چیز کی ضرورت ہو تو کال کردینا۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر اہم موقع پر تمہارے ساتھ رہوں۔" جلال نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"دروازہ بند کرلو' پھر میں جاتا ہوں۔" جلال نے دروازے کے باہر رک کر کہا۔

راہداری کے دوسری سمت سے آتا شبیہہ العباس' جلال کو ماوی کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر سرعت سے ستون کی اوٹ میں ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن الجھن سمٹ آئی۔

"آخر یہ لڑکی کون سا کھیل کھیل رہی ہے؟" شبیہہ نے سوچا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

روشنی کے جگنو

آسیہ رزاقی

پتا نہیں نانی نے اتنی عجلت کیوں کی۔
عجلت میں کیے گئے فیصلے ہمیشہ تو مفید اور صائب نہیں ہوتے۔ یہ محسن کا خیال تھا۔ اور وہ اس عاجلانہ فیصلے کے مفید یا صائب ہونے کا انتظار کرنے کے حق میں تھے۔ نانی سٹھیا تو گئی ہیں یقیناً" یادداشت بھی ان کی اب اتنی اچھی نہیں رہی۔ آزمانے میں حرج نہ تھا۔ آخر وہ عاقل و بالغ اعلا تعلیم یافتہ نہایت ذہین و فہیم تھے۔ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کے خواستگار تھے۔ (گو کہ ابھی تک سارے فیصلے نانی ہی کرتی آئی تھیں۔ انہیں، کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مگر نانی نے کبھی انہیں مایوس بھی نہیں کیا تھا۔ سوائے اس عجلت کی شادی کے۔)

نانی نے جلدی کیوں کی۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں چاہے نہ آتی ہو۔ لیکن دیکھنے والے نئی بہو میں سعادت مندی کے آثار پا چکے تھے' چند دنوں میں ہی اس نے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ رشتہ داری 'نسبتے' دار خواتین باریک بین نگاہوں سے جائزہ لیا کرتیں۔

"کس نفاست سے کھانا تیار کیا تھا۔ کس سلیقے سے پیش کیا۔"

"اتنا لذیذ سالن تو اب مشہور رکاب دار بھی نہیں پکا پاتے۔ اب تو شادیوں میں بھی ہلدی بھرا ہرا اندا قورمہ کھانے کو ملتا ہے۔ مگر نانی کی بہو کے پکائے سالن میں لذت اور مہک کا تناسب برابر کا تھا۔"

جہاں آرا خالہ ہر موقع پر تعریف کرتیں۔

"لے میں کہوں۔ لگتا ہے کسی باورچی کی بیٹی ہتھے لگ گئی ہے۔ زبان کے چٹخارے کے لیے تو مشہور ہیں زمانی خالہ۔"

پھوپھو رشیدہ طنز کا موقع نہ جانے دیتیں (ان کی دو' دو جوان بیٹیاں آنکھوں کے سامنے تھیں اور زمانی خالہ کو نظر نہ آئیں۔

رخ بانو کہتی ہے کہ اس کے سامنے دلہن نے پڑوسن کا سوٹ اس مہارت سے کاٹا ہے کہ وہ بھی دنگ رہ گئی۔ لے موئے ٹیلر ماسٹر ساڑھے تین گز کپڑے میں سوٹ کاٹنے پر تیار نہ تھے۔ کہتے تھے کپڑا کم ہے۔ مگر شنی کی دلہن نے پورا سوٹ کاٹ کر رکھ دیا۔

"ضرور کسی ٹیلر ماسٹر کی بیٹی ہے۔"

"بھئی اب تو زمانی خالہ کا گھر چم چم کرنے لگا ہے۔ کہاں بھٹکتی تھیں۔ اب دیکھو۔"

"سمجھ میں نہیں آتا یہ لڑکی اس چھوٹے سے شہر میں انہیں کہاں مل گئی۔" خواتین ذہن پر زور ڈال کر رہ جاتیں۔

"یہ نمونے تو اب چھوٹے شہروں' دیہاتوں میں ہی رہ گئے ہیں بس! ایمان کی بات ہے۔ زمانی کا تو بڑھاپا سوارت ہو گیا۔"

رائے عامہ بہو کے حق میں تھی۔ مگر زمانی بیگم سے رشک بھی شامل تھا۔

"کمبخت صورت شکل کی بھی بری نہیں۔" صفیہ بیگم رازداری سے بولیں۔

خود زمانی بیگم نے کسی کے سامنے اظہار خیال نہیں کیا۔ ان کے لیے تو بہت ہی خوش آئند بات تھی کہ ان کے عزیز ترین نواسے کی خانہ آبادی ہو گئی تھی۔ خود ان کی پسند اور مرضی کے مطابق۔ شادی بھی ایسی کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ ایسا چوکھا آیا کہ گھر چاندنی سے بھر گیا۔ ایسی چاندنی جو خاندان اور محلے بھر کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

شاید یہ شادی اتنی جلدی نہ بھی ہوتی۔ وہ کچھ انتظار کر ہی لیتیں۔ مگر ادھر سے جلدی کا تقاضا تھا۔ دراصل اکبری بیگم ان کی بچپن کی سہیلی تھیں۔ دونوں کے حالات کافی حد تک ایک جیسے تھے۔ یہ اگر نواسے کو پال رہی تھیں۔ تو وہ اپنی یتیم پوتی کی سرپرست تھیں۔

مگر زمانی بیگم جس طرح نواسے سے خوش تھیں اور اس پر بھرپور اعتماد کرتی تھیں۔ اکبری خانم اسی قدر پوتی سے نالاں اور بیزار۔

"فتنی آفت کی پرکالہ خوشنود۔"

یہ الفاظ کئی بار ان کی زبان سے ادا ہوتے۔ ان دنوں وہ کچھ اتنی ہی خفا اور بیزار تھیں کہ صاف صاف سہیلی کو بتا دیا کہ "اس کے اور بھی رشتے آئے ہیں۔ اگر تم نے دیر کی تو میں ادھر ہاں کر دوں گی۔ اب میں اس کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں رہی۔ اور زندگی کا کیا اعتبار۔"

زمانی بیگم نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ لاکھ اکبری خانم کا لہجہ مصنوعی تھا۔ مگر بیزاری جعلی نہ تھی۔ لڑکی زمانی بیگم کو از حد پسند تھی۔ اور پھر کم خرچ بالا نشیں کا محاورہ بھی اکسا رہا تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے بھتیجے عارف اور ان کی بیگم شکیلہ نے بھی انہیں ہموار کیا کہ اس سے اچھی لڑکی ملنی مشکل ہے۔ وہ کم سن ہے۔ سعادت مند ثابت ہو گی۔ کوئی پڑھی لکھی کھری لڑکی گھر میں آ گئی تو سب سے پہلے نانی بیگم کا پتا کاٹنے کی سعی کرے گی۔

یوں وہ رضامند ہو گئیں مگر۔۔۔ بتاوٹی ٹال مٹول کے بعد کوئی تیاری نہ ہونے کا عذر کیا۔ اکبری خانم بھی جان گئیں۔ حالات دونوں طرف ایک سے تھے۔

"تیاری تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ یتیم بچی ہے۔ جو بیاہے گا ثواب پائے گا۔ جہیز میرے پاس نہیں، زیور برتن بھی نہیں، خالی لڑکی ہے۔ مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اس لڑکی نے میرے بہت خرچے کروائے ہیں۔ روز تو برتن توڑتی ہے۔ کپڑے پھاڑ لاتی ہے۔ ہر روز اسے آئس کریم، فروٹ چاٹ چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے بڑے لاڈ سے پالا ہے۔ میرے بیٹے اسی کی وجہ سے مجھ سے خفا ہیں۔ مگر میں نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ مرے ہوئے بیٹے کی یادگار ہے۔ کلیجے سے لگا کر رکھا ہے اسے۔ سرفراز صاحب کے گھر والے پچھلے سال سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مگر بھیا اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ ان کا لڑکا عمر میں زیادہ ہے۔ ہیں امیر کبیر۔ سونے میں پیلی موتیوں میں سفید کر دیں گے۔ پر اس کی گزر وہاں نہ ہو گی۔ خیر عطا محمد کا بیٹا تو اس کے جوڑ کا ہے۔ بڑی آرزو ہے ان کی پھر قریب کے قریب اللہ کا دیا ان کے پاس بہت ہے۔ انہیں جہیز کا لالچ نہیں۔"

اکبری خانم ہر بار زمانی بیگم کو جتا دیتیں۔ دراصل لڑکی کو قریب کی سسرال دینا بھی پسند نہ تھا انہیں۔ زمانی بیگم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کر ڈالا۔ نواسے کو اپنی بیماری کا ٹیلی گرام دلوا کر بلا لیا۔ اپنی آخری آرزو کی بھیک مانگ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ سنی میاں نانی کے آگے دم نہ مار سکے۔

افراتفری میں کچھ میوہ، مصری۔ ایک سرخ رنگ کا جوڑا، معمولی زیور منگایا اور سادگی سے نکاح کر کے بہو گھر لے آئیں۔ بھتیجے عارف نے چھوٹی سی تقریب کر کے ان کو خوش کر دیا۔ لوگوں نے ان کے ہمدردانہ مخلصانہ رویے کی تعریف کی۔ بہت سی قدر افزائیاں اور تعریف و توصیف سمیٹتی نواسے اور بہو کے ہمراہ اپنے شہر روانہ ہوئیں۔ ان کے گھر پہنچتے ہی دو ڈھائی

گھنٹے کے اندر محلے ہی نہیں خاندان بھر میں یہ خبر بجلی کی سی سرعت سے پھیل گئی۔

"زمانی بیگم بہو لے آئی ہیں۔"

بہو بھی خاصا تماشا تھی۔ جسے دیکھنے کے لیے رات تک لوگ جوق در جوق آتے رہے۔

گھر میں گھستے ہی بہو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر گھر کے کونے کونے کا جائزہ لیا۔ معترض اور تیز نگاہ۔ پھر ناک چڑھا کر ہونٹ سکوڑ کر منہ بنا کر بولی۔ "یہ گھر ہے، اتنا گندا؟"

جب مہمان خواتین اسے دیکھنے کے لیے گھر میں آنے لگیں تو ساس کی ہدایت پر اس نے نکاح کا وہ اکلوتا جوڑا پھر سے بدن پر چڑھا لیا۔ جو تین دن تک برابر پہنے رہی تھی اور اب اس میں مزید سلوٹوں کے لیے جگہ بھی نہیں بچی تھی۔ مہمانوں کی پسندیدہ نظروں کا احساس کر کے وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ زمانی بیگم سب کو آناً "فاناً" نکاح کی وجوہات بتا رہی تھیں۔

"دولہا میاں کہاں ہیں؟"

"تھک گیا ہے سفر سے۔ سو رہا ہے۔"

"اسے خوش تو ہے؟"

"ہاں اللہ رکھے کیوں نہیں۔" مگر ان کا لہجہ جوش سے خالی تھا۔

خاندان کی خواتین کا رویہ مختلف تھا۔ ترچھی نگاہیں۔ معترض جملے۔ طنزیہ لہجہ۔

"دولہا کہاں ہیں۔ نظر نہیں آئے۔" زہریلا لہجہ۔ رشتے دار دیر میں آئے تھے۔ دولہا کہیں جا چکے تھے۔

"وہ ذرا دوستوں سے ملنے گیا ہے۔"

اور رشتے داروں کی موجودگی تک دولہا نے گھر میں قدم نہ دھرے۔ پتا نہیں وہ اس قدر شرمندہ کیوں تھا۔ شرمندہ تو دلہن کو ہونا چاہیے تھا جو میلے کچیلے کپڑوں میں رونمائی کے لیے بیٹھی تھی۔ دراصل گھر میں گھستے ہی اسے جس گندگی کا سامنا کرنا پڑا، وہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ خواب گاہ، جس میں اب اسے قیام کرنا تھا۔ کباڑ سے بھری تھی۔ دولہا میاں کے میلے کپڑے جگہ جگہ پودوں کی طرح اگے ہوئے تھے۔ پتلونوں کے گول گھیرے۔ الٹی قمیصوں کا انبار، موزوں کا ڈھیر۔ رومال جوتے۔ کنگھے۔ پالش کی ڈبیاں وغیرہ وغیرہ کوئی شبہ نہیں کہ ہر چیز وافر تھی۔ مع گرد و غبار کے اور اس کے سرتاج میلے بستر پر مزے سے استراحت فرما رہے تھے۔

اس نے ترچھی نظروں سے کمرے، اس کی بدحالی اور شوہر پر تاسف کا اظہار گردن ہلا کر کیا۔ پھر ایک ہی ہلے میں سارے میلے کپڑے سمیٹ کر صحن میں پھینک دیے اور جھاڑو اٹھا کر بے دردی سے کمرا جھاڑنے لگی۔ گرد اڑتی رہی۔ پالش کی ڈبیاں، برش، کریم کی شیشیاں جھاڑو کی نوک پر ادھر سے ادھر لڑھکتی رہیں۔ دولہا میاں کہنی میں چہرہ چھپائے چپ چاپ پڑے رہے۔

جھاڑ پونچھ کر میلے تولیے سے کمرے میں خوب اچھی طرح پونچھا مارا۔ دولہا میاں خراٹے لے رہے تھے اور محنت سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ تب ہی ساس نے باہر سے سرگوشی میں ہی اسے پکار کر محلے والیوں کی آمد کی خبر دی اور تاکید کی۔ "اپنا لال جوڑا پہن کر آ جا بچی۔"

دلہن نے اجنبی دولہا پر اچٹتی نظر ڈالی پھر پٹختی غسل خانے میں گھس گئی۔ اسی طرح گرد آلود جسم پر وہ میلا سلوٹوں بھرا لال جوڑا پہن کر ہاتھوں سے بال برابر کرتی منہ پھلائے باہر آ گئی اور چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر محلے سے ہی کھانا آ گیا۔ دونوں ساس بہو کھانا کھا رہی تھیں تب خاندان کی رشتے دار خواتین آئیں۔ منہ میں لقمہ بھرے وہ پھر سے نئی نویلی دلہن بن کر بیٹھ گئی۔

"بری میں کتنے جوڑے چڑھائے۔ اور جہیز کیا ملا؟" کے جواب میں زمانی بیگم نے نہایت وقار کے ساتھ جواب دیا۔

"جیسا اور جتنا لے کر گئی تھی۔ اس سے زیادہ اور بہتر مال لائی ہوں۔"

سب کے منہ بن گئے۔ مگر دلہن کو یہ جواب بہت

اچھا لگا۔ اسے ہنسی آگئی جسے اس نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کھی کھی کرکے ہنس دی۔

"ٹکی سی ہے۔" سرگوشی میں کہا گیا۔

"اپنے سنی میاں ہی کون سے عقل مند ہیں۔"

"جیسی روح۔ ویسے فرشتے۔" کسی نے نانی کی جانب اشارہ کیا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد۔ نانی کے لال جوڑا اتار کر رکھ دینے کی تاکید کو نظرانداز کرکے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ دولہا میاں کھانا کھا کر بستر پر لڑھک چکے تھے اور گٹھڑی بنے ایک کنارے پر پڑے تھے۔ وہ بھی لال جوڑا پہنے پہنے لیٹ گئی۔ تھکن سے چور۔ کوفت سے پُر۔ دادی کی یاد اور اپنے شہر' اپنے گھر میں گزارے ہوئے وہ شاہانہ روز و شب نیند ہی اڑا لے گئے۔

دادی کو بھلا کیا جلدی تھی اسے گھر سے نکالنے کی۔ اچھا بھلا تو وہ ان کی ہر بات مانتی تھی۔ ادھر ایک سال میں اس نے ان کے حکم پر سب کچھ سیکھ لیا تھا۔ کھانا پکانا۔ کپڑے سینا' گھر کی صفائی۔ کوئی نوکر تو تھا نہیں گھر میں۔ اپنی لاابالی اور ضدی فطرت کے باوجود اس نے اپنے کھیل بھی کم کردیے اور دادی کے لاڈ بھی کرنے لگی۔ بس کبھی کبھار غصہ آجاتا تھا۔ تو یہ ایسا جرم تو نہ تھا کہ وہ اسے خود سے جدا کرنے کی سزا دے ڈالتیں۔

اس اجنبی کے مقابلے میں تو دادی بہت ہی اچھی تھیں۔ چیختی چلاتی' خفا ہوتی گالیاں دیتی' کبھی تھپڑ کبھی چپل مارتی ہوئی ظالم دادی ...

مگر غنیمت تھیں۔ پورے چکر میں ان سے زیادہ کوئی ہمدرد نہ تھا۔ چچا پہلے ہی اس کی گستاخیوں سے اس سے خفا ہوگئے تھے۔ وہ چاہتے تھے دادی اسے اس کی ننھیال بھیج دیں اور خود ان کے پاس آجائیں۔ چچا فوج میں تھے۔ آئے دن ان کے تبادلے ہوا کرتے دادی کا کہنا تھا' میری ہڈیوں میں اتنا دم نہیں کہ ہر دو تین دن بعد خانہ بدوشوں کی طرح یہاں سے وہاں پھروں۔ دراصل انہیں پوتی سے محبت تھی۔ جسے قبول کرنے کے لیے ان کا بیٹا بہو راضی نہ تھے۔

ان کے اپنے چار بچے تھے جو اس بدتمیز لڑکی کی صحبت میں خراب ہو سکتے تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔ ماموں خالہ اسی شہر میں تھے۔ وہ بھی اسے اپنے پاس رکھنے پر تیار نہ تھے ماموں کے پاس "بیوی" کا بہانہ تھا۔ خالہ کے پاس "شوہر کا" دادی جیسی بھی تھیں۔ اس کی بہت فکر کرتی تھیں' اچھے سے اچھا کھلاتی تھیں۔ بہتر سے بہتر پہناتی تھیں۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتیں۔ پھر بھی لوگوں کے کہنے میں آکر وہ دادی سے لڑ پڑتی۔ انہیں اپنا دشمن کہتی۔

خالہ' ممانی سے مل کر آتی تو اس کی زبان پر ان ہی کے جملے ہوتے۔ جو وہ بے دھڑک دادی پر چست کرتی وہ خوب چلاتیں۔ دھموکے جڑتیں۔

"دشمن ہوں۔ ہاں ہاں دشمن۔ جا پھر اپنے دوستوں کے پاس جا۔ مر وہیں جا کر رشتے داروں کے پاس۔ میرے پاس کیوں آتی ہے۔"

کبھی وہ ان کے غصے میں کہے جملوں کی آڑ لے کر جانے لگتی تو وہ چیخ پڑتیں۔ "خبردار جو گھر سے قدم نکالا ٹانگیں توڑ دوں گی سنا۔"

"جاؤں گی۔ جاؤں گی۔" وہ بھی غصے میں آجاتی۔

"اچھا تو جا دفع ہو۔ مگر یہ کپڑے' یہ چپل اتار کر جا۔ میرے گھر کی کوئی چیز نہیں لے جا سکتی تو۔ ان ہی لوگوں کے دیے ہوئے کپڑے پہننا۔ اچھا۔"

وہ فوراً" دادی سے لپٹ جاتی۔ معافی مانگتی۔ اسے معلوم تھا خالہ زبیدہ یا مامی روشن لاکھ اسے بھڑکائیں۔ مگر اس کی ذمہ داری قبول کرنے میں ہچکچاتی تھیں جب وہ دادی کی بات انہیں بتاتی۔ وہ ٹھٹھا مار کر ہنستی ہوئی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتیں خالہ زبیدہ نے ایک دن کہا بھی۔

"اری اتار دیتی ان کے کپڑے۔ ایک دفعہ یہ بھی کرکے دیکھ۔"

پھر قہقہہ لگایا۔ مگر انہوں نے اسے کوئی کپڑوں کا جوڑا دیا نہیں کہ یہ پہن کر آجانا۔

دادی بہت برداشت والی تھیں۔ اس کی کتنی ہی بدتمیزی سہہ جاتی تھیں۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے دادی اس سے بہت خفا رہنے لگی تھیں۔ میٹرک کا آخری پرچا دے کر وہ گھر آئی تو اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ دادی اس کے لیے دودھ اور سیب لیے بیٹھی تھیں۔ پورا مہینہ انہوں نے اسے طاقت کی چیزیں کھلائی پلائی تھیں کہ بچی محنت کرتی ہے' دماغ میں قوت ہوگی تو پڑھے گی نا۔ مگر اس کا غصہ عروج پر تھا۔ اسی لیے اسے دادی کی محبت مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔

اس کے ساتھ زبیدہ خالہ کی بیٹی بھی امتحان دے رہی تھی۔ اس نے اسے دادی کے خلاف خوب بھڑکایا تھا اور کہا تھا کہ وہ صرف دکھاوا کرتی ہیں اور ننھیال سے دور رکھنے کے لیے محبت جتاتی ہیں۔ چونکہ امتحان کے بعد پکنک پر جانے کے لیے دادی نے منع کردیا تھا۔ اس لیے ایک سہیلی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خوشی کی دادی سگی نہیں سوتیلی ہیں۔ اسی لیے پابندیوں میں جکڑ کر رکھتی ہیں۔ جیسے وسیمہ کی سوتیلی نانی اسے ستاتی ہیں۔

باقی لڑکیوں نے بھی دادی کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ غصے میں تھی' دادی نے اسے دودھ پلانا چاہا تو اس نے غصے میں گلاس پر ہاتھ مار کر دودھ گرا دیا۔

وہ چیخنے لگی۔ "مت کرو یہ دکھاوا۔ یہ جھوٹی محبت ڈھونگ ہے۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئی۔ آج کون سا سبق پڑھ آئی ہے۔" دادی ہنس پڑیں۔

"مجھے پتا ہے یہ سب بناوٹ ہے۔ تم میری سگی دادی نہیں۔ سوتیلی دادی ہو۔"

"پاگل کہیں کی۔ کیا دیکھ لیا تو نے جو یہ نیا رشتہ جوڑ بیٹھی۔" دادی مسکراتی رہیں۔

"ایسے کہ۔

محبت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

وہ لہک کر شعر پڑھ رہی تھی۔

دادی ہکا بکا ہوگئیں۔ "آئیں؟ اب شعر و شاعری بھی شروع کردی۔" انہیں سخت غصہ آیا۔ ان کے خیال میں تو شعر کہنا گناہ تھا۔ وہ خوب بگڑیں۔ گالیاں دیں اور چپل اٹھا کر اسے ماردی۔ جو اس کی پیٹھ پر جا لگی۔ اس سے پہلے دادی کا نشانہ بہت خراب تھا۔ مگر آج بالکل درست ہوا۔ وہ پیٹھ کی جلن سے دیر تک روتی رہی۔ دونوں دادی پوتی کے درمیان سرد جنگ چھڑ گئی۔ اسی شام اتفاق سے زبانی بیگم آگئیں اور دادی نے نہایت خشک لہجے میں ان سے کہہ دیا۔

"بس بی۔ اب تم اپنی امانت لے ہی جاؤ۔"

یوں دو دن بعد اس کا نکاح کردیا گیا۔ وہ روئی چلائی۔ دادی کی خوشامدیں بھی کیں مگر انہوں نے اس کی طرف سے کان بند کرلیے۔ وہ پرانی یادوں میں گم تھی۔ کروٹ لی تو کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ تب ہی دولہا میاں کو بھی پتا چلا وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور اسے دھکا دے کر بولے۔

"چلو اٹھو۔ یہاں کہاں دھنس گئیں۔ میری نیند خراب نہ کرو۔"

وہ زمین پر جا گری۔ اول دن سے اس شخص کا یہی رویہ تھا۔ وہ بھنا کر اٹھی اور وہیں زمین پر جا لیٹی۔ کیا ہوا جو بستر نہ تھا۔ اس کے میلے بستر سے یہ زمین زیادہ صاف تھی اس نے رگڑ رگڑ کر چمکائی تھی اور مہربان بھی تھی۔ احتجاجاً" یونہی کہنی پر سر رکھ کر سو گئی۔

صبح کرتے کی آستین پھٹی دیکھ کر نانی سینہ پیٹ کر رہ گئیں۔ "ہائے نیا کرتا پھاڑ دیا۔"

"نیا؟" اسے نانی کی حیرانی پر ہنسی آگئی۔ "چار دن سے تو برابر پہن رہی ہوں بغیر دھوئے۔"

"چار دن۔ چار ہی دن نا۔ اے بٹی! نیا جوڑا مہینہ بھر تو چھٹتا نہیں۔"

"نیا جوڑا۔ جب بہت سے اور کپڑے ہوں نانی! تو سال بھر بھی چل جاتا ہے مگر جب زمین پر سونا پڑے تو۔ آپ کے ہاں کیا اور بستر بھی نہیں ہیں؟ میں کب تک

خالی زمین پر سووں۔"

دادی اتنے اچھے کپڑے بنالی تھیں اس کے۔ اس کا بستر بھی موہ تھا۔ مگر دادی نے مارے خفگی کے اسے دیا ہی کہیں۔ وہ ان سے اور بھی خفا ہو گئی۔ نانی اسے فکر مندی سے دیکھے جا رہی تھیں اس سے ان کے چہرے کی ویرانی دیکھی نہیں گئی۔ وہ وہاں سے ٹل گئی اور دل جمعی سے صحن کا کونا کونا صاف کرنے لگی۔ تب شنی میاں بیدار ہو کر صحن میں آئے اور عادتاً" نانی کے کہنے پر اس کے پاس آکر سرسری انداز میں ناشتا مانگا۔

وہ نہایت انہماک سے جھاڑو کی نوک سے مٹی کھرچتی رہی۔

شنی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ٹھوکا دے کر کہا۔ "سنا نہیں، ناشتا دو مجھے۔"

وہ بجلی کی سی تیزی سے کود کر دور ہٹ گئی۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "مت چھوؤ مجھے۔"

"ایں؟" شنی بوکھلا گئے۔ "اچھا اچھا، ناشتا تو دو مجھے۔"

"تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟ ہیں؟ ناشتا مانگو اپنی نانی سے میں نوکر نہیں ہوں۔"

شنی میاں کے چودہ طبق روشن ہو گئے، وہ پھر سے جھاڑو میں الجھ گئی۔ کچھ دیر بعد نانی بڑبڑاتی ہوئی آگئیں۔ خوشامد سے بولیں۔

"چل میری بچی۔ ذرا پراٹھا تو ڈال دے۔"

"خود ہی ڈالو۔" وہ اینٹھی رہی۔

"نا۔ نا یوں نہیں کہتے۔ اپنے میاں کی خدمت فرض ہے تجھ پر۔ بھلا اس گرمی میں میں کہاں چولہے میں گھسوں۔ کیسے پکاؤں۔"

"تو نہ پکاؤ۔" وہ بالٹی بھر کے لے آئی اور کونے کھدروں کو پانی سے صاف کرنے لگی۔

"اری بس ہو گیا صاف چل پراٹھا ڈال دے میری بچی۔"

نانی خوشامد پر اتر آئی تھیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں جا گھسی۔ منہ ہاتھ دھو کر جھٹ سے توا چولہے پر چڑھایا۔ پھر میلے کپڑوں پر نظر ڈال کر زور سے بولی۔

"کپڑے نہیں ہیں میرے پاس۔ ایسے ہی دھول مٹی میں اٹی پھرتی رہی تو محلے میں تم لوگوں کی دو کوڑی کی عزت نہیں رہے گی۔"

کھڑکی سے جھانک کر دیکھا نانی، نواسے کے ساتھ کانا پھوسی کر رہی تھیں۔ انداز خوشامد کا سا تھا۔ جب وہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ کنچے کھیل کر واپس آتی تو دادی کیسے چیختی چلاتی تھیں۔

"اری کیا حال کر لیا کپڑوں کا۔ صبح ہی بدلے تھے۔ اب کیا خاک۔ یہ لوٹ لگا کر آئی ہے۔"

"تو کیا گلی میں قالین بچھوا دیے ہیں تم نے؟" ترکی بہ ترکی جواب میں اس کا ثانی نہ تھا۔

"کمبخت کیوں جاتی ہے گلی میں؟"

"کنچے کھیلنے۔" جواب ڈھلا ڈھلایا موجود ہوتا۔

"موئے نامراد لونڈوں کے ساتھ کنچے کھیلے گی۔ باپ دادا کی عزت خاک میں ملانے کو۔"

دادی گالیاں نصیحتیں ساتھ ساتھ لیے باندھتیں "یہ جو کپڑے تو پہنے پھر رہی ہے انہیں دیکھ کر سب کہیں گے، دادی کپڑے تک نہیں بناتی۔ محلے میں دو کوڑی کی عزت نہیں رہ جائے گی خبردار! جو اب لونڈوں، لپاڑوں کے ساتھ گلی میں جا کر کھیلی منحوس بدذات۔"

"تو کیا انہیں گھر بلا لوں؟"

وہ خوش ہو کر کہتی پھر جو اسے گالیاں پڑتیں۔ منہ چھپا کر کھو کھو کر کے ہنسا کرتی۔ اسے کنچے کھیلنا پسند تھے۔ محلے کے تعلیم سے عاری لڑکے دن بھر کھیلا کرتے تھے۔ وہ تو پھر بھی اسکول سے آکر کھیلتی تھی۔ کمبخت شوکت بہت بدذات، کمینہ بے ایمان تھا۔ زبردستی اس سے کنچے چھین کر بھاگ جاتا تھا۔ دادی نے دیکھا تو پوتی کو خوب مار پڑی۔ اور اس کا گلی میں جانا بند ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

دن رو کے پھیکے گزر رہے تھے۔ اب نانی نے اس کو نیا بستر بھی بنا دیا تھا۔ دن بھر کے کام کے بعد وہ بڑی آسودگی کے ساتھ سوتی تھی۔ شنی کی وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی اب بھی وہی قائم تھی۔ کپڑے جہاں بدلے، وہیں میلے اتار کر پھینکے۔ ایک جوتا یہاں، دوسرا وہاں، موزے کہیں، رومال کہیں، روزانہ جھاڑو کی نوک سے انہیں پہلے صحن میں پھینکتی پھر دوپہر کو دھو ڈالتی۔ نانی محبت کرتی تھیں۔ وہاں دادی تھیں۔ یہاں نانی۔ اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

نانی جو کچھ بتاتیں، شنی سودا لا کر دے دیتے۔ کھانا پکانے میں اسے مہارت تھی۔ دادی کی مار کھا کھا کر اس نے سب کام سیکھ لیے تھے، دادی نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی اعتراض کرے کہ اسے کچھ نہیں سکھایا گیا۔ آسانی سے تو سیکھنے والی وہ نہ تھی۔

شادی طے ہونے کے بعد اس کی سہیلیوں نے بڑے سبز باغ دکھائے تھے کہ اسے شادی کے بعد جیسے کہیں کی حکومت مل جائے گی، تخت طاؤس اس کا نصیب ہو گا۔ وہ ملکہ بنی خوش نصیبی کے جھولے میں پینگیں لے گی، دولہا آگے پیچھے گھگھیاتا پھرے گا۔ جو وہ کہے گی، "آنا" "فانا" پورا کرے گا۔ ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی کپڑا زیور اس کے تن پر ہو گا۔ ہوٹلوں میں کھانا باغوں میں تفریح۔ نانی؟ اوہو نانی کا کیا ہے، پڑی رہیں گی وہ بھی کونے میں۔ وہ بھی خواب دیکھتی رہی، دل خوش کن۔ کم از کم دادی کے ڈنڈے سے نجات ہو گی۔ گالیوں سے بچے گی۔

یہ تو ضرور ہوا، مگر خواب بکھر گئے، نانی اپنے جھلنگے پر بیٹھی یا لیٹی مکھیاں اڑاتی رہتیں۔ گنگناتیں گاتیں، بہت خوش رہتی تھیں وہ۔ بہو جو ایسی لائی تھیں کہ پکا کر کھلاتی۔ دھو کر پہناتی۔ یہاں تک کہ انہیں نہلاتی بھی تھی وہی۔ البتہ جس پتھر میں جونک نہ لگ سکی، وہ تھے شنی میاں۔ کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھا بھی نہیں کہ وہ کیسی ہے (اسے یقین تھا کہ گھر

سے باہر کہیں نظر پڑ گئی تو وہ اسے پہچان بھی نہ پائیں گے) اس کا لال جوڑا پھٹ کر برابر ہو چکا۔ نیلا سوٹ بدرنگ ہو گیا۔

شادی سے پہلے جو بے شمار سوٹ اس کے تھے، وہ سب سہیلیاں اٹھا کر لے گئیں۔ وہ بھی چپ رہی کہ بعد میں اسے کپڑوں کی کمی نہیں ہو گی۔ کم بخت ماریاں سارے سوٹ لے گئیں۔ پرانے تک نہ چھوڑے، اب اسے اپنا ایک ایک سوٹ یاد آ رہا تھا۔

جب گھر خوب صاف ہو گیا۔ کہیں کوئی کباڑ نہ رہا تو اک پورا دن لگا کر اس نے کچن صاف کیا۔ مسالوں کے ٹین کے ڈبے پھینک کر ردی والے سے کباڑ کے بدلے شیشے کی بوتلیں خریدیں، ان بوتلوں، شیشیوں میں واپس مسالے بھر کر رکھے۔ پھر کھانا پکانے میں بھی مزا آیا۔ تھک گئی تھی۔ پھر بھی نئے کپڑوں کے لیے نانی سے جھگڑا کیا۔ شنی میاں سنتے رہے۔ بولے نہیں۔

"اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہے۔" یہ خیال ان کے ذہن میں ابھرا۔ چہرہ سپاٹ رہا۔

نانی نے اسے بلا کر ایک بنڈل سا اس کے حوالے کیا۔

"لے۔ اس میں کپڑے ہیں۔ پہن لے، شنی لایا ہے۔"

فخر سا تھا ان کے لہجے میں۔ بڑے تکلف سے اس نے بنڈل لیا۔ جی چاہا اٹھا کر پھینک دے، مجھے دیتے ہوئے کیا ہاتھ ٹوٹ جاتے، جل جاتے، نانی کو لا کر دیے ہیں، وہی پہن لیں۔ مگر کھول کر دیکھا تو وہ رنگ نانی کے پہننے کا نہ تھا۔ آتشی گلابی اور سبز ناپ بھی عین اسی کا۔

اپنے لائے ہوئے کپڑے پہنے دیکھنے کا بھی تکلف نہ کیا۔ نظر تک نہ ڈالی۔ موا باؤلا سا ہے۔

وہ افسوس کرتی رہی۔ آتے ہی کیسے کتابوں کو آنکھوں سے لگا لیتا ہے۔ جت جاتا ہے پڑھنے میں۔ یا مولا! اتنی موٹی موٹی کتابیں بھی پڑھ پڑھ کر تو دماغ نہیں چل گیا۔ اس دن پڑوسن کہہ رہی تھیں زیادہ پڑھنا بھی دماغ کی خرابی کا باعث ہوتا ہے، دن بھر دفتر میں دماغی کام۔ گھر آ کر پھر ان کتابوں میں مغز کھپانا دماغ تو خراب ہو گا ہی۔ نہ لباس کی فکر نہ کھانے پینے کا شوق۔ اس قدر محنت اور لگن سے وہ کھانا تیار کرتی۔ ایک لفظ تعریف کا سننے کو کان ترس جاتے۔

نانی گردن ہلا ہلا کر تعریفیں کرتیں۔ اس بندے کے چہرے پر پسندیدگی کا نشان نہ منہ پر تعریفی لفظ۔ کھاتے ہوئے بھی کتابوں کے جملے ذہن میں گونجا کرتے ہوں گے۔ اتنی اچھی، محنتی بے زبان و (خوب صورت؟) بیوی کسی اور کو ملتی، صحیح دماغ آدمی تو فخر سے سینہ پھلا لیتا۔ اپنی قسمت پر ناز کرتا۔ آگے پیچھے پھرا کرتا۔ مگر یہ تو نظر تک نہیں اٹھاتا۔ اچھا نہ سہی۔ کبھی تو اسے میں بھی نظر آؤں گی۔

☼ ☼ ☼

اس دن صبح سویرے رابعہ آ گئی۔ یہ شنی کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ صحن میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، پھر اسے دیکھ کر سلام کر کے بولی۔

"بھابی! شنی بھائی کہاں ہیں؟"

وہ اسے تنقیدی نظروں سے گھورنے لگی، پہچان تو لیا تھا۔

"شنی بھائی سے بہت ضروری کام تھا۔" اب رابعہ کا لہجہ محتاط سا تھا۔

"کیوں خیریت۔ ان سے کیا کام ہے۔ مجھے بتاؤ نا میں کر دوں گی۔"

"نہیں جی۔ وہ میرا ٹیسٹ ہے کل۔ ان سے مدد لینے آئی ہوں۔ صبح سویرے اسی لیے آ گئی کہ وہ آفس نہ چلے گئے ہوں۔"

"کیا مدد لینی ہے؟"

"بس جی پڑھنا ہے۔ ان سے سوال سمجھنا ہے، بہت اچھی طرح سمجھاتے ہیں وہ۔"

"سمجھاتے ہیں؟" اسے ہنسی آ گئی۔ "وہ کیا پڑھائیں گے" خود ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ باؤلے ہیں۔"

رابعہ سٹپٹا گئی۔ اسی وقت اندر سے شنی نے اسے پکار لیا۔ وہ کمرے میں چلی گئی، پتا نہیں دیر تک اندر کیا

ہوتا رہا۔ ناشتا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اندر سے رابعہ اور شنی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔

بالکل ہی مغز پھر گیا ہے۔ رابعہ نے اس کی بات جتائی ہو گی۔ بجائے بلا کر ڈانٹنے کے ہنس رہے ہیں۔

خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ بیوی کو ڈانٹتے نہیں، پھنکارتے نہیں، بعض مرد تو سنا ہے ایسے گرجتے ہیں برستے ہیں کہ کیا ساون کی گھٹائیں گھن گرج کر گرتی نکالتی ہوں گی۔ سنا ہے محلے بھر میں عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں۔ زبیدہ خالہ کا بیٹا کس قدر بیوی کو ڈانٹتا ہے، بے چاری بھابی روتی رہتی ہیں۔ اس کی حرکتیں بھابی کو پسند نہیں۔ گھر سے باہر رہنا۔ لڑکیوں کو گھورنا خیر۔ میرا والا تو بے چارا گم صم پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا رہتا ہے کتابیں ہی پڑھتا ہے۔ مین میخ نکالنا اسے آتا نہیں، پتا نہیں دفتر میں کیا گڑبڑ گھٹالا کرتا ہو گا۔"

"اوہو۔ آج آفس کو دیر ہو گئی۔" وہ پراٹھے کے بڑے بڑے لقمے نگلتے ہوئے بولا۔ "ذرا میرے کپڑے تو نکال دینا۔ جب تک میں ناشتا کروں۔"

وہ اسے ناشتا ٹھونستے دیکھ رہی تھی۔ تنک مزاجی سے بولی۔

"کیوں، میں کیوں؟ خود ہی نکال لو۔ تم کرتے ہو میرا کوئی کام؟" (اس لڑکی کو تہذیب سیکھنے میں دیر لگے گی۔)

وہ حیرانی سے اسے گھور رہا تھا۔ شاید پہلی بار دیکھا تھا تب ہی آنکھیں ایک جگہ منجمد سی ہو گئیں۔ خاصی خوش شکل ہے۔ اگر میٹھی زبان بھی ہوتی۔

"تمہارے کپڑے ہیں ہی کتنے جو۔"

"اچھا جی۔ یہ بھی میرا قصور ہے۔ چلو پھر کوئی اور ہی کام کر دیا کرو۔"

"کیوں، نوکر نہیں ہوں۔ شوہر ہوں تمہارا۔" شوہر غرانے لگا۔

"تو جناب! میں بھی کنیز نہیں ہوں، بیوی ہوں بیوی۔" ہاتھ نچا کر چنچنانے لگی۔ "جناب تو شاید مجھے لا کر بھول ہی گئے تھے۔"

وہ کہہ کر کمر لچکاتی بل کھاتی پیر پٹختی چلی گئی۔

"ہوں شوہر ہوں، شوہر باؤلا کہیں کا۔ اپنے مطلب کی بات خوب سمجھ میں آتی ہے اور پاگلوں کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنے مطلب کے ہوشیار ہوتے ہیں۔"

کمرے میں جا کر کپڑے نکال کر پلنگ پر ڈال کر بڑبڑاتی رہی۔

وہ سوچ میں گم ہو گیا۔ تو یہ لڑکی، جسے خاندان والے جاہل مطلق، جنگلی اور بے عقل کہتے ہیں۔ نہ جاہل ہے نہ بے عقل۔ حقوق کی پاس داری کر سکتی ہے۔ ذہن رکھتی ہے۔ تربیت کی کمی ہے۔ بس جب سے صائمہ نے سنا تھا رو رو کر برا حال کر لیا تھا کہ اتنے اعلا دماغ، پڑھے لکھے شخص کی شریک حیات، اس قدر جاہل گنوار، دیہاتی، عقل سے کوری۔ یہ نانی کو کیا سوجھی؟ گئیں بھتیجے سے ملنے اور شادی رچا ڈالی نواسے کی۔ یہ بھی بھلا انصاف ہے؟ ایک اعلا سرکاری عہدے دار مہذب آدمی کی بیوی بھونڈی، کم عقل، جاہل مطلق۔ بد تہذیب (محبت میں کروں۔ شادی اس فضول سی چھوکری سے ہو۔)

دفتر سے کبھی کبھار چچا کے گھر چلے جاتے تھے شنی میاں گپ شپ کے لیے۔ صائمہ، کرن، سونیا، افضل، انور سب کے ساتھ ملکی سیاست پر یا علمی قسم کی گفتگو کر کے ذہن کو پرسکون کر لیتے، ذہن میں اجالے سے پھیل جاتے۔

یہ پرانا معمول تھا۔ شادی کے بعد بھی جاری رہا۔ صائمہ ہمیشہ ان کے سامنے بیٹھی مسکرا مسکرا کر شاہانہ انداز میں باتیں کرتی اور یہ انداز اس پر سجتا بھی تھا۔ سونیا اور کرن اس کی خاطر میں چائے بناتیں گرمی ہوتی تو شربت لاتیں۔ یہ گھٹیا کام صائمہ کو پسند نہ تھے، وہ کہتی تھی یہ کام تو ہر نوکر کر سکتا ہے، پھر خود کو تھکانے سے فائدہ۔ البتہ سونیا اور کرن کو نمایاں ہونے کا شوق ہے اس لیے وہ ہر کام میں پیش پیش رہتی ہیں۔

"سونیا چائے اچھی بناتی ہے۔" شنی حوصلہ افزائی کے لیے کہتے۔

"اور کرن شربت خوب ٹھنڈا کر لیتی ہے۔"

سونیا مسکرا دیتی۔

"دراصل شنی بھائی! آپ کو احساس نہیں ہے کہ حرکت میں برکت ہے' جب دس سال بعد پھول کر کپا ہو جائیں گی۔ تب وقت ضائع ہونے کا اندازہ ہو گا انہیں۔ یہ جتنی اعلا سوسائٹی کی بھاری بھرکم خواتین ہیں۔ ان کے یہی پرابلمز ہیں۔ اب وہ ڈائٹنگ اور واکنگ کے چکر میں رہتی ہیں۔"

"یہ ان کی عمر کے مشغلے ہیں۔" صائمہ کہتی۔

"جی نہیں۔ یہ پچھتاوے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے حکم چلایا۔ ہل کر پانی نہ پیا وہی جو آپ کر رہی ہیں۔"

ایک روز شنی بہت تھکے ہوئے تھے۔ صائمہ اور چچی کے سوا سب گھر سے غائب تھے' بے تکلفی سے صائمہ سے فرمائش کر بیٹھے۔

"بہت تھکن ہو گئی آج۔ گرما گرم اچھی سی چائے تو بناؤ۔"

صائمہ آرام سے کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ "مسکرا کر بولی۔

"رمضو آجائے تو چائے بنا دے گا۔"

"بھئی آج تم ہی ذرا زحمت کر لو۔ سر میں درد ہے۔"

مگر صائمہ نے پروا نہ کی۔ چچی نے چڑ کر کہا۔

"ارے یہ کاہل زمانے بھر کی بھلا یہ ہلے گی؟ مرتے ہوئے کے منہ میں پانی نہ ٹپکائے۔ چائے بنانا کب آتا ہے اسے۔ جل ول جائے گی۔"

چچی چائے بنانے چلی گئیں۔ وہ اسی طرح دلکشی سے مسکراتی رہی۔ بے شک اس کی مسکراہٹ بہت حسین تھی۔ وہ بھی آگاہ تھی اس بات سے تب ہی تو مسکراہٹ کے مظاہرے کرتی تھی۔

صائمہ کے ایم اے میں داخلے کے لیے وہ کہاں کہاں نہیں گھوما۔ کس کس سے سفارش کروائی۔ مگر وقت گزر گیا تھا' اس لیے یونیورسٹی میں داخلے بند تھے اور کچھ اتنے اچھے نمبر بھی نہ تھے اس کے بارے شنی کو کوششیں کامیاب ہوئیں۔ وہ خوش خوش آیا۔ صائمہ کو پکارا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

"کیا ہوا۔ ہو گیا میرا کام؟"

"پہلے مزے دار چائے پلواؤ پھر بتاؤں گا۔"

"اونہہ۔ یقیناً" ناکامی ہوئی ہے۔ اتنا سا کام بھی نہیں ہو سکا آپ سے۔" وہ خفا ہو گئی۔

"اچھا چائے تو بناؤ۔ تمہارا ہی کام کر کے آیا ہوں۔"

"احسان نہ جتاؤ اچھا۔ رمضو بازار گیا ہے۔ آئے گا تو کہہ دوں گی۔"

برا دعوا تھا اسے شنی پر۔ چچا چچی کو بھی شنی سے بڑی امیدیں تھیں اور صائمہ کو پورا یقین تھا شنی اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر اس کی مسکراہٹ کا شیدا اور اداؤں کا رسیا ہے۔ اس نے اپنے مستقبل کے سارے خواب اس کے حوالے سے دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ شنی اسے پسند کرتا تھا۔ یہ تو اسے یقین تھا۔ مگر شنی نے خود کبھی اظہار کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ روز آمد اس کی تعلیمی سرگرمیوں پر اظہار رائے اس سے ہی ارادوں کا کچھ اظہار ہوتا تھا۔ مگر ہوا کیا؟

تائی اپنے بھتیجے سے ملاقات کے لیے گئیں۔ پھر ان کی علالت کا ٹیلی گرام آیا اور شنی بہت فکرمند سے تائی کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ پھر کئی دن ان کی خیر خبر نہ ملی اور جب ان کی آمد کی خبر آئی تو پتا چلا کہ وہ مع دلہن کے تشریف لائے ہیں۔ صائمہ پر جیسے بجلی سی گری۔ ناقابل یقین اطلاع۔ چچی کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کرن اور سونیا انور کے ساتھ جا کر دلہن دیکھ آئیں تب یقین آیا۔ صائمہ دو دن بستر سے نہیں اٹھ سکی۔ چچی نے کئی دن غم منایا۔ اچھا خاصا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہا یوں بھی صائمہ کو کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا اس لیے اس نے وقت گزاری کے لیے ایم اے کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

کئی دن بعد دنیا داری کا لحاظ۔ خاندانی روابط کی مجبوری چچی کو وہاں لے گئی' وہاں سے آکر کئی دن تو شنی کی قسمت پھوٹنے کا اس قدر درد انگیز لہجے میں ذکر کرتی رہیں کہ صائمہ رو رو کر بے حال ہو جاتی۔ ایک دن رابعہ نے یہ بتا کر کہ شنی بھائی کی بیوی انہیں پگلا

سمجھتی ہے۔ سب کو ہنسا دیا۔ سونیا بھابی کی تعریف کر رہی تھی۔ افضل' انور دو تین بار ان کے گھر جا چکے تھے۔ وہ بھابی کے اخلاق کے معترف تھے۔

"ان کا گھر دیکھا ہے' کیسی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ جہاں پہلے مکھیاں بھنکتی تھیں' اب چاندنی سی چٹکتی ہے۔"

انور تعریف سے باز نہ رہ سکا۔

"اور بھابی کے ہاتھ میں اتنا مزا ہے' اس دن شنی بھائی نے کھانا کھائے بغیر آنے نہیں دیا۔ میں نے تو صدیوں بعد ایسا لذیذ کھانا کھایا۔"

افضل نے چٹخارا لیا۔

"نوکر لوگ اسی طرح کر سکتے ہیں۔ کسی خانسامے کی اولاد ہو گی۔"

"نوکر تو ہمارے گھر بھی ہیں۔ مگر نہ اتنا عمدہ کھانا پکاتے ہیں۔ نہ ایسی صفائی ہی کرتے ہیں۔ ہر روز امی ان کے سر پر سوار ہو کر جھاڑ پونچھ کراتی ہیں۔ کچن میں بھی امی کو دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ۔"

"اونہہ' وہی تھرڈ کلاس ذہنیت۔ گھر اور کچن۔ انڈر اسٹینڈنگ بھی کچھ ہوتی ہے۔"

صائمہ نے بہن بھائیوں سے زیادہ خود کو تسلی دینا چاہی۔ یہ دنیا کسی کا چین نہیں دیکھ سکتی۔ صائمہ کا سکھ بھی سب کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا کہ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چلا آرہا ہے شنی کی دلہن کی تعریف لے کر۔ صائمہ کا غصہ اور ضد بڑھتی گئی (سمجھتی کیا ہے وہ جنگلی مُوش لڑکی نہ اس کو مزا چکھایا۔ پتا نہ کا تو صائمہ نام نہیں۔)

خاندان بھر میں اسی کا چرچا تھا اور جس کا چرچا تھا' اسے اپنی مصروفیت میں اور الجھنوں میں کسی تعریف کسی توصیف کی پروا نہ تھی اور جس سے کسی تعریف کی آرزو تھی۔ وہ بے چارا بد ھو۔ گردن جھکائے رہتا۔

☆ ☆ ☆

اس دن بازار میں چچی مل گئیں۔ ادھر چند دن سے شنی ان کے گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔ چچی نے دیکھ لیا تھا۔ آنکھ بچا کر نکل جانے کا موقع نہ ملا۔ سلام کر لیا۔ چچی بہت لٹک کر ملیں۔ میاں بیوی کو کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ ساتھ ہی اس کی قسمت پھوٹنے پر دبی زبان سے اظہار افسوس بھی کیا۔ تائی کو بھی شرماحضوری کہہ دیا۔ دراصل صائمہ شنی کے گھر جانے میں سبکی محسوس کر رہی تھی اور خوشنود عرف خوشی کو دیکھنے کی حسرت بھی تھی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ انہیں دعوت پر بلایا جائے۔

اس روز شنی گھر آکر دیر تک تائی کے ساتھ سرگوشیاں کرتا رہا۔ وہ مزے سے کھانا پکاتی رہی۔ پھر دھلے ہوئے کپڑے لے کر آئی اور تہہ کر کے رکھتی گئی۔ شنی کتاب کھولے پڑھنے میں منہمک تھا۔ نظریں تو کتاب پر اور ذہن چچی کی باتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جاہل کے ساتھ عمر کیسے کٹے گی۔ کیا ساری عمر اس کندہ ناتراش کے ساتھ بسر ہو سکے گی۔

چپ رہ کر دیکھا۔ گریز اور لاپروائی اختیار کی۔ کوئی اہمیت نہ دی' نظر انداز کیا کہ اسی طرح مایوس ہو کر آواز بلند کرے۔ ہمت ہار کر اپنے گھر کی راہ لے۔ احتجاج کرے۔ مگر بے حس سرد وجود۔ تربیت سے عاری۔

تائی نے کیا دیکھا؟

"دلہن اے دلہن! اے بٹی خوشی۔ ذرا سنو تو۔"

نواسے کی سوچ سے بے نیاز تائی اسے پکار رہی تھیں۔ وہ بغیر تہہ کیے کپڑے اس کے سامنے پٹخ کر بولی۔

"ذرا انہیں تہہ کرنا۔ میں تائی کی بات سن لوں۔"

پھینکے ہوئے کپڑے کتاب کو چھپا چکے تھے۔ اسی طرح اسی طرح عمر گزرے گی۔ کتابوں پر یونہی کپڑے گر کر حروف کو چھپاتے رہیں گے۔ اسی طرح علم کی توہین ہوا کرے گی۔ بے حس' جذبات سے ناآشنا' بے علم خاتون' اور کل ان کے ساتھ چچا کے گھر جانا ہے۔ ان کا وہ روشن خیال گھرانہ' تمیز تہذیب کا دلدادہ۔ صائمہ' کرن' سونیا ہنس مکھ اور ذہین صائمہ کس قدر مذاق اڑائے گی۔ پتا نہیں وہاں کون سی حرکت کر کے سب کو ہنسنے کا موقع دے۔ تائی سے کہا تو ہے' اچھی

طرح سمجھادیں۔

نانی اسے پٹی پڑھا رہی تھیں۔ "دیکھنا' کہیں مجھے بدنام نہ کرنا۔ خاموشی کے ساتھ بیٹھنا۔ الٹے سیدھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اور جواب؟"

"جواب دینے کی بھی خاص ضرورت نہیں۔ تمیز کے ساتھ' آہستہ سے نرم آواز میں بات کرنا۔ مجھ بڈھی کے سفید جونڈے میں کالک نہ لگوانا فضول بات کرکے۔"

"اتنی پاگل نہیں ہوں۔" وہ برا مان گئی۔

"اچھا سن۔ یہ کپڑے کل کے لیے ہیں۔ شنی لایا ہے چپل' چوڑی سب اس میں ہے۔ سب پہن کر جانا اچھی طرح۔"

"میرے لیے ہوتے تو مجھے دیتے۔ تمہیں دیے ہیں۔ تم ہی پہننا۔"

"اے نہیں بیٹی! سمجھا کر۔ بہت خیال کرتا ہے تیرا۔ ہاں لحاظ ہے اس کے مزاج میں اور ہاں ان کی بیٹیاں پڑھی لکھی ہیں۔ صائمہ کو تو نے نہیں دیکھا۔ بڑی تیز ہے۔ ایم اے کررہی ہے۔ اس سے سنبھل کر بات کرنا۔ ذرا سی بات کو گزوں اچھالتی ہے وہ۔"

نانی اسے کل کے محاذ کے لیے تیار کررہی تھیں۔ مورچہ مضبوط ہو تو جنگ کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ انہیں صائمہ سے خطرہ تھا۔ جو ٹیڑھی کھیر تھی۔ شنی کی شادی سے اسی کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ زخمی ناگن بنی پھنکار رہی ہوگی۔ عرصے سے وہ چچی اور شنی کے روابط استوار ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

شنی کا ان کے گھر دل لگتا۔ چچی کے محبت کے مظاہرے۔ صائمہ کا شنی پر ڈول۔ شنی کی شادی سے سب پر اوس سی پڑ گئی تھی۔ چچی تو اس قدر عاشق زار تھیں بھتیجے کی مگر اس کی دلہن کو دیکھنے' دو ہفتے بعد بمشکل مہلت نکال سکی تھیں۔ صائمہ تو آئی ہی نہیں۔ اس کے سارے منصوبے فیل ہوگئے ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

اگلے دن ان کی روانگی تک نانی کی نصیحتیں جاری رہیں۔ چچی کی ہدایت کے مطابق وہ شام کو ان کے گھر پہنچ گئے۔ گھر والوں نے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ سجے ہوئے صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ کچھ دیر بعد لاؤنج میں چائے پینے کے لیے بلایا۔ وہاں بھی ڈرائنگ روم کی طرح فرش پر قالین اور دیواروں پر خوب صورت تصویریں آویزاں تھیں۔

شنی کو کچھ اطمینان ہوا۔ اول یہ کہ صائمہ موجود نہ تھی۔ دوم کرن اور سونیا خوشی کے ساتھ گھل مل کر باتیں کررہی تھیں۔ اور اس کے اندیشوں کے خلاف خوشی آنکھیں پھاڑے ہر چیز کو گھور نہیں رہی تھی۔ بلکہ نہایت شائستگی اور اعتماد سے باتیں کررہی تھی۔

چائے کے دوران صائمہ آگئی۔ اچٹتی سی نظر خوشی پر ڈال کر وہ شنی کی طرف بڑھ گئی اور زور شور سے انگلش میں باتیں کرنے لگی۔ دراصل وہ شنی کے ساتھ کہیں جانا چاہتی تھی مگر خوشی پر ظاہر کیے بغیر۔ چائے ختم ہوتے ہی وہ بڑے حق اور فخر کے ساتھ دلیرانہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی کرن نے کہا بھی۔

"آپی ایسی کیا جلدی ہے۔ شنی بھائی کو چائے تو ڈھنگ سے پی لینے دو۔"

"تمہیں کیا۔ اتنے دن سے میرا کتنا حرج ہو رہا ہے۔ کتابیں کون لا کر دے گا مجھے؟ پھر پتا نہیں یہ حضرت کب ہاتھ لگیں۔" صائمہ نے کہا۔

"ارے بچی! زیادہ دیر نہ کرنا۔ شام ہونے کو ہے۔" چچی نے پکار کر کہا۔ پھر خوشی سے مخاطب ہوئیں۔

"یہ صائمہ ہے۔ بڑی ضدی ہے' جس بات کا ارادہ کرلے۔ اسے فوراً "پورا" کرتی ہے۔ شنی کا اس سے بڑا پیار ہے۔ بچپن کا ساتھ ہے نا۔ اس کی ہر چیز شنی ہی لاتا ہے۔ اسے کسی اور پر بھروسا ہی نہیں۔"

اسے صائمہ کی اس جرات پر حیرت تھی۔ پرائے آدمی پر اس قدر استحقاق اور وہ بھی تو ربڑ کی طرح کھنچتا ہوا چلا گیا۔

"بھائی! آپ کا سوٹ تو بہت پیارا ہے اور کس غضب کی میچنگ کی ہے آپ نے۔"

کرن بہن کی غلط حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے باتوں میں لگا رہی تھی۔

صائمہ موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھی ہواؤں میں پرواز کررہی تھی۔ بڑی مشکل سے موقع نکلا تھا۔ کتابوں کی خرید کا بہانہ تھا۔ وہ کونے میں کھڑی شکوے کرتی رہی۔

"اتنے دن سے کہاں تھے۔ آئے ہی نہیں۔"

"تم ہی آجاتیں۔" جواب شکوہ۔

"میں؟ وہ تمہاری نانی ہزار آنکھوں والی دیوی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی زہر اتر آتا ہے ان کی آنکھوں میں اور اب تو۔ خیر یہ بتاؤ' یہ پینڈو چھوکری کہاں سے ہاتھ لگی؟"

"نانی کی عزیز ہے۔" شنی کو اس کا انداز بیان اچھا نہیں لگا۔

"تمہیں بھی عزیز ہے؟" سوال کچھ تیکھا تھا۔ "یہ ہوا کیسے؟ تم نے احتجاج بھی نہیں کیا۔ یہ تو سوچو' اس جنگلی کبوتری کے ساتھ کیسے عمر گزرے گی۔ کہاں وہ کہاں تم۔ اس قدر اس قدر۔"

"کیا اس قدر؟ میں کوئی آٹھواں عجوبہ ہوں۔"

"تم نہیں وہ تمہاری خاتون خانہ البتہ آٹھواں نواں دسواں عجوبہ ہیں۔" صائمہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "سچ اس قدر ہنسی آرہی تھی انہیں دیکھ کر۔ ہنسی رک نہ سکی تو تمہیں گھسیٹ لائی۔ تم کیسے اس کے ساتھ رہتے ہو؟ ہنسی نہیں آتی اس کی حرکتوں پر۔ کیا ہونٹ بھینچے' آنکھیں میز پر گاڑے' دم سادھے بیٹھی تھی۔ گونگی تو نہیں اوخدا۔ کیا حیران کن نمونہ ہے۔"

شنی چپ رہا۔ بتا نہ سکا کہ 'زبان ایسی دھاردار ہے کہ۔ اور یہ خاموشی نانی کی ہدایت پر تھی۔ وہ مطمئن بھی تھا کہ خوشی نے کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی تھی۔ البتہ صائمہ۔ جو کتابوں کی اس دکان پر کھڑی فضول باتیں کررہی تھی۔ وہ غیر ضروری اور نامعقول تھیں۔

"تم 'راضی کیوں ہوئے؟ ذرا سا احتجاج تک نہ کیا۔"

"نانی کی خواہش۔"

"نانی۔ نانی ارے مرد ہو۔ اپنی خواہش کا اظہار تو کرتے۔"

"نانی کے مجھ پر بہت احسان ہیں صائمہ! میں ان کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی رد نہیں کرسکتا۔ میں مجبور ہوگیا۔ وہ نانی کی پسند ہے۔"

"واہ کیا خوب نانی کی پسند' میری زندگی۔ اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرڈالا۔ میرا قصور؟"

"تم ہم مطلب تم۔" وہ سمجھا ہی نہیں۔

وہ اسے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ رقت طاری ہو گئی تھی۔ بولا ہی نہیں گیا۔ ایک بار پھر موٹر سائیکل کا سفر شروع ہوا۔ اس کی فرمائش پر پارک کا ایک گوشہ منتخب کیا۔ شنی اس کی باتوں پر متعجب تھا اور وہ آگ سے بھرا ہوا تندور تھی۔ "اب تم کو بتا رہی ہوں۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ تم اس۔ اس جنگلی سے چھٹکارا حاصل کرلو۔ اس کے ساتھ رہنا خودکشی ہے' میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔ یہ۔ یہ لڑکی ہر جگہ تمہیں شرمندہ کرے گی۔ کسی کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کرسکو گے تم۔ اپنی شاندار حیثیت کو داؤ پر نہ لگاؤ۔ اس سے پہلے اس سے پہلے کہ وہ ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جائے۔ اور تم اسی جیسے چیاؤں میاؤں جنگلی بچوں میں پھنس جاؤ۔ اسے' اسے بھیج دو۔ پلیز اسے واپس بھیج دو۔ وہ اپنا راستہ خود ہی بنالے گی۔"

صائمہ کا سانس پھول گیا تھا۔ جذبات کے اظہار نے ہوش گم کردیے۔ وہ اپنی ہی کہے جارہی تھی۔ شنی حیرت اور دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میری نانی کا فیصلہ ہے صائمہ اور اگر وہ کہیں گی تو میں اسے بھیج دوں گا۔ ویسے تو یہ ناممکن ہے۔ میں نانی کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔"

"نانی' نانی' نانی آخر کیا ہیں وہ۔ تم پر اس قدر حاوی کیوں ہیں۔" وہ چیخ پڑی' پھر شنی کے چہرے کے تاثرات نے بتا دیا کہ وہ نانی کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا۔

"ہم دشمن تو نہیں ہیں تمہارے۔" وہ قدرے نرم

لہجے میں بولی۔ "ابا کو پھوپھو کو اس قدر صدمہ ہوا ہے کہ حد نہیں۔ امی تو دو دن روتی رہیں کہ ایسی بے جوڑ شادی خاندان میں کبھی نہیں ہوئی۔ تمہاری پوزیشن کس قدر خراب ہو گئی ہے۔ نہ تم ترقی کر سکو گے نہ آگے بڑھ سکو گے۔ جاہلانہ نظام زندگی تم سے ہر حوصلہ چھین لے گا۔ ہر ترقی کے زینے پر جنگلی جاہل لڑکی تمہاری رکاوٹ بنے گی۔ وہ تمہارے ساتھ قدم بہ قدم چل ہی نہیں سکتی۔ اپنی اوقات۔ خیر اب سوچو کہ کیا ہو گا۔ میں کیا کروں۔" وہ بے بسی سے ہاتھ مسلنے لگی۔

"تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔" شنی نے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

"میری تعلیم کی فکر ہے اپنا خیال نہیں، تمہیں کیا اعلا تعلیم یافتہ لڑکی نہ ملتی تمہیں اپنے مستقبل سے کیا دشمنی ہے سوچا ہے؟ جیسی تمہاری بیوی ہے' جاہل اور اجڈ ویسی ہی اس کی سوچ ہو گی۔ ویسے ہی بچے ہوں گے۔ پرورش اور تربیت بھی دقیانوسی اور نچلے طبقے جیسے ہو گی۔ پوری نسل کا نقصان ہو گا پوری نسل کا۔ اپنا نقصان خود ہی اپنے ہاتھوں نہ کرو۔ ابھی وقت ہے۔"

شنی پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ دراصل اس کا ذہن خوشی کی سمت پرواز کر رہا تھا۔ جانے وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔

صائمہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھنے لگی۔ "مجھے تو بتاؤ' میں اب کیا کروں میں نے تمہارے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے۔ کیا کیا منصوبے بنائے تھے تمہارے ساتھ سفر کے۔ عمر گزارنے کے۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی (شنی پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ اب آنسو ہی آخری ہتھیار تھے) "بس تم اسے طلاق دو اور اپنا پیچھا چھڑا لو۔ اس کا کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اپنے جیسا دوسرا ڈھونڈ لے گی وہ۔"

"صائمہ!" شنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں شنی! میں تمہارے سوا کسی اور کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ میں نے تو تم ہی کو اپنا جیون ساتھی مانا تھا۔ تم کہو گے تو میں ایم اے کرنے کا خیال چھوڑ دوں گی۔ ہماری ایک ذہنیت ہے۔ ایک لیول ایک ہی کلاس ہے' ہم بہت خوش رہیں گے۔ میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گی۔ تم اس سے چھٹکارا حاصل کرو۔ میں تمہیں بہت سی خوشیاں دوں گی۔ ہم مرتبہ دو انسانوں کی طرح بغیر کسی فرق کے اچھی طرح گزارا کریں گے ہم۔"

وہ اب سمجھانے لگی تھی۔ شنی اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوا۔ اسے صائمہ کی یہ باتیں بے حیائی کی باتیں لگ رہی تھیں مگر وہ کہہ نہ سکا۔

"سوچو' سوچو اور فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔"

اسے سوچ میں گم دیکھ کر وہ بہت مسرور تھی۔ تیر نشانے پر لگا تھا شاید' اسے پوری امید تھی شنی پر آنسوؤں کا بھی اثر ہوا ہو گا۔ مگر آکر وہ سب کی نظر بچا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شنی ڈرائنگ روم میں کھڑا ہو گیا۔ ہر سمت خوب صورت تصاویر' رنگین میزیں' حسین گل دان' شاید وہ کبھی یوں گھر کو نہ سجا سکے۔ کنویں کے مینڈک کی طرح صحن دھو کر' دیواریں جھاڑ پونچھ کر اور کچن میں وقت گزار کر ہی عمر گزار دے۔ کبھی اس کی ذہنی سطح کو نہ چھو سکے گی۔

صائمہ خوش تھی۔ اس نے شنی کو گرما دیا تھا۔ خاصا تپا دیا تھا۔ اب اسے وہ اجڈ گنوار بیوی چڑیل لگے گی۔ اس کی ہر حرکت' ہر عمل ناپسندیدہ ہو گا پھر۔

شنی کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ نانی کی جلد بازی کب اسے پسند آئی تھی۔ پھر یہ میٹرک کی طالبہ' کم سن اور تیز طرار سی۔ بات کرنے کی بھی تمیز نہ تھی اسے' وہ شروع میں خاصا بیزار رہا' بے اعتنائی برتتا رہا۔ مگر اسے احساس نہ ہوا۔ پھر اسے لگا کہ وہ شنی پر ترس کھاتی ہے۔

"ہائے بے چارہ ابھی تک پڑھ رہا ہے' گھنٹہ بھر سے بھوکا ہو گا۔" وہ اس کے آگے گرم پکوڑے رکھ دیتی۔ بلاشبہ وہ تیز دست تھی۔ گھر سنوارنے کا شوق رکھتی تھی۔ اگر اسے اچھی تربیت مل جاتی۔

نانی نے بتایا تھا کہ پچھلے سال تو وہ گلی میں لڑکوں سے

کھیلتی تھی۔ اسے کوئی ہرا نہ سکا تھا اور وہ اپنی جیت پر فخر کرتی تھی۔ مگر شاید اب زندگی کے اس کھیل میں وہ کبھی فخر نہ کر سکے۔ وہ ناتجربہ کار، کمسن، سیدھی سی لڑکی۔ شاید کبھی نہ جیت سکے (یا شاید میں تمہیں ہار جاؤں۔ تمہارے اس فضول سے فخر سمیت)

مدھم باتوں کی آواز ڈرائنگ روم میں سنائی دے رہی تھی۔ چچی خوشی کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔

وہ لاؤنج میں داخل ہونے والا تھا کہ رک گیا۔ چچی کی آواز آرہی تھی۔ بے ارادہ ہی سننے لگا کہ آخر خوشی کے ساتھ کس قسم کی گفتگو ہو سکتی ہے۔

"ارے رشتے دار تو ہم بھی ہیں۔ مگر نانی نے اس پر قبضہ رکھا ہوا ہے۔ اب یہ دیکھو کہ پہلے تو انہوں نے خود ہی صائمہ کا رشتہ مانگا۔ ٹھیک ہے، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، شنی تو بہت ہی متاثر ہے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ کیوں؟ "ارے کہاں میری صائمہ اور کہاں ان کا مرغی کا ڈربہ جیسا گھر۔ یہ گھر دیکھ رہی ہو۔ یہاں چار نوکر ہیں۔ صائمہ تو ہل کر پانی نہیں پیتی۔ اس کے تو کپڑے ڈرائی کلین ہوتے ہیں، پھر اس نے کچن کا منہ تک بھی نہیں دیکھا۔ انصاف سے کہنا بھلا وہ گھر اس قابل ہے کہ کوئی تعلیم یافتہ اعلا خاندان کی لڑکی وہاں رہ سکے؟ میری صائمہ کو شہزادہ بیاہنے آئے گا۔ ٹٹ پونجیے رشتوں سے تو نہیں کر سکتی۔ ہاں خالہ زمانی نے تو نواسے کی مرضی دیکھ کر اسے اپنی مٹھی میں رکھنے کو صائمہ کا رشتہ دیا تھا۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ نوجوانی کی محبت کے رنگ کچے ہوتے ہیں، اس لیے میں نے رسی مضبوط پکڑ رکھی ہے، ہمارے معیار کے مطابق رشتہ آئے گا تو فوراً" کر دیں گے۔ چلو یہ بھی اپنا ہی بچہ ہے۔ مگر خالہ زمانی چاہتی تھیں، اسی گھر میں صائمہ جا کر رہے۔ تو بھئی یہ تو ہمیں منظور نہ تھا۔ اب وہ تمہیں بیاہ لائی ہیں۔ ان ہی کی جیسی ہو۔ ان کی مٹھی میں رہو گی۔ ورنہ خدا لگتی کہتی ہوں۔ جیسے کام تم کرتی ہو نوکر کرتے ہیں ہمارے ہاں۔ صائمہ تو وہ سب نہیں کر سکتی۔ خدا نہ کرے کہ۔"

چچی مسلسل بول رہی تھیں۔

"امی، امی! اب بس کریں گھنٹہ بھر سے ایک ہی لیکچر دیے جا رہی ہیں۔" کرن کی آواز آئی۔

"میں تو اس بے چاری کو بتا رہی ہوں۔ خالہ زمانی کی ـــــ چالاکیاں۔ بڑی تیز خاتون ہیں۔"

"مگر مجھ سے تو بہت محبت کرتی ہیں۔" خوشی کی آواز آئی۔

"ہاں تو یہ بھی چالاکی ہے۔ تمہارے ذریعے سے ہی نواسے کو قابو میں رکھیں گی کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لو بھلا کہاں صائمہ، کہاں شنی۔ کہاں ان کا وہ سڑا ہوا گھر۔ جتنی تنخواہ شنی میاں کی ہے۔ اتنے کے تو ہر مہینے پرفیومز خرید لیتی ہے صائمہ۔ آدمی کو رشتہ دینے سے پہلے اپنی اوقات ضرور دیکھ لینی چاہیے۔"

اب چچی کا غصہ عروج پر تھا۔ ان کی آواز میں تلخی تھی۔ شکست کی جھنجلاہٹ بھی تھی۔ برتری کا غرور بھی۔

شنی دم بخود کھڑا رہ گیا۔ یہ کیا سن رہا تھا وہ۔ بیٹی کے ارادے۔ ماں کے فیصلوں سے متصادم تھے، حیرت اور صدمے نے اسے نڈھال کر دیا۔ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹی نے اپنی بے باک اور بے حیائی کی باتوں سے انہیں چپ کر دیا تھا اور ماں نے تکبرانہ برتری سے پچھاڑ دیا۔ چچی اسے روکتی رہیں مگر وہ دیر ہونے اور نانی کے انتظار کا بہانہ کر کے جلدی سے باہر آگیا۔

گھر کے پاس آکر خوشی نے ایک لمبا سانس لیا۔ اندر آکر پھر سکون اور اطمینان کا سانس کھینچا۔ وہ چچی کی فضول باتوں سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ سونے کے لیے بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے بلند آواز میں کہا۔

"میں ایم اے ضرور کروں گی۔"

شنی کو اچانک ہنسی آگئی۔ جیسے لطیفہ سن لیا ہو۔ وہ برا مان گئی۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے۔"

"میٹرک تو کر لو۔"

"کر لیا ہے۔" وہ بگڑ گئی۔

"یہی کافی ہے۔"

"کیوں میٹرک کیے بغیر کوئی ایم اے کر سکتا ہے؟ کوئی مثال ہو تو بتاؤ۔"

"میں کب کہتا ہوں۔"

"پھر ہنسے کیوں ہو۔ آج میٹرک تو چھ سال میں ایم اے کر ہی لوں گی۔ ابھی سولہ سال کی ہوں۔ بائیس نہیں تو تیئیس سال کی تو ایم اے ہو جاؤں گی۔ وہ صائمہ تو چھبیس سال کی ہے۔ چچی نے خود بتایا تھا۔"

"صائمہ کی نقل کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نقل کیوں۔ یہ جو ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں، کیا سب کسی کی نقل میں ایم اے کرتے ہیں۔ بس میں ضرور کالج میں داخلہ لوں گی اور ایم اے کر کے بتا دوں گی کہ یہ کوئی کمال نہیں اور یہ کہ ڈگری کسی کو اعلا و ارفع نہیں بناتی نہ کسی کے دماغ میں غرور بھرتی ہے۔"

پتا نہیں وہاں اسے کیا کچھ سننے کو ملا تھا۔ جو کچھ شنی نے سنا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

"سنو جی۔" چند منٹ بعد اندھیرے میں اس کی آواز ابھری۔

"ہوں۔" وہ ابھی تک رنجیدہ تھا۔ چچی نے اسے بے حد حقیر سمجھا تھا۔ کسی قدر نفرت کا انداز تھا ان کا اور ان کی دروغ گوئی۔ وہ جانتا تھا۔ نانی نے کبھی بھی صائمہ کے لیے رشتہ نہیں دیا۔ یہ تو چچا چچی کی خواہش تھی جسے وہ ہر کسی کے سامنے ظاہر کر دیتے تھے۔

"تمہیں کیا چچا کا گھر بہت اچھا لگتا ہے؟"

"ہاں۔ پسند تو ہے۔"

"اپنا یہ گھر بھی برا تو نہیں ہے۔ اس گھر سے زیادہ وہ پسند ہے کیا؟"

نہیں ایسا نہ تھا۔ یہ گھر نانی کا تھا جو انہوں نے نواسے کو دے دیا تھا۔ اس گھر نے تو شنی کو انسان بنایا تھا۔ محبت اور تحفظ دیا تھا۔ اسے قدم قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ یہیں تو ملا تھا۔ یہیں نفرت بیزاری سے نجات ملی تھی۔ جب اس کے ماں باپ دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ چچا کے پاس آکر رہا۔ کس طرح چچا، چچی اس کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ اسے ادنیٰ نوکر کی طرح کھانے میں بچا کھچا اپنا جھوٹا دیتے۔ مار پیٹ تو روز کا معمول تھا۔ کیسے اس کی عزت نفس کو کچلا جاتا تھا۔

پھر نانی سب سے لڑ جھگڑ کر اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور کلیجے سے لگا کر پرورش کرنے لگیں، انہیں کس قدر دقتیں پیش آئی تھیں۔ اکیلی بیوہ عورت نے کس عزم و ہمت سے راتیں جاگ کر دن بیدار رہ کر اس کی تربیت میں گزارے وہ کسی بری لت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ بری صحبت میں نہ پڑ جائے۔ اس کے لیے کیسے قربانیاں دے کر پروان چڑھایا تھا انہوں نے۔ وہ جو ہمدردی کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ محبت سے بیزار تھا۔ بے غرضی اور ایثار اس کے لیے طعنہ تھا اور جب وہ پڑھ لکھ کر انسان بنا پھر کتنے ہی رشتے دار آگے پیچھے پھرنے لگے۔ اسے اپنا عزیز بتانے میں نہ شرماتے۔ شناسائی پر شرمسار نہ ہوتے اور جب بغیر کسی سفارش کے ایک معقول سروس مل گئی تو خاندان والے اس پر فخر کرتے اور چچا گلے لگانے میں، اپنا کہنے میں سب سے پہلے آگے بڑھے۔

صائمہ نے کہا کہ وہ بچپن سے ہی اس سے متاثر تھی۔ چچی نے بھی آج بتایا کہ بچپن سے ہی صائمہ اور وہ۔ نانی نے سب کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک کمسن، دیہاتی۔ ناتجربہ کار لڑکی کو پلے باندھ کر سب کے ہوش اڑا دیے۔ صائمہ کی وہ تقریر جو یک طرفہ جذبات کی حامل تھی اور اس وقت بھی اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

مگر اس کے بعد چچی کے خیالات جان کر تو اسے خاصا صدمہ پہنچا تھا اور ساتھ ہی اس جنگلی لڑکی کی خصوصیات بھی اجاگر ہوئیں۔ اس نے چچا کے گھر کی کوئی بات اسے نہیں بتائی۔ کچھ ظاہر نہیں کیا۔ اس میں آگے بڑھنے، جدوجہد کرنے کی لگن تھی۔ وہ قدم قدم ساتھ چلنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس نے شنی کو کہیں بھی مایوس نہیں کیا۔ کئی دن گزر گئے۔ وہ منتظر رہا کہ چچی کی رپورٹ کا کچھ حصہ نانی کی زبانی ہی سننے کو ملے۔ مگر اس معاملے میں خوشی کا سینہ اندھیرا غار تھا۔ جہاں سے کوئی راز باہر نہ آتا۔

☆ ☆ ☆

محض اتفاق تھا کہ وہ خط خوشی کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ بستر کی چادر بدل رہی تھی۔ تو شنی کے تکیے کے نیچے لفافہ نظر آیا۔ بے ارادہ ہی اس نے پڑھ لیا۔ یہ صائمہ کا خط تھا۔ اس کے دل کی آواز۔ اس شام کیے وعدے اور ارادوں کا اعادہ اور شنی کو فوراً" جواب دینے کی تاکید خط سے ظاہر ہوا کہ وہ دعوت والے دن کے بعد پھر اُن کے گھر نہیں گیا تھا اور اسی بات سے صائمہ پر گھبراہٹ طاری تھی۔ اس نے بڑی لجاجت سے جواب مانگا تھا۔ خط اس نے مٹھی میں دبا کر پھینک دیا۔ اف کس قدر بے غیرتی کی تحریر تھی۔ دوسری لڑکی کے شوہر پر اتنا حق، کیوں؟

وہ یہ طے نہ کر سکی کہ تحریر میں شنی کی آمادگی بھی شامل تھی یا نہیں۔ وہ بغور اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اب وہ آفس سے سیدھا گھر آتا ہے۔ گھر میں ہی مختلف کام کرتا رہتا ہے۔ کسی سوچ میں گم رہتا ہے۔ پہلے بھی رہتا تھا۔ مگر اب کتابوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ آخر صائمہ نے کسی امید پر ہی خط لکھا تھا۔ جب وہ صائمہ کو پسند کرتا تھا تو نانی نے اس کی شادی اس سے کیوں نہ کر دی؟

چچی کا بہانہ خاصا کمزور تھا۔ ہاں نانی کا عمل دخل ضرور نامنظور ہو گا۔ مگر فریقین کی رضامندی کے بعد یہ پہلو بھی کافی کمزور ثابت ہوتا۔ شنی مرد ہو کر بھی نانی کی رضا کیوں نہ حاصل کر سکا۔ محبت تو بے حد طاقت ور جذبہ ہے۔ ایک قوت ہے۔ بپھرا ہوا طوفان ہے جس کے آگے تناور درختوں کا اکھڑ جانا یقینی ہوتا ہے۔ پھر خوشی کو قربانی کا بکرا بنانے میں آخر مصلحت کیا تھی۔ وہ سوچتی رہی۔

نانی کی محبت؟ ان کی قربانیاں یا کوئی عہد؟ شاید پرانی محبت اب بھی زندہ ہو تب ہی اس روز دعوت کے بعد سے موڈ درست نہیں۔ مجھ سے شادی پچھتاوا بن گئی۔ وہ چمکتی دمکتی صائمہ سولہ سنگھار کیے۔ شوخ رنگوں کے لباس میں۔ بجلی کی طرح چمکتی ہوئی آئی اور کیسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لے گئی۔ اگر نانی کا حصار اتنا مضبوط نہ ہوتا تو چچی کب کا داماد بنا کر اپنے سجے بنے گھر میں لے گئی ہوتیں۔

چچی کے لہجے کی مصنوعی سختی پر اس نے یقین ہی نہیں کیا تھا۔

ویسے یہ بھی سچ ہے کہ ایک اعلا تعلیم یافتہ، مہذب افسر کے لیے اس کی ٹکر کی بیوی ہونی چاہیے۔ برابر کی نانی اماں نے کیسا ظلم کیا ہے۔ مجھے بھی ظالم بنا دیا۔ ایک کھلنڈری لاپروا سی لڑکی کو محبت کے درمیان دیوار بنا ڈالا۔ دونوں مجھے کوستے ہوں گے۔ چھٹکارا پانے کی تدبیریں کرتے ہوں گے۔ شاید کوئی تدبیر سوچ لی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں تو پسند ہی نہیں آئی۔ جب صائمہ جیسی بجلیاں نظر کے سامنے ہوں۔ تو نظر خیرہ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آج تک نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ جس سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ محبت کیسے ہو سکتی ہے، عمر کیسے گزاری جا سکتی ہے۔ مگر میں کیوں دکھ اٹھاؤں۔ ان کے درمیان کی دیوار کیوں بنوں۔ ہائے رے کم عقلی! پہلے کسی بات کی سمجھ ہی میں نہ آئی خود پر۔ اپنے سادہ حسن پر۔ طبیعت کی معصومیت پر۔ خدمات پر اتنا بھروسا تھا کہ کوئی برا خیال ذہن میں جگہ نہ پا سکا۔

شنی کی لاپروائی، بے اعتنائی کو اس کا لاابالی پن سمجھا۔ زیادہ فکر کی ہی نہیں۔ اسے فکر پالنے کی عادت تھی ہی نہیں۔ کئی دن سے وہ برابر سوچ میں گم تھی۔ بہت سی باتوں پر غور کرتی تو ہر بار ایک نقاب سا اترتا معلوم ہوتا۔ آگہی کی سرد لہریں دل کو جکڑ لیتیں۔ پُراسرار راز کے انکشاف پر دل برداشتہ ہو کر قسمت سے شکوہ کرتی۔

پھر خیال آتا شکوے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان کو اپنی تقدیر خود بنانی چاہیے نہ کہ دوسروں کی مدد کا انتظار ہو۔ اتنی محویت تھی کہ ان دنوں یہ بھی محسوس نہ کر سکی کہ شنی میاں کا زیادہ وقت گھر پر گزرنے لگا ہے۔ نانی کے ساتھ خوب دل لگا کر باتیں ہوتی ہیں۔ پچھلے واقعات، پرانے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ گھر کی سجاوٹ کا بھی اب انہیں خیال آتا تو کچھ سجاوٹ کی چیزیں لے آتے۔ لا کر کمرے میں رکھ دیتے۔ وہ دیکھتی تو فوراً" مناسب جگہ پر رکھ دیتی۔

اپنے کام سے فارغ ہو کر سوچا کرتی۔ یوں کیسے عمر بسر ہو گی۔ کبھی کبھی رقت طاری ہو جاتی تو آنسو بھی بہا لیتی۔ مگر گھر میں موجود لوگوں کو اس کے آنسو بھی نظر نہ آتے۔ ایسے میں دادی کی یاد آتی۔ ان کی شفقت و محبت کا اب احساس ہوا۔ وہ اس کے چہرے کے ہر رنگ سے واقف تھیں۔

"اداس کیوں ہے؟"

"روئی تھی کیا؟ کیوں؟"

"اری یہ رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟"

"چپ چپ کیوں ہے؟"

سوال یہ سوال کیے جاتیں۔

یہاں کس کو پروا تھی کہ اس کی اداسی کو محسوس کرتا۔ اسے تو بس مشینی انسان سمجھ رکھا تھا۔ کام کیے جاؤ جس کو محبت نہیں۔ پروا نہیں۔ اس کے گھر کو سنوارنا سجانا، اس کے لیے اپنی ہستی کو مٹا دینا بھلا کہاں کی عقل مندی ہے۔ جب مجھے کچھ حاصل نہیں ہونا تو اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالوں۔ ان بے حس، بے درد لوگوں کی خدمت کر کر کے فنا بھی ہو جاؤں تو کوئی تعریف نہیں کرے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ دادی کی گالیاں سنتے سنتے عمر گزر جائے۔

ایک فیصلہ کر کے کچھ مطمئن ہوئی۔ خوب گہری نیند آئی۔ پھر صبح اٹھ کر ارادہ ڈانواڈول ہو گیا۔ یہ گھر جسے اس نے دن رات سنوارا۔ یہ سادہ ماحول جس کی وہ عادی ہو گئی اور یہ پگلا سا انسان۔ اس کی بھی عادی ہو گئی۔ نہ سہی۔ محبت نہیں کرتا تو ہر کسی کو لازمی محبت تو نہیں ملا کرتی۔ نفرت بھی تو نہیں کرتا۔ کاش وہ نفرت سے دھتکارتا۔ تو اپنے فیصلے پر عمل کرنا کتنا آسان ہوتا۔ وہ کتنا بے ضرر ہے۔

میرے جانے سے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ کون اسے ناشتا بنا کر دے گا۔ کون اس کو کھانا کھلائے گا۔ کپڑے کون دھوئے گا۔ وہ صائمہ بیگم تو اس کی پروا نہیں کریں گی۔ پھر اس کی زندگی ویسی ہی ہو جائے گی۔ شادی سے پہلے کی طرح کہ یہاں میلے کپڑے۔ وہاں گرد و غبار اور گندا میلا بستر۔ اگر وہ صائمہ سے محبت کرتے ہیں۔ تو کیا ہوا۔ وہ ہے بھی تو محبت کے لائق۔ شفاف، چمکتی دمکتی۔ فر فر انگریزی میں باتیں کرتی۔ میں نے تو کبھی تمیز سے بات تک نہیں کی بے چارے کے ساتھ۔ مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ جوں ہی وہ آفس جانے کے لیے کوٹ پہننے کمرے میں آیا۔ بستر کی چادر درست کرتے ہوئے اس نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"میں دادی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

لہجہ سپاٹ تھا۔ وہ نظر نیچی کیے ہوئے تھی۔ شنی رک کر اس کے اگلے فقرے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چپ رہی تو بولا۔

"نانی سے پوچھ لو۔"

اسے غصہ بھی تھا۔ ابھی تو اس نے نانی سے چچی کی باتوں کا ذکر کر کے دریافت کیا تھا کہ وہ صائمہ جیسی بے حیا لڑکی سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں؟ نانی کے انکار پر اس نے ساری سنی ہوئی باتیں ان کے گوش گزار کی تھیں اور نانی نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ خوشی نے انہیں کچھ نہیں بتایا کہ وہاں کیا ہوا اور چچی نے مزید کیا کچھ سنایا تھا۔ شنی کو یہ بھی احساس تھا کہ چچی کے ہاں سے آنے کے بعد سے خوشی خوف چپ چپ رہنے لگی ہے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اس کی غلط فہمی رفع کرنے کی اشد ضرورت تھی۔

پھر وہ صائمہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اس پر وہ بے حد شرمندہ بھی تھا۔ خصوصاً" صائمہ کے تازہ ترین خط نے اسے صائمہ سے بیزار کر دیا تھا۔ اتنی بے حیائی شادی سے پہلے کر سکتی ہے تو شادی کے بعد تو۔ اسے کوئی روک بھی نہیں سکے گا۔

شنی عورت کے لیے شرم و حیا کی حد کا قائل تھا۔ وہ دقیانوسی نہ تھا۔ نہ ہی اپنے آپ میں سمٹی ہوئی لڑکیاں ہی اسے گوارا تھیں۔ جو سچ کو سچ نہ کہہ سکیں اور حق کے لیے آواز نہ اٹھا سکیں۔ لیکن لڑکیوں کا برتری کا غرور۔ خود کو کسی پر مسلط کرنے کا ارادہ۔ خود غرضی کے مظاہرے سے کم نہ تھا اور اسے خود غرضی سے چڑ تھی۔

ان دنوں وہ صائمہ اور خوشی کا مقابلہ بھی کرتا رہتا تھا۔ اسے اس تعلیم یافتہ ایڈوانس آزاد لڑکی کے مقابلے میں اس جنگلی جاہل لڑکی کا پروقار انداز لیے دیے رہنا۔ اپنے کام سے کام رکھنا مگر شنی کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ نانی کی خدمت اور گھر کے لیے فکر کرتے رہنا۔ اچھا لگنے لگا تھا۔

اس نے کبھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بے حیائی سے اپنے حق کے لیے خود کو اس پر مسلط نہیں کیا۔ جب ضرورت ہوئی تو احتجاج بھی کیا۔ اپنے زندہ رہنے کی ضرورت کو بھی جتایا۔ بلند ارادے۔ جدوجہد اور آگے رہنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ وہ اس شہری لڑکی صائمہ سے کسی حال میں کسی مقام پر پیچھے نہیں۔ بلکہ اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ اب سمجھ میں آگیا تھا۔

اور ابھی وہ نانی کو یہی بتا آیا تھا کہ ان کا فیصلہ ان کا انتخاب بہتر اور لاجواب ہے۔ صائمہ کے خط نے اس کی فطرت کو نمایاں کردیا تھا۔ وہ ایک بے قصور لڑکی کی زندگی کو تباہ کرنے میں ذرا سا عار محسوس نہیں کرتی۔ اتنی سنگ دل بے حس۔ مغرور لڑکی۔ اچھی بیوی اچھی ماں کیسے بن سکتی ہے۔

خوشی کے سوال پر اس نے روکھا سا جواب دیا تھا۔

"نانی سے پوچھ لو۔"

اور خوشی دم بخود سی بیٹھی رہ گئی۔ رسماً ہی رک جانے کا کہہ دیتے۔ اتنی بیزاری۔ بے تعلقی۔

یہی پوچھ لیتے کہ گھر کا کیا ہوگا۔ کھانا کون پکائے گا۔ نانی کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ نہیں کوئی سوال نہیں۔ ایک عام سے نوکر میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رکھا شنی نے۔

شاید صائمہ نے دل پر پورا قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں کیا ہوں۔ ایک بے مایہ۔ کمتر بے اہم ہستی۔ اچھا ہے وہ دونوں ہنسی خوشی رہیں مجھے بھی دیوار بننے کا شوق نہیں میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ رہیں گی۔

اس نے ایک عزم کے ساتھ پورے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ الماری کھول کر کپڑے ترتیب سے رکھے۔ شنی کے تمام میلے کپڑے دھو ڈالے۔ ان پر استری کر کے الماری میں رکھ دیا۔ پڑوسی لڑکے سے سودا منگا کر تین چار سالن پکا کر رکھے۔ کام ختم ہوگیا۔ تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"نانی! میں دادی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

نانی ابھی ابھی دوپہر کا کھانا کھا کر بہو کو دعاؤں سے نواز کر بیٹھی مسکرائے جا رہی تھیں۔ شنی نے انہیں خوشخبری سنانے کا کہا تھا۔ ان کے انتخاب کی داد دی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں۔

"ایں؟" خوشی کی بات پر حیران ہوگئیں۔

"جب سے آئی ہوں۔ ایک دفعہ بھی نہیں گئی۔ بہت یاد آرہی ہیں۔"

"اچھا۔" نانی کچھ تذبذب میں تھیں۔ پہلی بار اس نے کسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ "اچھا تو شنی کو آنے دو۔ اس سے کہہ کر۔"

"ان سے پوچھ لیا ہے۔ اجازت دے دی ہے انہوں نے۔ اب آپ بھی اجازت دے دیں نانی!"

شاید اس کا گلا خراب تھا۔ نانی کو آواز موٹی لگی۔ نزلے کی جیسی۔

"ہیں؟ اجازت دے دی اس نے۔ اچھا تو پھر کل چلی جانا بیٹی۔ وہ خود چھوڑ آئے گا۔"

"نہیں نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔ وہ خود چھوڑ آئے گا۔ اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہوگی۔ نہیں۔ اتنی تحقیر برداشت نہیں کر سکوں گی۔

"نہیں نانی! انہیں تکلیف ہوگی۔ تین چار گھنٹے کا تو راستہ ہے۔ بس اسٹاپ ہماری گلی کے سامنے ہے۔ کوئی اجنبی تو ہے نہیں۔"

نانی نواسے کی بے عقلی پر متاسف تھیں۔ آج ہی اعتراف کیا تھا خوشی کی صلاحیتوں کا۔ آج ہی اسے جانے کا کہہ دیا۔ عجیب سرپھرا لڑکا ہے۔

"نانی! میں نے تین چار طرح کے سالن پکا دیے ہیں۔ سب کپڑے دھو کر رکھ دیے ہیں۔"

"اچھا بیٹی!" نانی خوش ہوگئیں کہ تین چار دن کا ہی پروگرام ہے۔

پڑوسی لڑکا جبار رکشا لے آیا تھا۔ وہ ڈبڈباتی نظروں سے گھر کو دیکھتی ہوئی رکشا میں جا بیٹھی۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد جبار واپس آیا تو کچھ جھجکتا ہوا اندر نانی کے پاس چلا آیا۔ "نانی جی! چڑھا آیا ہوں بس میں۔"

"نانی! ایک بات کہوں۔" وہ کچھ جھجک کر بولا۔ لگتا ہے بھابھی کسی مجبوری سے گئی ہیں۔ نہ سامان۔ نہ کوئی تھیلا۔"

"اے ہے۔ دو تین دن کو گئی ہے۔ کیا بکس بھر کر ساتھ لے جاتی۔" نانی خوش فہمی میں مبتلا تھیں۔

"اچھا تو پرس تو ہوتا۔ نہیں تو پیسے تو ہوتے۔ رکشا کا کرایہ میں نے دیا اور۔"

نانی عینک درست کرنے لگ گئیں۔ لو اب رکشا کا کرایہ مانگے گا۔ آگیا احسان جتانے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور سامنے رکھ کر کہا۔

"لو سنبھال لو' بھابھی کے بندے ہیں۔ کانوں سے اتار کر مجھے دے دیے اور کہا کہ یہ نانی کو دے دینا۔ وہ تمہارا خرچ ادا کردیں گی۔ بس کا ٹکٹ بھی میں لایا تھا۔ ان کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ نانی جی! کوئی نیک بندہ تو میں بھی نہیں ہوں۔ چاہتا تو سونے کے یہ بندے ہضم کر جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ثبوت تھا نہ کوئی گواہ پر بھابھی بس میں بیٹھیں تو زار و قطار آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ جیسے کوئی بہت بڑا دکھ تھا انہیں جیسے وہ کبھی واپس نہ آئیں گی۔ انہیں روتا دیکھ کر مجھے بھی رونا آگیا۔ ان کے ساتھ دھوکا کیسے کرتا۔ جب بس چل پڑی تب بھی سر باہر نکالے برابر رو رہی تھیں وہ۔ نانی! بھائی جی سے کہنا۔ انہیں واپس لے آئیں۔ بڑی نیک ہیں وہ۔ پتا نہیں کیا دکھ تھا انہیں۔"

نانی سناٹے میں اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ کیا دکھ تھا اسے۔ نارسائی کا۔ بے اعتنائی کا۔ نظر انداز کیے جانے کا۔ کم مائیگی کا۔ اتنی کم ہمت تو نہ تھی وہ۔ کیا بالکل مایوس ہوگئی۔ مگر کیوں۔ شنی نے کوئی غلط بات تو نہیں کردی۔ کتنی قوت برداشت تھی اس میں۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟

☆ ☆ ☆

شنی گھر میں آیا تو گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔ نہ تو کچن سے بہو صاحبہ کے گنگنانے کی آواز ابھر رہی تھی نہ کمرے میں نانی کی کپکپاتی راگنی۔ دونوں میں خاصا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ "نانی آپ تو ساری لے ہی خراب کردیتی ہیں۔ یوں نہیں۔ ایسے گائیے۔" وہ سریلی آواز میں طرز درست کرتی۔ نانی کو اپنی بوڑھی تھرتھراتی آواز پر قابو نہ تھا۔ وہ کوشش کرتیں مگر طرز بگڑ جاتی۔

"وہ آپ کی چہکتی مینا خاموش کیوں ہے آج؟" بڑی خوش دلی سے پوچھا۔

"چلی گئی۔" نانی کو صبر کہاں تھا۔

"کہاں چلی گئی؟" بے یقینی کا انداز تھا۔

"اپنے گھر۔ دادی کے پاس۔"

"کیوں؟ آپ نے کیوں جانے دیا۔ میں آپ سے کہہ کر گیا تھا کہ نہیں۔ کس کے ساتھ گئی؟"

"اکیلی۔ تم نے بھی تو اجازت دی تھی اسے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے کہا تھا' نانی سے پوچھو۔ میرا خیال تھا آپ منع کردیں گی۔"

"بیٹا! پھر وہ کب تک انتظار کرتی۔ کس بھروسے پر یہاں کنیز بنی خدمت کیے جاتی۔ تم تو بات تک نہ کرتے تھے۔ ممکن ہے اس نے بھی صائمہ کا ذکر سن لیا ہو۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ وہ راستے کی دیوار تھی۔ خود بخود ہٹ گئی۔ اب اگر تمہیں اپنے سکون کے لیے کوئی فیشن ایبل پڑھی لکھی لڑکی ملتی ہے تو بیٹا! ضرور اپنا لو اسے۔ میں منع نہیں کروں گی۔ میں نے خود غرضی میں اس بچی کی زندگی خراب کردی۔ اپنی خدمت کے لیے' تمہارے آرام کے لیے اسے لائی تھی۔ جاؤ تم صائمہ سے شادی کرو۔ شادیانے بجاؤ۔ اس کا کانٹا تو نکل گیا خود بخود۔"

نانی پر رقت طاری ہوگئی۔

شنی نانی کو حیرت سے گھورتا رہا۔

یہ کوئی آسان نہ تھا۔ صائمہ' صائمہ کا زہر۔ آخر کار

ان کی زندگی کو بدمزا کرچکا تھا۔

"آپ نے اسے جانے کیوں دیا نانی! میرا انتظار تو کیا ہوتا۔ میں نے آپ سے چلتے وقت کہا تھا کہ نہیں کہ آج میں خوش خبری لے کر آؤں گا۔ آپ اسے روک لیتیں ایک دن کے لیے۔"

"وہ رکی نہیں بیٹا! میں سمجھی تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ اور اسے کوئی بات ایسی کہہ دی ہے۔ جو وہ برداشت نہ کر سکی۔ تمہاری بیزاری کی گواہ ہوں میں۔"

"نانی! وہ بیزاری نہیں تھی۔ آزمائش تھی اور متواتر پتھر پر پانی کی بوند گرتی رہے تو پتھر میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ میرا دل تو پتھر نہ تھا پھر۔"

گھر میں کہیں بھی اس کی غیر موجودگی کے آثار نہ تھے۔ کمرا صاف۔ آنگن دھلا ہوا۔ کپڑے دھلے استری کیے الماری میں تہہ بہ تہہ' باتھ روم میں ابھی تک اس کے وجود کی مہک موجود تھی۔ بکس میں اس کا زیور جوں کا توں۔ بلکہ سارے کپڑے بھی چھوڑ گئی تھی۔ شنی نے اپنا پرس ٹٹولا۔ اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ایک پیسہ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہ تھا۔ خالی ہاتھ چلی گئی تھی۔

سامان کے جائزے کے دوران بکس میں کونے میں پڑا مڑا تڑا لفافہ نظر آیا۔ جلدی سے اٹھایا۔ صائمہ کا خط۔ تو گویا یہ خط پڑھ کر محترمہ نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ غصہ' طیش اور بے بسی نے اسے آگ میں نہلا دیا۔

"یاد رکھنا نانی! اس کی اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ جا رہا ہوں۔"

انتہائی غضب ناک تھا۔ انگارے چبا رہا تھا۔ چیختا چلاتا چلا گیا۔ نانی نے تسبیح سنبھال لی۔ ایک نیا وظیفہ شروع کر دیا۔

"اے اللہ! میری بچی کو شنی کے غصے سے بچانا۔"

شنی کو کبھی غصہ آتا نہ تھا۔ آتا تھا تو پھر کسی چیز کی خبر نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

اپنا شہر' اپنا محلہ' اپنی گلی بس نے کتنی جلدی اسے واپس پہنچا دیا تھا اپنے شہر میں۔ اس کے شہر نے کس بے دردی اور بے وفائی کا رویہ اختیار کیا۔ ٹکنے ہی نہ دیا۔ ہرا کر چھوڑا۔ ضبط' صبر' برداشت' دادی کی سخت تربیت نے اسے کتنے ہی جوہر عطا کیے تھے۔ مگر اس شہر نے اس سے ساری توانائی چھین لی تھی۔ اس کی ہر صلاحیت کو زنگ آلود کر دیا اس شہر کے سخت بے مہر لوگ۔ وہ سارا راستہ روتی آئی تھی۔

دادی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ چپکے سے کمرے میں چلی گئی۔ دادی کے ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا اس کے پاس۔ آنسو۔ جو بے دریغ لٹا رہی تھی وہ۔ دادی کو اپنی بچپن کی سہیلی پر پورا بھروسا تھا۔ اگر بھروسا نہ تھا تو اپنی نادان' بے عقل پوتی پر۔

سوال شعلے "گھر آئی ہو گی ان کا کوئی بڑا نقصان۔ اری کیا انہوں نے خود ہی نکال دیا ہے تجھے؟"

جواب آنسو۔ (اپنا نقصان ہو سکتا ہے)

"بدبخت تو تھی ہی۔ کیا اب بدنامی کی کالک بھی لگوائے گی۔ کچھ تو بتا۔ کیوں نکلی اپنے گھر سے۔ ذبح کر دوں گی اگر کوئی ایسی ویسی بات سنی۔"

آگ بھری تھی ان کی آواز میں۔ بے آواز آنسو اس آگ کو بجھانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

"اچھا چل اٹھ۔ نہا لے۔ میں نے دو تین جوڑے سلوا کر رکھے ہیں تیرے لیے اور پھر کھانا گرم کر کے لا۔"

دادی مغرب کے بعد کھانا کھا لیتی تھیں۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔

مگر اس کی عادت تو نہ تھی نہ ہی بھوک تھی۔

"کوثر کے گھر چلی جانا۔ مگر جلدی آنا۔ ذرا دل بہل جائے گا۔"

کوثر اس کی کلاس فیلو تھی۔ وہ نہا کر کپڑے بدل کر اس کے گھر چلی گئی۔

واپس آئی تو دادی عشاء کی نماز میں مصروف تھیں۔ وہ بہت خوش تھی۔ کوثر نے بتایا تھا کہ اس نے معلوم کرایا ہے' دونوں کی میٹرک میں فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ ابھی رزلٹ آؤٹ نہیں ہوا تھا۔

کوثر نے بتایا تھا کہ وہ تو اپنے شہر کے کالج میں داخلہ لے لے گی۔ انٹری کرلے۔ ممکن ہے اگلے سال تک کوئی مہربان وزیر یہاں بھی ڈگری کالج کا آرڈر جاری کر دے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے وہاں سے آنے میں جلدی کی۔ اپنے مطلب کے لیے تو لوگ بہت کچھ سہ لیتے ہیں۔ میں وہاں کالج میں داخل ہو جاتی۔ ایم اے کرکے پھر جو فیصلہ دل و دماغ کرتا۔ ممکن ہے اس عرصے میں بہتری کی صورت ہی نکل آتی۔ اب تو ہر طرف کے راستے بند ہو گئے۔ صائمہ کے لیے سب راستے کھلے چھوڑ آئی تھی۔

صائمہ اس کی جگہ لے لے گی۔ یہ خیال ہی آنسوؤں کا سبب بن گیا۔ اپنی جلد بازی کا افسوس بھی تھا۔ اور کالج میں داخلے کے نقصان کا اندازہ بھی۔ پہلے یہ سوچا ہی نہیں۔ صائمہ کی نقل میں ہی اگر ایم اے کر لے تو کیا حرج ہے۔ تعلیم تو روشنی عطا کرتی ہے۔

کاش وہ لاعلم ہی رہتی۔ خط نہ پڑھتی۔ اسی گمان میں رہتی کہ شنی کی بے اعتنائی اس کے لاابالی پن کی وجہ سے ہے۔ مگر کب تک۔ کبھی نہ کبھی وہ ان کی روز کی ملاقاتیں رنگ لاتیں۔ ہم مزاج ہم مذاق اور رشتے دار۔ وہ کون تھی ان کی۔ کب تک راستہ روک سکتی تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ انہیں اپنا راستہ چننے کے لیے آزاد چھوڑ آئی۔

اپنی ناطاقتی کا احساس ہو گیا تھا۔ خود پر بھروسا بھی نہ رہا۔ ورنہ اپنی پوری ذات اور تمام ہستی کا زور لگا کر۔ غاصب کو شکست نہ دے دیتی اور اس غاصب کے تمغے سے پہلے اپنے حقوق کی جنگ لڑ کر محبت ہی نہ حاصل کر لیتی۔ وہ ہی اپنا نہ بنا تو دوسرے سے کیا شکوہ؟ وہ بھی کیا بے وقوف تھی۔ اپنے دل کے دروازے تو کھول دیے۔ مگر خود کسی دروازے میں داخل نہ ہو سکی۔ جسے پگلا۔ باؤلا سمجھتی رہی۔ وہ بڑا ذہین، بے حد سمجھ دار نکلا۔ نہ اسے ٹھکرایا نہ صائمہ کو۔ دونوں جانب سے سرخرو ہونا اسی طرح ہوتا ہے۔ اب ان کے راستے میں کوئی دیوار نہیں۔

"خوشی۔ اے خوشی! ذرا دیکھ تو بچی! دروازہ کون پیٹ رہا ہے کیا کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی ہے۔"

دادی جانے کب سے اسے پکار رہی تھیں۔ آئے گا کون؟ وہی پڑوسن خالہ ہوں گی۔ جو دادی کے پاس سویا کرتی تھیں۔ وہ سستی سے صحن میں آئی۔ دروازے کی کنڈی کھلتے ہی آنے والے نے کواڑ پاٹوں پاٹ کھول دیے وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔ طوفان آگیا تھا۔

دروازے کے عین درمیان میں وہ قہر و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ کواڑ بند کرکے کنڈی لگاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرح دل بھی لرز رہا تھا دادی کے بار بار پوچھنے پر بھی وہ نہ بتا سکی کہ کون آیا ہے۔ دادی خود ہی اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئیں۔ وہ کانٹوں بھرے لہجے اور شعلے برساتی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"کیوں آئی ہو تم؟"

دادی اسے پہچان کر خوف زدہ ہو گئیں۔ پوتی کی خوف ناک حد تک زرد پڑتی رنگت نے انہیں ہولا کے رکھ دیا۔

"کیا ہو گیا بیٹا شان! کچھ قصور؟"

"سلام دادی! کچھ ہوا نہیں۔ مگر اب ہو گا۔" وہ ہٹیلے لہجے میں بولا۔ "اس سے پوچھیے۔ یہ یہاں اکیلی کیوں آئی ہے۔ مجھ سے اجازت لیے بغیر۔ یہی پوچھنے کے لیے آیا ہوں میں۔"

اب بے حد سرد لہجہ تھا۔ لاتعلقی والا۔ گو کہ جواب طلبی کا مطلب لاتعلقی نہیں ہوتا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ سہارے کے لیے دیوار تھام لی۔

"کیا؟ تم سے اجازت لیے بغیر۔ ایں؟ بولتی کیوں نہیں مردار!"

دادی کو گالیاں دینے کا موقع مل گیا تھا۔ ہو گئیں شروع۔

"ارے کچھ لے کر تو نہیں آئی وہاں سے؟"

"ہاں۔ سب کچھ چرا کر لے آئی ہے۔" ضدی سا لہجہ۔

"کیا؟ کیا لے آئی؟ آئی تو خالی ہاتھ تھی۔"

دادی خاصی خوف زدہ تھیں۔ بڑھاپے میں اس فتنی کے باعث رسوائی کا داغ نہ لگ جائے۔ شریف گھر دیکھ کر ٹھکانا بنا دیا تھا۔ پتا نہیں کیا کرکے آئی ہے۔

"خالی ہاتھ کیوں دادی! میرا تو کچھ چھوڑا ہی نہیں اس نے۔"

وہ دھک سے رہ گئی۔ الزام۔ وہ شرم سے دوہری ہو گئی۔

"نہیں نہیں۔ میں نے کچھ نہیں لیا' وہاں سے دادی! تنکا بھی نہیں اٹھایا۔"

اب کیا ہو گا۔ اس الزام کا تو اس نے سوچا تک نہ تھا۔ وہ تو بے خوفی سے ڈٹا کھڑا تھا اپنے الزام کی تصدیق کے ساتھ۔

"نہیں۔ میں نے کچھ نہیں لیا۔ قسم کھا کر کہتی ہوں دادی! یہ جھوٹ ہے۔"

اب ہچکیوں کا دور شروع ہو گیا۔ ناطاقتی نے پیروں کا بوجھ دگنا کر دیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور اکڑوں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادی کوسنے لگیں۔

"مر جاتی تو اچھا تھا۔ وہیں دفن ہو جاتی تو میں شکر ادا کرتی۔ ارے بیٹا! کیا لائی ہے۔ بتاؤ تو۔"

"بتا رہا ہوں دادی! سب کچھ لے آئی' مجھے لوٹ کر بھاگ آئی۔ کچھ بھی نہیں رہا میرے پاس۔ سچ بالکل فقیر ہو گیا ہوں میں۔"

وہ بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

"ایمان سے۔ میں نے چوری نہیں کی۔" درد بھرے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے ہچکیوں کے ساتھ کہا۔

"جھوٹ۔ چوری نہیں کی؟ میرا دل چرا کر نہیں لائیں۔ میرا سکون چین۔ سب کچھ؟"

ڈپٹ کر کہا' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ اصرار کرتے ہوئے۔ ایک لمحے کو تو زمین آسمان گھوم کر رہ گئے۔ پھر سب کچھ ساکت ہو گیا۔ آنکھوں میں چمکتے ستارے بھی منجمد ہو گئے۔ شنی کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے چاندنی بکھر گئی ہو۔ عجیب سا جذبہ لو دے رہا تھا۔ لمحہ بھر کو وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

باؤلوں کی طرح اسے دیکھے گئی۔

"کیا؟ کیا؟ کیا؟" بڑبڑا کر رہ گئی۔

"میرا دل' میرا سکون' قرار۔ سب کچھ تو سمیٹ لائی ہو اور بھولی بنتی ہو کہ کیا کیا...؟"

دادی ہنس پڑیں۔ (کوئی شبہ نہیں کہ پوتی سے زیادہ سمجھ دار تھیں)

"اے ہے۔ ڈرامہ کر رہا ہے۔ آج کل کے بچے گھر میں بھی ڈرامے کرتے ہیں۔ میں تو ڈر گئی تھی۔"

سلیپر گھسیٹتی پٹر پٹر کرتی کمرے میں چلی گئیں۔ خوشی کو ہوش آگیا۔ شنی کی نظریں ابھی تک اس کی حیرت زدہ اور بے یقین آنکھوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"خوشی! میرا گھر' میرے دل کی طرح تمہارے بغیر بہت اداس ہے۔"

شنی کے لہجے میں محبت اور اپنائیت گھلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں تمنائیں رقصاں تھیں۔ خوشی پر شرم و حیا کا زوردار حملہ سا ہوا۔ وہ شنی کی بے باک نظروں کے تعاقب سے بچنے کے لیے اسے دھکا دے کر بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

خوشی! آج وہ شنی کی خوشی بن گئی تھی اور اپنی بھی۔ خوشیاں اس کے گرد خوشبو کی طرح لپٹ رہی تھیں۔ چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں روشنی کے جگنو اڑتے پھر رہے تھے۔

مکمل ناول

نمرہ احمد

جنت کے پتے

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں' حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جا رہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار فون پر رابطہ کر لیتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں' مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں میجر احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ وہ حیا کے بارے میں ہر بات جانتا ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان اپنی بیٹی ارم کو سر پر دوپٹا اوڑھنے کی سختی سے تاکید کرتے ہیں' جبکہ سلیمان صاحب قدرے آزاد خیال ہیں۔ سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے ترکی جا رہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کر کے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہو جاتی ہے۔

ایکسچینج کا فارم بھرنے کے بعد حیا اور خدیجہ ترکی کے لیے روانہ ہوتی ہیں، اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان بشیر ملتے ہیں۔ ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور رحمت انہیں ترکی میں ریسیو کرتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی مسز عبداللہ اپنے گھر دعوت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں مگر ہالے اس بیان کی تردید کردیتی ہے۔ ہالے حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سرد مزاجی سے حیا سے ملتا ہے جبکہ سبین پھپھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملتے ہیں، جس پہ جہان خفا ہوتا ہے۔

حیا تک سک سے تیار ہو کر اپنے ہاسٹل سے باہر نکلتی ہے تو جہان مل جاتا ہے۔ وہ گزشتہ دن کے برعکس کافی خوش اخلاقی سے ملتا ہے اور اسے کھانا کھلاتا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ بھی پاشا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔

ہاسٹل میں خدیجہ اور حیا کو رات کا کھانا خود پکانا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی میں ان کی ملاقات انجم نامی انڈین خاتون سے ملاقات ہوتی ہے ان کے شوہر جاوید پروفیسر ہیں۔ حیا اپنی پھپھو کے گھر ان سے ملنے جاتی ہے تو کسی کام سے اسٹور میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں ایک شخص آکر حیا کی گردن دبوچ لیتا ہے۔

وہ حیا کے پھوپھا تھے۔ جہان نے آکر اسے ان کی گرفت سے آزاد کرایا۔ وہ حیا پر خفا بھی ہوا کہ وہ اوپر کیوں آئی تھی۔ جہان نے حیا سے بات کرتے ہوئے ماضی کی یادوں کو دہرایا تب حیا کو پتا چلا کہ جہان کو اس کا اور اپنا نکاح یاد ہے۔ جہان نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ملک کا غدار ہے اور اسے اس پر شرمندگی ہے۔

ویلنٹائن کی رات حیا کو حسب معمول سفید پھول ملے تو اس کے دوست معتصم نے محسوس کیا کہ کاغذ کے کنارے پر لیموں کا رس لگا ہوا ہے۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچائی تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوا نظر آیا۔

حیا جہان سے ملنے گئی تو وہ ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ اس نے حیا کو نظرانداز کردیا۔ حیا ناراض ہو کر آگئی۔ جہان نے اسے منانے کے لیے ڈنر پر مدعو کیا۔

حیا گھر سے نکلی تو اسے ایک گاڑی لینے آئی۔ وہ اسے جہان کی گاڑی سمجھ کر بیٹھ گئی۔ ڈنر کے وقت ویٹر نے حیا کو سفید پھول اور گاڑی میں سفر کرنے پر شکریہ کا خط دیا تو اس پر جہان حیا سے ناراض ہوگیا۔ حیا غصے میں چلی آئی مگر اس کا موبائل وہیں رہ گیا۔ حیا نے ڈی جے سے موبائل کی واپسی کے لیے جہان کو فون کرایا تو اس نے جہان کے ساتھ مل کر جزیرہ بیوک ادا کی سیر کا پروگرام بنالیا۔

وہ تینوں وہاں گئے تو حیا کو ایک بنگلے پر "اے آر پاشا" لکھا نظر آیا۔

جزیرے سے واپسی کی شام کی آخری فیری جارہی تھی۔ جہان اور ڈی جے اس میں سوار ہوگئے تو اسی وقت ایک بچہ حیا کا پرس جھپٹ کر بھاگا۔ حیا اس کے پیچھے گئی تو وہ اے آر پاشا کے بنگلے میں داخل ہوگیا۔ حیا اندر گئی تو دروازہ مقفل ہوگیا اور کسی شخص نے اسے عقب سے خوش آمدید کہا۔

چوتھی قسط

"شہزادوں کے جزیرے پہ خوش آمدید۔" کسی نے بہت آہستہ سے اس کے عقب میں کہا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

لابی تاریک تھی۔ البتہ اندر کی سمت مڑتی راہداری کے آخری سرے پہ کوئی ٹمٹماتی سی زرد روشنی دکھائی دی تھی۔ وہ آواز بھی وہیں سے آئی تھی۔

اس نے پلٹ کر آخری بار دروازے کی ناب کو گھمایا۔ وہ جامد رہا۔ اب اسے اس محل سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ جو بے وقوفی وہ کر چکی تھی، اسے انجام تک پہنچانا ہی تھا۔

وہ آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں دیکھتی آگے بڑھی۔ تاریک راہداری کے اس پار کوئی بڑا سا کمرا تھا۔ شاید لونگ روم۔ گھپ اندھیرے میں وہ زرد سی موم بتیوں کی روشنیاں وہیں سے آرہی تھیں۔

"کون؟" اس نے چونکنے انداز میں پکارا۔ وہ لونگ روم کی چوکھٹ پہ آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کو خوش آمدید کہنے والی عورت وہیں سامنے ہی تھی۔ لمبے اسکرٹ اور سویٹر میں ملبوس اسکارف چہرے کے گرد لیے وہ جھریوں زدہ چہرے والی ایک معمر خاتون تھیں۔ وہ لونگ روم کے دوسرے سرے پہ کھڑی ہاتھ میں پکڑی موم بتی سے اسٹینڈ پہ رکھی موم بتیوں کو جلا رہی تھیں ایک ایک کر کے سرد پڑی موم بتیاں جلنے لگی تھیں۔

"آجاؤ، اندر آجاؤ۔" لمبی موم بتی سے اوپر نیچے لگی موم بتیاں جلاتے ہوئے انہوں نے اسی نرمی سے کہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی، بس بنا پلک جھپکے اس پُرتعیش لونگ روم کے وسط میں رکھی میز کو دیکھے گئی، جس پہ رکھا سنہری ستاروں والا کلچ موم بتیوں کی ہلکی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔

"یہ تمہارا پرس ہے، تم اسے لے سکتی ہو۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میرے پاس صرف میرے بلاوے پہ آجاؤ گی، تو میں اس بچے کو نہ بھیجتی۔ اسے معاف کردینا، اس کی مجبوری تھی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟"

وہ ہاتھ میں پکڑی موم بتی لیے اب سامنے رکھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں بھی۔ ایک بڑا سا کینڈل اسٹینڈ رکھا نظر آرہا تھا، جس کے اوپر جگہ جگہ موم بتیاں سیدھی کھڑی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے ان موم بتیوں کو بھی روشن کرنے لگیں۔

حیا کسی معمول کی طرح چلتے ہوئے آگے بڑھی اور بڑے صوفے کے کنارے کی نشست پہ جا ٹکی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک قریب رکھی میز پہ دھرے اپنے سنہری کلچ پہ تھیں۔

"کچھ کھاؤ گی؟"

اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ بہت ساری ہمت مجتمع کر کے وہ بمشکل کہہ پائی۔ "آپ نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟"

"مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اور پھر تمہیں کچھ بتانا ہے۔ عبدالرحمٰن آج صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلا گیا ہے مگر جاتے جاتے اس نے یہ کام میرے ذمے لگایا تھا۔" وہ اب اس کی جانب پشت کیے آخری موم بتی جلا رہی تھیں۔

وہ عبدالرحمٰن کے نام پہ حیران نہیں ہوئی۔ اس نے دوپہر میں ہی اس گھر کے باہر گیٹ پہ لگی تختی دیکھ لی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ بچہ اس گھر میں داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے چلی گئی۔ وہ صرف اپنے پرس کے لیے آئی تھی یا کسی معمے کے حل کے لیے؟ وہ کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قاصر تھی۔

"آپ کا عبدالرحمٰن پاشا سے کیا رشتہ ہے؟" وہ بولی تو اس کی آواز زرد روشنی کی مانند مدھم تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف زائل ہو رہا تھا۔

"میں عبدالرحمٰن کی ماں ہوں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی موم بتی میز پہ رکھی اور انگلی کی پوروں پہ لگی موم کھرچی، پھر پلٹ کر اس کی طرف آئیں۔

"عبدالرحمٰن نے تمہیں ملنے کا کہا تھا، لیکن جب تم نے انکار کیا تو بھلے وہ ہاتھوں اور دامن کا صاف نہ ہو، دل کا اتنا صاف ہے کہ وہ رکا نہیں۔ البتہ جاتے جاتے اس نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ میں تم سے مل لوں اور تمہیں ان سوالوں کے جواب دے دوں جو تمہارے ذہن میں کلبلاتے رہتے ہیں۔"

وہ دم سادھے خاموشی سے اس معمر عورت کو دیکھے گئی، جو ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان رکھی کارنر ٹیبل پہ ایک فوٹو فریم رکھا تھا۔ اس میں دو چہرے مسکرا رہے تھے۔ ایک وہی معمر خاتون اور دوسرا ان کے ساتھ ایک پینتیس، چھتیس برس کا مرد، جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے۔ آنکھوں پہ

موٹے فریم کا چشمہ تھا۔ چہرے پہ چھوٹی سی داڑھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلکتے تھے۔ نہایت گہری سانولی رنگت کا وہ شخص بہت ہی عام سا، قبول صورت مرد تھا۔

"اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں، تم اگر کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو پوچھ لو۔" حیا نے فوٹو فریم سے نگاہ ہٹا کر ان کو دیکھا، جو مسکراتی پر شفقت نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دروازہ بند ہو جانے پہ ڈر گئی تھی مگر اب اس ڈر کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"عبدالرحمٰن پاشا مجھے پھول کیوں بھیجتا ہے؟ سفید پھول، جو دشمنی کی علامت ہوتے ہیں۔" اس کے سوال پہ وہ ہولے سے مسکرائیں۔

"ہر شخص کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے، شاید وہ اس طرح پھول اس لیے بھیجتا ہے تاکہ تمہیں چونکائے، تمہاری توجہ حاصل کرے۔"

"مگر وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟" اس نے وہ الجھن سامنے رکھی، جو اس کو مسلسل پریشان کیے ہوئے تھی۔

"میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"دسمبر میں تم نے کسی چیریٹی ایونٹ میں شرکت کی تھی۔ وہ اسلام آباد میں اس وقت اسی فنکشن میں تھا۔ وہاں اس نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اسی رات پہلی دفعہ پھول بھیجے تھے۔"

ایک دم اس کی اس دو ڈھائی ماہ کی بے چینی کا اختتام ہو گیا۔ اسے "فوراً" سے یاد آگیا۔ جس رات اسے سبانجی کی طرف سے سلیکشن کی میل آئی تھی، اسی دوپہر اس نے وہ چیریٹی لنچ اٹینڈ کیا تھا، جو زارا کی کزن کی کسی اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں شہر کے کئی بزنس مین اور دیگر بااثر شخصیات نے شرکت کی تھی۔ وہ اور زارا بھی یونہی چل گئی تھیں، یقیناً "اسے عبدالرحمٰن پاشا نے وہیں دیکھا تھا۔ یہ ممکن تھا۔

"تمہیں وہ ڈولی نامی خواجہ سرا تو یاد ہوگا۔ اسے عبدالرحمٰن نے ہی تمہارے تعاقب پہ لگایا تھا۔ ڈولی اس کے آبائی گھر کا پرانا خادم ہے۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہے اور وہ صرف تمہاری مدد کے لیے تمہارے پیچھے آتا تھا۔ جہاں تک تعلق ہے اس میجر کا، جس کو تم نے اس کی ماں اور بہن کے سامنے بے عزت کیا تھا، ان کی مدد بھی عبدالرحمٰن نے تمہاری ویڈیو ہٹوانے کے لیے ہی لی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت عبدالرحمٰن اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ میجر کرنل گیلانی کا بیٹا ہے۔ کرنل گیلانی جانتی ہو کون ہے؟"

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"کرنل گیلانی وہ تھے جس کو تمہارے پھوپھا نے ملک چھوڑتے ہوئے اپنے کیے میں پھنسا دیا تھا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کرنل گیلانی نے کئی سال سزا کاٹی اور گو کہ وہ بعد میں رہا ہو گئے تھے۔ انہوں نے قید کی صعوبتوں میں لگنے والی بیماریوں کے ہاتھوں زندگی ہار دی۔ اس میجر کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے تمہیں صرف اپنے کسی ذاتی منصوبے کے لیے پھنسانا چاہا تھا مگر تم بے فکر رہو، وہ اب تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔"

تو یہ تھا سارا کھیل۔ ایک بااثر شخص کے اپنی محبت کو پالینے کے لیے استعمال کردہ کچھ مہروں کی کہانی۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" وہ ذرا سرد لہجے میں بولی۔

"تم یہ گھر دیکھ رہی ہو؟ بیوک ادا میں اس وقت بجلی کا کوئی پول مرمت کے باعث کام نہیں کر رہا، سو اس علاقے میں بجلی بند ہے، ورنہ تم دیکھتیں کہ جس گھر میں تم بیٹھی ہو، وہ بیوک ادا کا سب سے خوبصورت، سب سے عالیشان محل ہے۔ یہ دولت، یہ شان و شوکت، یہ طاقت، یہ سب کچھ اور ایک ایسا شخص جو تم سے واقعتاً "محبت کرتا ہے، یہ سب تمہارا ہو سکتا ہے، اگر تم اسے قبول کر لو۔ اگر تم عبدالرحمٰن سے شادی کر لو۔ میں نے یہی کہنے کے لیے تمہیں ادھر بلایا ہے۔"

حیا نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔

"آپ کو پتا ہے جب کوئی شخص کسی عورت کو اذیت دیتا ہے اور اس کی بے عزتی کا باعث بنتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ وہ عورت اس شخص کی عزت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ میں نے بھی عبدالرحمٰن پاشا کی عزت کرنا چھوڑ دی ہے۔ میں شادی شدہ ہوں، اس لیے میرا جواب صاف انکار ہے۔"

"کیا ہے، اس ایک معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کے پاس جو عبدالرحمٰن کے پاس نہیں ہے؟" وہ ذرا حیران ہوئی تھیں۔

"اس کے پاس حیا سلیمان ہے اور عبدالرحمٰن پاشا کے پاس حیا سلیمان نہیں ہے۔" وہ بہت استہزا سے چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاتون لاجواب سی خاموش ہو گئیں۔

"اور اگر وہ نہ رہے، تب بھی تمہارا جواب انکار ہوگا؟" وہ ایک دم اندر تک کانپ گئی۔

"یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں، محض ایک سوال ہے۔"

"میرا جواب پھر بھی انکار ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، پھر تم بے فکر ہو جاؤ۔ عبدالرحمٰن زبردستی کا قائل نہیں ہے۔ نہ وہ عشق میں جوگ لینے والا شخص ہے۔ وہ آج کے بعد نہ تمہیں فون کرے گا، نہ تمہارا پیچھا کروائے گا، نہ ہی تمہارے راستے میں آئے گا۔ ویسے بھی وہ دو ڈھائی ماہ سے قبل انڈیا سے واپس نہیں آپائے گا اور اس کے آنے تک تم جا چکی ہوگی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تمہارا جواب انکار میں ہو تو میں تمہیں اس چیز کی گارنٹی دے دوں کہ وہ تمہیں اب کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ تم جا سکتی ہو۔ آخری فیری آٹھ بجے نکلے گی، اگر تم چاہو تو ٹکٹ کے پیسے۔"

"بہت شکریہ۔ میرے پاس پیسے ہیں۔" اس نے اپنا کلچ اٹھایا اور تیزی سے اٹھی۔

"سنو! تم اچھی لڑکی ہو۔ کبھی دوبارہ بیوک ادا آنا ہو تو ادھر ضرور آنا، مجھے تم سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"مگر مجھے نہیں ہوگی۔" وہ واپس پلٹ گئی۔

نیم تاریک راہداری کے دوسرے سرے پہ بنے دروازے کا ناب اس نے گھمایا تو وہ کھل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ پتھر بن جانے کے خوف سے اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

باہر شام کی نیلگوں روشنی ڈوب رہی تھی۔ ہر سو اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے روش پہ آئی۔ اسی پل باہر سے کسی نے سفید گیٹ کھولا۔ نیم اندھیرے میں بھی اسے وہ دونوں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ ترکی میں باتیں کرتے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آرہی تھیں۔ وہی گہرے جامنی فراک والی بچی اور بھورے اسکارف والی بڑی لڑکی، جس کے بازو میں جنگلی پھولوں سے بھری ٹوکری تھی۔

وہ کمسن سی بچی کا ہاتھ تھامے چلی آرہی تھی۔ اسے سامنے سے آتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی۔ حیا تیز قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ بھورے اسکارف والی لڑکی رک کر گردن موڑے اسے جاتے دیکھے گئی۔

بچی نے اسے جھنجھوڑا، تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف جاتے آبنوسی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

حیا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ سمندر کی طرف سے آتی ہوا مزید سرد ہو چلی تھی۔ نیلگوں سیاہ پڑتی شام دم توڑ رہی تھی۔ جب تک وہ واپس بندرگاہ پہ پہنچی، شام اندھیرے میں بدل چکی تھی۔

تاریک رات، ویران سمندر، پراسرار جزیرہ، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی محفوظ جگہ ملے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ ابھی تو وہ رونے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

"رات کی فیری کتنے بجے آئے گی؟" اس نے

ٹکٹ کی کھڑکی سے جھانکتے آفیسر سے پوچھا۔ اس کا موبائل جہان ساتھ لایا تھا' مگر وہ واپس نہیں لے سکی تھی اور جہان اور ڈی جے کے موبائل نمبرز اسے زبانی یاد نہیں تھے۔ ورنہ کہیں سے کال کر لیتی۔ وہ چلے گئے ہوں گے اور کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

"آٹھ بجے۔" ٹکٹ چیکر نے جواب دیتے ہوئے بغور اسے دیکھا' پھر ساتھ رکھا کاغذ اٹھا کر دیکھا۔

"آر یو حیا سلیمان؟ پاکستان تورسٹ؟ (ٹورسٹ؟)" اس کے کہنے کے ساتھ وہ پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے کیا' جس میں اس کی اور ڈی جے کی آج دوپہر کی کھینچی تصویر پرنٹ کی گئی۔

"یس۔۔۔ آئی ایم۔۔۔ میری فیری نکل گئی تھی' کیا میرے فرینڈز ادھر ہی ہیں؟" فرط جذبات سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اس نے سوچ بھی کیسے لیا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔

"پولیس اسٹیشن۔۔۔ کم ٹو پولیس اسٹیشن۔"

اور جب وہ دو پولیس آفیسرز کے ہمراہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو اندرونی کمرے میں اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔

ڈی جے کرسی پہ سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی جبکہ جہان انگلی اٹھائے درشتی سے سامنے بیٹھے آفیسر سے کچھ کہہ رہا تھا۔ آفیسر جواباً" نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہنے کی سعی کر رہا تھا' مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو وہ بولتے بولتے رکا اور گردن موڑی۔ وہ بھیگی آنکھوں سے دروازے میں کھڑی تھی۔

اس کی اٹھی انگلی نیچے گر گئی' لب بھینچ گئے۔ ایک دم ہی وہ کرسی کے پیچھے سے نکل کر اس کی جانب آیا۔

"کدھر تھیں تم؟"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"میں کھو گئی تھی۔ وہ بچہ میرا پرس لے کر بھاگا تو۔۔۔"

"تو آدھے یوک ادا نے تمہیں اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ عقل نام کی چیز ہے بھی تم میں یا نہیں؟ ایک پرس کے لیے تم اس کے پیچھے بھاگیں؟ فیری چھوٹ جائے گی یا وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے' تمہیں اس بات کا کوئی خیال تھا؟" وہ غصے سے چلایا۔

"کیوں نہ بھاگتی میں اس کے پیچھے؟ پرس میں میرا پاسپورٹ تھا' سباجی کا کارڈ تھا' پھر بعد میں پریشانی ہوتی کہ۔۔۔"

"اور جو پریشانی ہمیں ہوئی وہ۔۔۔ ہم اس ڈیڑھ گھنٹے میں پاگلوں کی طرح تمہیں پورے جزیرے پہ ڈھونڈ رہے تھے۔ جانتی ہو ہماری کیا حالت تھی؟"

ڈی جے جو اس کے چلانے کے باعث رک گئی تھی۔ اب آگے بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

"حیا! تم بالکل پاگل ہو۔" اس کی آنکھیں رونے سے متورم تھیں۔ وہ دونوں پھر رونے لگی تھیں۔

"حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی۔ آئندہ میں تم دونوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ بھنا کر کہتا واپس پولیس آفیسر کی جانب پلٹ گیا۔ وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔ اسے پتا تھا اسے واپسی پہ جہان کی بہت سی باتیں سننی پڑیں گی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں لکڑی کا دروازہ دھکیل کر اندر آئیں تو ہر سو اندھیرا چھایا تھا۔ لونگ روم سے ٹمٹماتی زرد روشنی جھانک رہی تھی۔

"آنے!" اس نے جنگلی پھولوں کی ٹوکری لالی میں رکھے اسٹینڈ پہ دھری اور بچی کا ہاتھ تھامے لونگ روم کی طرف آئی۔

صوفے پہ وہ معمر خاتون اسی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چند نوٹ تھے۔ جو وہ گن کر علیحدہ کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہی لڑکا کھڑا ان نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

"سلام علیکم آنے! کیسے ہو عبداللہ؟" اس نے بچی

کی انگلی چھوڑ دی اور کندھے سے پرس کی اسٹریپ اتارتے ہوئے بڑی میز کی طرف آئی۔

"میں ٹھیک ہوں عائشے!" لڑکے نے معمر خاتون کے بڑھائے گئے نوٹ پکڑے' گنے اور باہر بھاگ گیا۔ وہ بقیہ نوٹ واپس بٹوے میں رکھنے لگیں۔

"بجلی والا پول ٹھیک ہوا؟" بٹوہ بند کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"وہاں بندے کام کر تو رہے ہیں۔ ابھی گلی میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا۔ عبداللہ کیوں آیا تھا؟" وہ میز کے ساتھ کھڑی اپنا پرس کھولتی کہہ رہی تھی۔

"میرا کام تھا۔" انہوں نے بچی کا ہاتھ تھامتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔ جواب ان کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی تھی۔

"کام بھی تھا اور آنے نے اسے پیسے بھی دیے عائشے گل! تم نے دیکھا' وہ صبح قرآن پڑھنے کب سے نہیں آیا' روز بہانے بنا دیتا ہے۔" بچی ناک سکوڑتی کہہ رہی تھی۔

اپنے پرس کو کھنگالتی عائشے نے پلٹ کر خفگی سے اسے دیکھا۔

"بری بات ہے بہارے! کسی کے پیچھے اس کا یوں ذکر نہیں کرتے۔" وہ ایک نظر اس پہ ڈال کر واپس اپنے پرس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"اور یہ وہی لڑکی تھی نا؟" چند لمحے موم کی طرح پگھل کر گر گئے تو اس نے پرس کی چیزیں ہاتھ سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ادھر کیوں آئی تھی؟"

"یہ عبدالرحمٰن کے مسئلے ہیں' وہ خود ہی نپٹا لے گا۔" انہوں نے ٹالنا چاہا۔

"اچھا۔" وہ اداسی سے ہنسی۔ "یعنی مسئلہ ابھی تک نپٹا نہیں ہے' کیا کہہ رہی تھی؟"

"صاف انکار۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"عبدالرحمٰن چلا گیا؟" اس نے بات پلٹ دی۔

"ہاں' آج صبح کی فلائٹ تھی نا۔"

"واپسی کا نہیں بتایا؟"

"کہہ رہا تھا' دو سے تین ماہ لگ جائیں گے اور شاید اس دفعہ وہ واپس نہ آئے۔"

"جانے دو آنے! وہ ہر دفعہ یہی کہتا ہے۔" وہ اداسی سے مسکرا کر بولی۔ ایک ہاتھ سے ابھی تک وہ پرس کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"آنے! تمہیں پتا ہے' عائشے گل مجھ سے ناراض ہے۔" بہارے اپنے ننھے ننھے سے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بتانے لگی۔ آنے نے حیرت سے میز کے ساتھ کھڑی عائشے کو دیکھا' جس کی ان کی طرف پشت تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ سات دن کی تربیت کے بعد آپ کی چہیتی پہ یہ اثر ہوا ہے کہ آج یہ بازار میں عین سڑک کے وسط میں کھڑی اپنا پونچو کہیں گرا کر' سیاحوں کے کیمروں میں تصویریں بنوا رہی تھی۔"

"ارے! تو تم اسے سمجھا دو نا' یوں ناراض تو نہ ہو۔"

"کس کس کو سمجھاؤں؟ سفیر کہتا ہے اس کے ماں' باپ کو سمجھاؤں۔ اس کے ماں باپ کہتے ہیں سفیر کو سمجھاؤں۔ آپ کہتی ہیں بہارے کو سمجھاؤں' بہارے کہتی ہے میں خود کو سمجھاؤں اور عبدالرحمٰن کہتا ہے۔۔۔" وہ لمحے بھر کو رکی' پھر سر جھٹک کر پرس کی چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگی۔

"عبدالرحمٰن کیا کہتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ذرا سی گردن موڑ کر بہارے کو دیکھا' جو چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے آنے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"آج تم نے مجھے بہت خفا کیا ہے بہارے! میں نے کہا تھا نا کہ اچھی لڑکیاں ایسے نہیں کرتیں۔"

"تو اچھی لڑکیاں کیسے کرتی ہیں عائشے گل؟" بہارے نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔

"اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں' وہ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں' وہ ہر بات نہیں کرلیتیں۔"

اس نے پرس میز پہ الٹ کر جھاڑا۔

"تو پھر میں بری لڑکی ہوں؟" بہارے پل بھر میں روہانسی ہوگئی۔

"نہیں... کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی۔ بس اس سے کبھی کبھی کچھ ایسا ہو جاتا ہے' جو برا ہوتا ہے' جس پہ اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔"

"جب وہ ناراض ہوتا ہے تو وہ انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے اور جانتی ہو کہ اکیلا چھوڑنا کیا ہوتا ہے؟ جب بندہ دعا کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ وہ مدد مانگتا ہے تو مدد نہیں آتی۔ وہ راستہ تلاشتا ہے تو راستہ نہیں ملتا۔"

وہ اب میز پہ نکلی اشیا الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ خالی پرس ساتھ ہی اوندھا رکھا تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"سفیر نے اپنی ممی کو چابیاں دینے کے لیے کہا تھا۔ یہیں پرس میں رکھی تھیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔ عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے' عائشے گل کبھی کچھ نہیں کرسکتی۔"

"وہ یہ اس لیے کہتا ہے تاکہ عائشے گل سب ہی کچھ کرنا سیکھ جائے۔"

ان کی بات پہ اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا اور چیزیں واپس پرس میں ڈالنے لگی۔ وہ چابی یقیناً کہیں اور رکھ کر بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے چند دنوں میں پڑھائی کا بوجھ ذرا بڑھ گیا اور کلاسز کا شیڈول پہلے سے سخت ہو گیا تو وہ دونوں ٹیسٹ تیار کرنے اور دینے میں ایسی مصروف ہوئیں کہ کہیں آجا نہیں سکیں۔

وہ وسط مارچ کے دن تھے۔ استنبول پہ چھایا کہر ٹوٹ رہا تھا اور بہار کی رسیلی ہوا ہر سو گلاب اور ٹیولپس کھلا رہی تھی۔ اب صبح سویرے گھاس پہ برف کی جمی سفید تہہ نہیں نظر آتی تھی اور سبانجی کا سبزہ اپنے اصل رنگ میں لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک دن ان دونوں نے ٹاپ کپی پیلس (میوزیم) جانے کا پروگرام بنایا' مگر اسی وقت ہالے آگئی' اس کے پاس کوئی دوسرا پروگرام تھا۔

"میلو کینٹ میں میلاد ہو رہا ہے' چلو گی؟"

"کیوں نہیں' اس بہانے تھوڑا سا ثواب ہی کما لیں گے' ورنہ میں نے اور حیا نے ایسے تو کوئی نیکی کرنی نہیں ہے۔" ڈی جے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے بولی۔

"ویسے ربیع الاول ختم ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے؟"

"یہ ہو چکا ہے' یہ اسٹوڈنٹس کا میلاد ہے اور پڑھائی کے باعث ملتوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اتنا لیٹ کیا ہے' آپ چلو۔"

میلاد میں درس دینے والی لڑکی اونچی چوکی پہ بیٹھی تھی۔ سامنے رکھی چھوٹی میز پہ کھلی کتاب سے پڑھ کر وہ ترک میں درس دے رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک شرمندہ نگاہ سامنے دیگر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی حیا اور خدیجہ پہ بھی ڈال لیتی' جو سروں پہ دوپٹے لپیٹے بہت توجہ سے درس سن رہی تھیں۔ مدرس لڑکی سخت شرمندہ تھی۔ حاضرین کی انگریزی اچھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کی مجبوری تھی کہ اسے ترک میں درس دینا پڑ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ بظاہر بہت توجہ اور غور سے سنتی پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو سمجھ کچھ نہیں آرہا۔

درس ختم ہوا تو وہ لڑکی ان کی طرف آئی اور بہت معذرت خواہانہ انداز میں ان کو دیکھا۔

"آپ کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہوگا؟"

"لیں! سمجھ کیوں نہیں آیا۔" ڈی جے نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "پہلے آپ نے حجر اسود کو چادر پہ رکھنے والا واقعہ بتایا' پھر غار حرا' وحی' مسلمانوں کی ابتدائی تکالیف' حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قربانیاں' ابو جہل بن ہشام کی گستاخیاں' حضرت عمرؓ کا قبول اسلام' ہجرت مدینہ' پھر غزوہ بدر..."

لڑکی نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

"آپ کو ترکی آتی ہے؟"

"ترکی نہیں آتی' مگر اپنی ہسٹری ساری سمجھ میں آتی ہے۔" وہ جواباً ہنس کر بولی۔ ترکی' اردو جیسی ہی لگتی تھی اور واقعتاً وہ سب سمجھ پا رہی تھیں۔

"شکریہ... شکریہ!" وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔

میلاد ختم ہوا تو ہالے کی ای کا فون آگیا۔ انہیں کوئی ضروری کام تھا۔ سو ہالے نے ان کے ساتھ آگے جانے سے معذرت کرلی۔ اب انہیں ٹاپ کپی پیلس اکیلے جانا تھا۔

"وہ لوگ اکیلے تو نہیں ہوتے۔" وہ تاقسم اسکوائر پہ بس سے اتریں تو حیا نے اسے تسلی دی۔ ڈی جے ہنس دی۔

"پھر بھی تیسرے کو ساتھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

وہ استقلال اسٹریٹ کی جانب مڑیں تو قدم خود بخود برگر کنگ کی جانب اٹھنے لگے۔

"وہ چلے گا ہمارے ساتھ؟ اس روز کتنا غصہ کیا تھا اس نے' یاد ہے؟"

"وہ اس لیے کہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے وہ بہت فکر مند اور پریشان ہو گیا تھا مگر اب تھوڑا سا اصرار کریں گے تو ضرور چلے گا۔"

استقلال اسٹریٹ ویسے ہی رش سے بھری تھی۔ وہ دونوں بازو میں بازو ڈالے تیز تیز چل رہی تھیں۔ یہ ان کی دوستی کی علامت ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اسٹریٹ کے جیب کتروں سے بچاؤ کے لیے وہ اپنے ملے ہوئے کندھوں سے پرس لٹکاتی تھیں تاکہ چھینے نہ جاسکیں۔ حیا تو اس واقعے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی۔ اب بھی اس نے اپنے سفید کوٹ کے اوپر پرس یوں ڈال رکھا تھا کہ بائیں کندھے سے اسٹریپ گزار کر دائیں پہلو سے پرس لٹک رہا تھا۔ بال کھلے تھے اور دوپٹا گردن کے گرد لپٹا تھا۔ ڈی جے نے بھی اسی کی طرح شلوار قمیص پہ سیاہ لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔

برگر کنگ میں خوب گہما گہمی تھی۔ اشتہا انگیز سی مہک سارے میں پھیلی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کچن کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئیں۔ سامنے طویل سا کچن تھا۔ ادھر ادھر ایپرن اور ٹوپیاں پہنے دو' چار افراد آ' جا رہے تھے۔ ایک سلیب کے ساتھ وہ بھی کھڑا تھا۔ جینز اور شرٹ پہ سفید ایپرن پہنے' ہاتھ میں بڑا ٹوکا لیے وہ کٹنگ بورڈ پہ رکھے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

"گڈ ما ۲۲۲ رننگ مینیجر!"

دونوں نے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر با آواز بلند پکارا تو اس کا تیزی سے چلتا ہاتھ رکا۔ اس نے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا' پھر سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔ دونوں جوگرز پہنے' پھولے ہوئے ہینڈ بیگز اٹھائے ہوئے تھیں۔ حیا کے ہاتھ میں رول کیا ہوا استنبول کا نقشہ تھا اور ڈی جے کے ہاتھ میں ایک گائیڈ بک۔ گویا وہ پوری تیاری سے آئی تھیں۔

"گڈ مارننگ!" وہ واپس گوشت کی طرف متوجہ ہوا اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی اسٹینڈ پہ لگی تختی اٹھا کر سامنے کاؤنٹر پہ پٹخ کر رکھی۔ اس پہ لکھا تھا۔ "آئی ایم بزی' ڈونٹ ڈسٹرب۔"

حیا اور خدیجہ نے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر خدیجہ مسکراہٹ دبائے آگے بڑھی' جبکہ حیا وہیں چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے بازو سینے پہ لپیٹے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

"ہم ٹاپ کپی پیلس جا رہے ہیں!" خدیجہ نے کاؤنٹر کے سامنے آکر اطلاع دی۔

"استقلال اسٹریٹ سے باہر نکلو' تاقسم سے میونسپلٹی بس پکڑو' وہ تم پہنچا دے گی۔" وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سے گوشت کا ٹکڑا پکڑے' دوسرے سے کھٹ کھٹ چھرا چلا رہا تھا۔

"مگر ہمیں ایک ہینڈسم گائیڈ بھی چاہیے۔"

"ہینڈسم گائیڈ ابھی مصروف ہے۔ کسی غیر ہینڈسم گائیڈ سے رابطہ کرو۔"

ڈی جے نے پلٹ کر حیا کو دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ وہ واپس جہان کی طرف گھومی۔

"تو آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟"

"بالکل بھی نہیں۔ تم میں سے کوئی پھر ٹاپ کپی کے

قلعے میں گم ہو جائے گی اور میرا پورا دن برباد ہو گا۔"

"ایک دفعہ پھر سوچ لیں۔"

"لکھ کر دے دوں؟" وہ کہتے ہوئے ٹکڑوں کو ایک طرف ٹوکری میں رکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

"اچھا۔ ایک بات بتائیں' استقلال اسٹریٹ میں جیب کترے ہوتے ہیں نا؟" ڈی جے نے اس کے سلور اسمارٹ فون کو دیکھتے ہوئے کہا جو قریب ہی چارجنگ پہ لگا تھا۔

"ہاں!"

"تو ہمیں آپ کی جیب کٹ گئی۔" ڈی جے نے ہاتھ بڑھا کر فون اڈکا' تار نکالی اور حیا کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

"کیا مطلب؟" اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"مطلب یہ کہ اگر آپ ہمارے ساتھ ٹاپ کپی پیلس نہیں چلیں گے تو ہم اس موبائل کو بیچ کر آدھا جواہر تو خرید ہی لیں گے۔ ویسے فون اچھا رکھا ہوا ہے آپ نے۔" وہ الٹ پلٹ کر کے موبائل دیکھنے لگی۔ "پاکستانی روپوں میں دو' ڈھائی لاکھ سے کم کا تو نہیں ہو گا۔"

وہ چھرا رکھ کر ان کے سر پہ آپہنچا۔

"میرا فون واپس کرو۔" کڑی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"ٹاپ کپی سے واپسی پہ دے دوں گی۔ وعدہ!"

"مطلب تم لوگ مجھے یرغمال بنا کر لے جاؤ گی؟"

"کوئی شک!" وہ پہلی دفعہ بولی۔

"ٹھیک ہے' مگر یہ آخری بار ہے' پھر میں کبھی تم دونوں نکمی لڑکیوں کے ساتھ اپنا دن برباد نہیں کروں گا۔" وہ ایپرن گردن سے اتارتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ "اور اگر آج تم دونوں میں سے کوئی کھوئی تو میں بہت برا پیش آؤں گا۔" ہاتھ دھو کر جیکٹ پہنتا وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔

ٹاپ کپی سرائے کے سامنے وہ سبزہ زار پہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حیا درمیان میں تھی اور وہ دونوں اس کے اطراف میں۔

"جہان! یہ ٹاپ کپی سرائے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"میں ایک یرغمال شدہ گائیڈ ہوں اور یرغمالی عموماً خاموش رہتے ہیں۔" وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیونگم چباتا شانے اچکا کر بولا۔

"میں بتاتی ہوں' ٹاپ کپی کا ٹاپ دراصل اردو والا توپ ہے' جیسے تقسیم تاقسم بنا' ویسے ہی توپ ٹاپ بن گیا۔ کپی کہتے ہیں گیٹ کو اور سرائے ہو گیا محل' سو ٹاپ کپی سرائے بنا" Canon Gate Palace "آئی ایم اے جینیس ہے نا جہان؟"

"میں نہیں بول رہا۔" وہ سخت خفا تھا۔

ٹاپ کپی پیلس چار سو سال تک سلاطین کا محل رہا تھا۔ سرمئی عظیم الشان قلعہ نما محل جہاں خاص کمروں کے پہرے دار گونگے' بہرے ہوا کرتے تھے' تاکہ راز دیواروں کے باہر نہ نکلیں۔ جس کے کون نما مینار اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ سلطان کا عظیم ورثہ اور اثاثے۔ چینی پورسلین کے نیلے اور سفید رنگ کے ایسے برتن جن میں اگر زہر ملا کھانا ڈالا جاتا تو برتن کا رنگ بدل جاتا۔ چھیاسی قیراط کے جواہرات سے مزین سلطان کے شاہی لباس نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔

"یہ منحوس گارڈ ہمارے سر پہ نہ کھڑا ہوتا تو میں کسی طرح دو' چار ہیرے تو توڑ ہی لیتی۔" ڈی جے ان آنکھیں چندھیا دینے والے قیمتی پتھروں کو دیکھ کر سخت ملال میں گھر چکی تھی۔

پویلین آف ہولی مینٹل کے حصے میں دینی متبرکات تھے۔

وہ ایک اونچا ہال تھا۔ منقش درودیوار' رنگ برنگی ٹائلز سے سجے چمکتے فرش' بلند و بالا ستون۔ حیا اردگرد نگاہیں دوڑاتی شیشے کی دیواروں میں مقید تاریخی اشیا کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً ایک جگہ رکی اور شوکیس میں سجے ایک تبرک کو دیکھا۔ وہ ایک ٹیڑھی رکھی ہوئی چھڑی تھی۔ بھوری سی چھڑی جو شیشے میں مقید تھی۔ وہ گردن ترچھی کر کے اس کو دیکھنے لگی' پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کیپشن سامنے ہی لگا تھا۔

"اسٹاف آف موسیٰ۔"

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا۔)

اس کی سکیٹر کر پڑھتی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ لب بھی نیم وا ہو گئے۔ لمحے بھر بعد وہ دور کھڑی ڈی جے کا بازو قریباً دبوچ کر اسے ادھر لائی۔

"ڈی جے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا عصا ہے۔"

"رئیلی؟" اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ "مگر یہ ان کے پاس کیسے پہنچا؟"

وہ دونوں گھوم پھر کر ہر زاویے سے اس کو دیکھنے لگیں۔ جہان بھی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے چلتا ان کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو سب پرانا تھا' مگر وہ دونوں تو مارے جوش کے راہداری میں آگے پیچھے ایک ایک تبرک کی طرف لپک رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے سروں پہ آگئے تھے۔

کعبہ کا تالا' حضرت داؤد علیہ السلام کی تلوار' حضرت یوسف علیہ السلام کا صافہ' ابراہیم علیہ السلام کا برتن' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس' دانت مبارک' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور بہت سے صحابہ کی تلوار۔

"ڈی جے! کیا یہ شیشے کی دیوار غائب نہیں ہو سکتی؟ اور ہم اس تلوار کو چھو نہیں سکتے؟" وہ دونوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے سامنے کھڑی تھیں۔ کوئی ایسا مقناطیسی اثر تھا اس تلوار میں کہ مقابل کو باندھ دیتا تھا۔

"مگر ہم اس قابل کہاں ہیں حیا؟" خدیجہ نے تاسف سے سرہلایا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس تلوار کو دیکھ رہی تھیں۔

"اگر ہم اس کو چھو سکتے تو جانتی ہو کیا ہوتا؟ چودہ صدیوں کا فاصلہ ایک لمس میں طے ہو جاتا' مگر ہمارے ایسے نصیب کہاں؟"

"جہان! یہ سب تبرکات اصلی ہیں نا؟"

جہان نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

"میں نے کبھی نہ ان پہ ریسرچ کیا' نہ کوئی ریسرچ پڑھا۔ ترکی ارکان ہے کہ یہ سب اصلی ہیں۔ کہنے والے کہتے تو ہیں کہ مسلمانوں کے ریلکس (تبرکات) بھی اتنے ہی نقلی ہیں جتنے عیسائیوں کے' مگر اللہ بہتر جانتا ہے۔"

"یہ اصلی ہیں' میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب ہمارے انبیا سے وابستہ رہنے والی اشیا ہیں۔ تحریک خلافت انہی متبرکات اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لیے ہی تو چلائی گئی تھی۔"

ٹاپ کپی پیلس میں خوب گھوم پھر کر جب وہ باہر نکلے تو جہان نے اپنا موبائل واپس مانگا۔

"یہ لیں! کیا یاد کریں گے اور فکر نہ کریں' ہم نے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ سیکورٹی لاک کوئی پاس ورڈ ہوتا تو میں کھولنے کی ضرور کوشش کرتی' مگر آپ نے تو فنگر پرنٹ انٹری لگا رکھی ہے۔" ڈی جے کے ہاتھ سے فون لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

ٹاپ کپی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ سے جہان نے ان کو بہت اچھا سا کھانا کھلایا۔ ترکی کا اب تک کا بہترین کھانا اور کھانے کے دوران ہی خدیجہ سردرد کی شکایت کرنے لگی۔ جب تک کھانا ختم ہوا' وہ بہت پژمردہ سی لگنے لگی تھی۔ اس کا سر ایک دم ہی درد سے پھٹنے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے میں واپس ڈورم میں جا کر ریسٹ کروں' تم لوگ اکیلے گھومو پھرو۔" اس کی طبیعت واقعی خراب لگ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے جانے دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں ٹاپ کپی پیلس کی پچھلی طرف آگئے۔

وہاں ایک وسیع و عریض سفید سنگ مرمر کے چمکتے فرش والا برآمدہ تھا' جسے اونچے سفید ستونوں نے تھام رکھا تھا۔ برآمدے کے آگے فاصلے فاصلے پر چوکور چبوترے سے بنے تھے۔ جن کے سامنے ٹیرس کی طرح چند گز چوڑا کھلا احاطہ تھا۔ اس کے آگے اونچی

سفید منڈیر بنی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر منڈیر پہ کہنیاں رکھ کر دیکھو تو نیچے بہتا مرمرا کا جھاگ اڑاتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ دل چاہتا انسان صدیوں وہاں بیٹھا سمندر دیکھتا رہے۔

"تھک گئے ہو؟" وہ دونوں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے چبوترے کے کنارے پہ بیٹھے تھے۔ جب حیا نے پوچھا۔ اسے جہان ذرا تھکا تھکا لگا تھا۔

"نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ ذرا سا بخار ہے شاید۔" اس نے خود ہی اپنا ماتھا چھوا' پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے گولیوں کی ڈبی نکالی۔ ڈھکن کھول کر ڈبی ہتھیلی پہ الٹی' دو گولیاں علیحدہ کیں اور ڈبی بند کرتے ہوئے دونوں گولیاں منہ میں ڈالیں' پھر نگل گیا۔

"میرے پاس پانی تھا۔" وہ اپنا پرس کھنگالنے لگی' لیکن تب تک وہ نگل چکا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ تشویش سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صبح ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے اسے یوں ہی جہان کی آواز ذرا دھیمی لگی تھی مگر اس نے پوچھا نہیں اب شاید اس کا بخار شدید ہو گیا تھا۔ کیونکہ چہرے پہ اثرات آنے لگے تھے۔ سرخ پڑتی آنکھیں اور نڈھال سا چہرہ۔

"بس میں نے دیکھ لیا سمندر' اب واپس چلتے ہیں۔ تمہیں گھر جا کر ریسٹ کرنا چاہیے۔"

"گھر جاتے جاتے گھنٹہ لگ جائے گا۔ میں نے ابھی دوائی لی ہے' اس کا اثر ہونے میں ذرا وقت لگے گا۔ ابھی یہیں بیٹھتے ہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تکان سے کہہ رہا تھا۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ ان چبوتروں پہ دور' دور تک ٹولیوں کی صورت میں سیاح بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگ آگے منڈیر کے ساتھ کھڑے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔

"میں تھوڑی دیر یہاں لیٹ جاؤں' تم اکیلی بور تو نہیں ہو گی؟ ابھی میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری لینڈ لیڈی شاید آج آئے' جھگڑا کرنے' میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔"

"نہیں' نہیں' تم لیٹ جاؤ۔ یہ شال لے لو۔" اس نے بیگ سے شال نکال کر اسے تھمائی۔ وہاں ٹھنڈی ہوا بہت تیز تھی۔ یہ شال وہ اور ڈی جے بطور پکنک میٹ کے استعمال کرتی تھیں۔

"تھینکس!" وہ ستون کے ساتھ فرش پہ لیٹ گیا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے' وہ گردن تک شال کمبل کی طرح ڈالے' کب سو گیا اسے پتا نہیں چلا۔ اسے یقیناً بہت سردی لگ رہی تھی۔

وہ اس سے ایک زینہ نیچے آ بیٹھی تھی۔ ہر چند لمحے بعد وہ گردن موڑ کر اوپر لیٹے جہان کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ سو چکا تھا۔

سمندر کی لہروں کا شور وہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ وہ اپنا ترکی والا موبائل نکال کر یوں ہی ان باکس چیک کرنے لگی۔ وہاں چند دن پہلے کا ایک ایس ایم ایس ابھی تک پڑا تھا۔ اس نے اس کا جواب نہیں دیا تھا اور کئی دفعہ پڑھ لینے کے باوجود مٹایا نہیں تھا۔ وہ بیوک ادا سے واپسی کے اگلے روز انڈیا کے ایک غیر شناسا موبائل نمبر سے آیا تھا۔

"مجھے آپ کے جواب سے خوشی نہیں ہوئی' مگر میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ آج کے بعد آپ سے کبھی رابطہ نہیں کروں گا۔ جو تکلیف میں نے آپ کو پہنچائی' اس کے بدلے میں اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو یہ آپ کی بڑائی ہو گی اور اگر کبھی آپ کو استنبول میں کوئی مسئلہ ہو' سرکاری کام ہو یا غیر سرکاری' قانونی یا غیر قانونی' مجھے صرف ایک ایس ایم ایس کر دیجیے گا' آپ کا کام ہو جائے گا۔ اے آر پی۔"

اس پیغام کے بعد اس شخص نے واقعتاً کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب استنبول میں بہت آزادی سے' بہت مطمئن دل و دماغ کے ساتھ گھومتی تھی۔ اسے پہلے کی نسبت اب اے آر پی سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت وہ پیغام دوبارہ پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔

اس نے پلٹ کر احتیاط سے جہان کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہا تھا۔ وہ واپس سیدھی ہوئی اور ریپلائی کا بٹن دبایا۔ اس پیغام کا جواب اسے کبھی نہ کبھی تو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ خوب غور و فکر کر کے کچھ ایسا لکھ کر بھیجے گی کہ وہ بھڑکے بھی نہیں اور دوبارہ اس کا پیچھا بھی نہ کرے' سو اچانک اسے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔

جہان کو صرف بخار نہیں تھا۔ وہ پریشان بھی تھا۔ اسے وہ بیوک ادا والے ٹرپ کے مقابلے میں ذرا کمزور لگا تھا۔ گردش معاش کے جھمیلوں میں پھنسے اس انسان کی اگر وہ ایک مدد کر سکتی تھی تو اس میں آخر حرج ہی کیا تھا۔

وہ کافی دیر سوچتی رہی' پھر اس نے جواب ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"آپ کی وسیع النظری کا شکریہ۔ مجھے واقعتاً استنبول میں ایک کام درپیش ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں اسے آپ کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیت کا مداوا سمجھوں گی۔"

اس نے پیغام بھیج دیا۔ اب وہ خاموشی سے بیٹھی سمندر کی لہریں دیکھنے لگی۔ وہ بیوک ادا اس کے کہنے پر بھی تو چلی گئی تھی اور جب دروازہ بند ہوا تھا تو اسے لگا تھا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ مگر اس غلطی کا نتیجہ بہت اچھا اور اطمینان بخش نکلا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب بھی اس نے غلطی کی ہے اور اس کا نتیجہ…؟

ایک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ چونکی اور موبائل سامنے کیا۔ وہی انڈیا کا غیر شناسا نمبر تھا' وہ تو سمجھی تھی کہ ٹیکسٹ پہ بات ہو جائے' بہت ہے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ فون کرے گا۔

وہ موبائل سنبھالتی اٹھ کر سامنے منڈیر کے پاس چلی آئی۔ اگر وہ یہاں کھڑے ہو کر بات کرے گی تو جہان تک آواز نہیں پہنچے گی۔

"ہیلو؟" اس نے فون اٹھا لیا۔

"زہے نصیب… زہے نصیب… آج آپ نے ہمیں کیسے یاد کر لیا؟" وہی عامیانہ سا' مسکراتا لب و لہجہ۔ اسے اپنی حرکت پہ شدید پشیمانی ہوئی تھی۔

"مجھے ایک کام تھا۔" وہ اعتماد سے بتاتے ہوئے میں کہنے لگی۔ "اور بہتر ہو گا کہ ہم کوئی بے کار کی بات کرنے کے بجائے کام کی بات کریں۔"

"آپ کی مرضی ہے حیا جی! رابطہ بھی تو آپ نے ہی کیا ہے' ورنہ عبدالرحمن پاشا اپنے قول کا بہت پکا ہے۔" شاید وہ طنز کر گیا تھا' مگر وہ پی گئی۔

"میرے کزن کا ریسٹورنٹ ہے استقلال اسٹریٹ پہ' برگر کنگ' اس کی شاپ کی قسطیں ادا نہیں ہو سکیں۔ ریسٹورنٹ کی مالکہ آج کل میرے کزن کو تنگ کر رہی ہے۔ کیا وہ اسے سال' دو سال کی مہلت نہیں دے سکتی؟"

"کون سا کزن؟" وہ جیسے چونکا تھا۔

"جج… جہان سکندر۔" وہ ہکلائی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے یا غلط' مگر وہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھی اسے اس پریشانی سے تھکتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"اچھا… تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے کزن کا یہ مسئلہ حل کر دوں اور یہ کہ اس کی مالکہ پھر اسے تنگ نہ کرے؟"

"جی!"

"میں کچھ کرتا ہوں' آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے فون رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ وہ ہنسا کیوں تھا؟

وہ واپس آ کر جہان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ چند لمحے لگے تھے اسے نارمل ہونے میں۔ اس نے وہی کیا' جو اسے ٹھیک لگا تھا اور اب وہ ذرا مطمئن تھی۔

کافی دیر وہ وہیں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے عقب میں ٹاپ کپی کا عظیم محل تھا اور سامنے مرمرا کا سمندر۔ بہت سے لمحے محل کی دیواروں سے رینگتے مرمرا کے پانیوں میں گھل گئے تو ایک دم جہان کا موبائل بجا۔

وہ جیسے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ شال ہٹائی اور جیب سے موبائل نکالا۔ تب تک کال کرنے والا شاید کال کاٹ چکا تھا۔

"ریسٹورنٹ سے آرہی تھی کال' میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں' وہ چالاک لومڑی نہ آگئی ہو کہیں۔" وہ پریشانی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا' تم کیوں فکر کرتے ہو؟" وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کی بات پہ تھکے تھکے سے انداز میں نفی میں سرہلا دیا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے استقلال اسٹریٹ میں داخل ہوئے تو حیا نے کہا۔

"آج میں تمہارا برگر کھا کر جاؤں گی' کیونکہ ڈی جے اور تم نے اپنی اپنی بیماری میں مجھے بالکل اگنور کردیا ہے۔"

"کھالینا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا مگر اگلے ہی پل ٹھٹھک کر رکا۔ مسکراہٹ چہرے سے غائب ہوگئی۔ حیا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

سامنے برگر کنگ تھا۔ اس کی شیشے کی دیوار میں بڑا سا سوراخ تھا اور سوراخ کے گرد مکڑی کے جالے کی مانند دراڑیں پڑی تھیں۔

وہ ایک دم تیزی سے دوڑتا ریسٹورنٹ کی طرف لپکا' جبکہ وہ وہیں ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی سماعتوں میں ایک قہقہہ گونجا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ بھاگ کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشے' الٹا' بکھرا ٹوٹا فرنیچر' اوندھی میزیں' ٹکڑے ٹکڑے ہوئے برتن' ہر جگہ توڑ پھوڑ کے آثار تھے۔ عملے کے ایک شخص کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک آفیسر ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پہ لگے کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

جہان تحیر سے وہ سب کچھ دیکھتا ان پولیس آفیسرز کی طرف آیا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور وہ صدمے اور شاک سے گنگ نفی میں سرہلاتا کچھ کہہ نہیں پارہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟ اس نے قریب سے گزرتے شیف کو روک کر پوچھا۔" جواباً" اس نے تاسف سے سرہلایا۔

"وہ گینگسٹرز تھے' ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ اندر آئے اور پورا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔ عملے کو زدوکوب بھی کیا۔ پولیس بھی بہت دیر سے پہنچی۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردے۔ یہ اس نے کیا کردیا؟ کس شخص پہ بھروسا کرلیا؟ او خدایا۔۔۔

پولیس آفیسر کی کسی بات کے جواب میں کچھ کہتے جہان کی نگاہ اس پہ پڑی۔ جو بمشکل آنسو روکے کھڑی تھی۔ اس نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ اس کی طرف آیا۔

"تم جاؤ' تاقسم سے بس پکڑلینا' ابھی جاؤ' میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" وہ تھکا سا کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پژمردہ اور تھکن زدہ لگ رہا تھا۔

وہ سرہلا کر' آنسو پیتی پلٹ گئی۔

"یہ تم نے کیا کروا دیا حیا! جو اس کے پاس تھا' اسے بھی ضائع کرادیا؟ آئی ہیٹ یو حیا۔۔۔ آئی ہیٹ یو۔۔۔"

خود کو ملامت کرتی' وہ خاموش آنسوؤں سے روتی واپس تاقسم جارہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ فون کرکے اس شخص کو بے نقط سنائے' مگر شاید وہ یہی چاہتا تھا۔ رابطہ رکھنے کا کوئی بہانہ۔ اس نے آنسو رگڑتے ہوئے سر جھٹکا۔ "نہیں۔ اب وہ اسے کبھی فون نہیں کرے گی۔"

✡ ✡ ✡

وہ گہری نیند میں تھی۔ سیاہ گھپ اندھیرے میں جب دور ایک چیختی ہوئی آواز نے سماعت کو چیرا۔ اندھیرے میں دراڑ پڑی۔ دور سے آتی آواز قریب ہوتی گئی۔ اس نے پلکیں جدا کرنی چاہیں تو جیسے ان پہ بہت بوجھ تھا۔

بمشکل آنکھیں کھلیں تو چند لمحے اسے حواس بحال کرنے میں لگے۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔

ڈورم میں پرسکون سی نیم تاریکی چھائی تھی' کونے میں مدھم سا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ڈی جے' تالی اور چیری اپنے اپنے بستروں میں کمبل ڈالے سو رہی تھیں۔ دیوار پہ آویزاں بڑے کلاک کی چمکتی سوئیاں رات کے ایک بجنے کا بتا دے رہی تھیں۔

وہ چنگھاڑتی آواز ابھی تک آرہی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل ہوتا سر دائیں جانب گھمایا' کہنی کے بل ذرا اوپر ہوئی اور تکیے تلے ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اس کا پاکستان والا موبائل بج بج کر اسی پل خاموش ہوا تھا۔ "دو مسڈ کالز" اس نے تفصیل کھولی تو چمکتی اسکرین سے آنکھیں پل بھر کو چندھیا گئیں۔ اس نے پلکیں سکیڑے ہاتھ سے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اسکرین کو دیکھا۔ "تایا فرقان موبائل" ساتھ بریکٹ میں دو کا ہندسہ تھا۔ حیا نے اسکرین کے کونے پہ لکھے ٹائم کو دیکھا۔ یہاں ایک بجا تھا تو پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آدھی رات کو آنے والا فون اور مہمان کبھی اچھی خبر نہیں لاتے اور نہ ریسیو کرسکنے والی کال اس برچھی کی مانند ہوتی ہے جو کوئی گھونپ کر نکالنا بھول گیا ہو۔

اس کی ساری نیند اور سستی پل بھر میں بھاگ گئی۔ تایا اس وقت کیوں کال کررہے تھے؟ وہ ٹھیک تو تھے؟ اماں' ابا' روحیل' سب ٹھیک تو تھے؟ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ تڑپ کر واپس کال ملانے لگی' پھر یاد آیا کہ اس فون میں تو ترکی آنے کے بعد بیلنس ہی نہیں ڈلوایا تھا اور ترک موبائل جو تکیے کے اس طرف رکھا تھا۔ اس میں بھی بیلنس ختم تھا۔

اس نے کمبل پھینکا اور سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اتری۔ وہ اپنے نائٹ سوٹ میں ملبوس تھی۔ گلابی چیک والا ٹراؤزر اور کھلا لمبا کرتا۔ "ڈی جے۔۔۔ ڈی جے۔۔۔ موبائل دو اپنا۔" اس نے ڈی جے کے بینک پہ چڑھ کر اس کو جھنجھوڑا۔ وہ بمشکل ہلی۔

"نیند مت خراب کرو میری۔ سیدھی جہنم میں جاؤ گی تم۔" ڈی جے نے بند آنکھوں سے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ اس کا موبائل وہیں تکیے کے ساتھ رکھا تھا۔ حیا نے موبائل جھپٹا اور نیچے اتری۔ تالی کے بینک کی کرسی کھینچ کر بیٹھی اور اپنے موبائل سے نام' نمبر دیکھ کر ڈی جے کے فون پہ ملانے لگی۔ فون گھما حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہے تھے۔

نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد وہ نسوانی آواز ترکی میں کچھ بکنے لگی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈی جے ذلیل کا بیلنس بھی ختم تھا۔ اس نے جھنجھلا کر فون کان سے ہٹایا۔ یورپی یونین کا سارا اسکالر شپ استقلال اسٹریٹ اور جواہر میں شاپنگ پہ اڑا دینے والیوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔

اسی پل فون پھر سے بجا۔ تایا فرقان کالنگ۔ اس نے جھٹ سے کال اٹھائی۔

"ہیلو۔۔۔؟"

"حیا۔۔۔ تمہارے پاس اس نمبر کے علاوہ کون سا دوسرا نمبر ہے؟" وہ تایا فرقان ہی تھے اور اتنے غصے سے بولے تھے کہ وہ کانپ گئی۔

"جی۔۔۔ کیا؟"

"حیا! میرے ساتھ بکواس مت کرو' مجھے بتاؤ' تمہارے پاس دوسرا کوئی نمبر ہے؟" وہ نیند سے جاگی تھی اور کبھی بھی اتنی حاضر دماغ نہیں رہی تھی۔ مگر ساری بات سمجھنے میں اسے لمحہ لگا تھا۔

ارم پکڑی گئی تھی۔

"نہیں تایا ابا! میرے پاس یہی ایک نمبر ہے اور دوسرا ترکی کا ہے۔"

"تمہارے پاس موبی لنک کا کوئی نمبر نہیں ہے؟"

"نہیں تایا ابا! آپ بے شک ابا سے پوچھ لیں۔ یہ نمبر ان ہی کے نام ہے اور میں نے دوسرا نمبر رکھ کر کیا کرنا ہے؟"

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔" انہوں نے کھٹ سے فون بند کردیا۔ اس نے گہری سانس لے کر موبائل کان سے ہٹایا اور دوسرے ہاتھ سے چہرے پہ آئے بال سمیٹ کر پیچھے کیے۔

تو ارم فرقان اصغر پکڑی گئی تھی۔

"میری ارم بھی تو ہے مجال ہے جو نا سر ڈھکے کبھی

گھر سے نکلی ہو۔"

وہ ارم کے لیے متاسف بھی تھی اور فکر مند بھی، مگر دور اندر دل کے اس پوشیدہ خانے میں جو کوئی شخص دنیا کو نہیں دکھاتا، اسے تھوڑی سی کمینی سی خوشی بھی ہوئی تھی۔

"بہت اچھا ہوا تایا ابا!" اس دور کے خانے میں کسی نے کہا تھا۔ "اب تو آپ کو بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلیاں اٹھانے والے لوگوں کے اپنے گھروں پہ وہ انگلیاں لوٹ کر آتی ہیں۔ بہت اچھا ہوا تایا ابا!"

صبح سویرے اٹھتے ہی وہ اسی کرتے "ٹراؤزر پہ ایک ڈھیلا ڈھالا سا سوئیٹر اور شال لپیٹ کر "دیا" اسٹور آ گئی۔ بال اس نے اب کیچر میں باندھ لیے تھے اور بند جوتے پہن لیے تھے۔

اسٹور سے اس نے کارڈ خریدا، ری چارج کیا اور موبائل پہ اماں کا نمبر ملاتی باہر کینٹے کے برآمدے میں بچھی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے اسٹوڈنٹس صبح صبح ادھر ناشتا کرنے آتے تھے۔ سامنے سبا نجی کا خوب صورت فوارہ نصب تھا۔ گول چکر میں مقید فوارہ جس کی پانی کی دھار بہت اوپر جا کر نیچے گرتی تھی۔

"آتی صبح صبح فون کیسے کیا، خیریت؟" فاطمہ ذرا فکر مند ہو گئیں۔

"تو کیا میں آپ کو ایسے یاد نہیں کر سکتی؟" وہ آرام دہ انداز میں ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھتی ذرا خفگی سے بولی۔

"ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہمیں عموماً "مس بیل" دیا کرتی ہیں یا پھر کسی ایس ایم ایس ویب سائٹ سے مفت کا ایس ایم ایس کر کے کال کرنے کا کہتی ہیں تو ہم کال بیک کرتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ علی الصبح خود فون کریں گی تو حیرت تو ہو گی نا!"

"بس اماں! غربت ہی اتنی ہے کیا کریں۔" وہ قینچی چپلوں میں مقید پیر جھلاتے ہنس کر بولی۔

"ہاں یورپی یونین نے وہ ہزاروں یوروز کا اسکالر شپ تو کسی اور کو دیا تھا نا۔" فاطمہ کی تشویش ختم ہو چکی تھی اور وہ اسی کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔

"وہ تو رینی ڈیز کے لیے سنبھال کر رکھا ہے۔"

"کون سے رینی ڈیز؟"

"اسپرنگ بریک" اماں اور یہاں اسپرنگ بریک کے دنوں میں خوب بارش ہوتی ہے۔ اس لیے میں اور ڈی جے اسپرنگ بریک میں پورا ترکی گھومنے کا سوچ رہے ہیں اور لگتا ہے آج کل آپ صائمہ تائی کی کمپنی میں رہ رہی ہیں، صبح ہی صبح طنز کیے جا رہی ہیں "اچھا سب کچھ چھوڑیں یہ بتائیں گھر میں سب خیریت ہے؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔"

"تایا فرقان کی طرف بھی؟" اس نے ہاتھ سے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو اس نے مینیو کارڈ پہ بنے ڈونٹ پہ انگلی رکھی، پھر انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تو وہ سمجھ کر واپس مڑ گیا۔

"ہاں کیوں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں، مگر رات تایا کا فون آیا تھا۔ اچھا آپ جا کر ان کو کہہ مت آیئے گا۔"

"تو میں کیوں کہوں گی؟" فاطمہ الٹا خفا ہو گئیں، مگر وہ جانتی تھی کہ ماؤں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ لاکھ کہو کہ نہ بتایئے گا پھر بھی اپنے اگلے پچھلے حساب چکاتے وقت کسی نہ کسی موقع پہ اس بات کو استعمال کر ہی لیتی تھیں، مگر ایک اچھی بیٹی کی طرح سے پوری بات ماں کے گوش گزار کیے بغیر ڈونٹس کہاں ہضم ہونے تھے۔ سو ساری بات دہرا دی، بس ارم کا میسج پڑھنے والا قصہ گول کر گئی۔

"اچھا، پتا نہیں، ہمیں تو کچھ نہیں پتا چلا۔" وہ کچھ دیر اسی بات پہ تبصرہ کرتی رہیں، پھر ایک دم یاد آنے پہ بولیں۔ "تو میں بتانا ہی بھول گئی، مہوش کی شادی طے ہو گئی ہے۔" انہوں نے زاہد چچا کی بیٹی کا نام لیا، جس کی نسبت کافی عرصے سے اپنے ماموں زاد سے طے تھی۔

"اچھا، کب؟" اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ترکی آتے وقت سنا تو تھا کہ اپریل کی کوئی تاریخ رکھیں گے، مگر اسے بھول گیا تھا۔

"ہفتہ ہو گیا ہے رکھے ہوئے، جب بھی بات ہوتی ہے، بتانا بھول جاتی ہوں۔" پھر انہوں نے جو تاریخ بتائی وہ اپریل میں ان کی اسپرنگ بریک کے درمیان آتی تھی۔

"تب تو ڈی جے اور میں عظیم ترکی کی سیر کر رہے ہوں گے۔"

"سبین کو بلایا تو ہے، مگر کہہ رہی تھی کہ سکندر بھائی کی طبیعت آج کل خراب رہتی ہے، وہ نہیں آسکے گی، میں نے کہا جہان کو بھیج دو، اچھا ہے ساتھ حیا بھی آ جائے گی، دونوں شادی اٹینڈ کر لیں گے، مگر وہ کہہ رہی تھی کہ مشکل ہے۔"

اس نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا، اور پھر ہنس دی۔ اماں بھی کبھی کبھی لطیفے سناتی تھیں۔ وہ انتہائی غیر رومانٹک سے ماں، بیٹا کہاں مانتے ایسے رومانٹک ٹرپ کے لیے؟

اس نے سر جھٹک کر موبائل کان سے لگایا۔ فاطمہ کہہ رہی تھیں۔ "ایک تو تمہاری پھپھو بھی کوئی بات غیر مبہم نہیں کرتیں۔"

"بالکل!" اس نے تائید کی۔

ویٹر نے چاکلیٹ اور رنگ برنگے دانوں سے سجے دو ڈونٹس پلیٹ میں میز پہ رکھے تو وہ الوداعی کلمات کہنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟"

اس روز وہ شام میں جلدی سو گئی تھی، سو عشاء کے بعد آنکھ کھلی۔ کچھ دیر پڑھتی رہی، پھر ہوسٹل سے اسکائپ ـــــــ پہ گھنٹہ بھر باتیں کیں اور اسے ترکی کا سفر نامہ سنا کر خوب بور کیا اور اب بھوک لگی تو کچن میں آئی تھی۔ ڈی جے نے آلو مٹر بنایا ہوا تھا جو سالن کم اور کوئی گدلا پانی زیادہ لگ رہا تھا، جس میں مٹر اور پیاز تیر رہے تھے۔ وہ ناک چڑھاتے ہوئے اس ملغوبے کو گرم کرنے کے لیے پلیٹ میں ڈال ہی رہی تھی کہ ڈی جے نے پیچھے سے آ کر بتایا کہ اس نے ہالے اور انجم باجی کے ساتھ بیوک ادا جانے کا پروگرام بنا لیا ہے اور کل صبح چھ بجے کی گورسل شٹل پکڑنی ہے۔

"بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟" وہ اوون کا دروازہ بند کرتی چونک کر پلٹی۔ پل بھر میں اس کی آنکھوں میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

"ہالے اور انجم باجی نے پروگرام بنا کر مجھ سے پوچھا تو میں نے ہامی بھر لی۔" پانی کی بوتل کو کھڑے کھڑے منہ سے لگاتے ہوئے ڈی جے نے شانے اچکائے۔

"اور یقیناً میری طرف سے بھی بھر لی ہو گی۔"

"بالکل!"

"میں کوئی نہیں جا رہی بیوک ادا، میری طرف سے انجم باجی کو انکار کر دو۔" وہ پلٹ کر چیزیں اٹھا نیچے کرنے لگی۔ انداز میں واضح جھنجلاہٹ تھی۔

"کیوں؟ اتنا تو خوب صورت جزیرہ ہے۔"

"مجھے نہیں جانا ادھر، بس کہہ دیا نا۔" وہ ریفریجریٹر کا اوپری فریزر کھولے چند پیکٹ ادھر ادھر کرنے لگی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا اس کی گردن کی پشت پہ جھول رہا تھا۔

"مگر کیوں؟"

"وہ عبدالرحمٰن پاشا کا جزیرہ ہے اور میں اس آدمی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے روٹیوں کا پیکٹ نکال کر فریزر کا دروازہ زور سے بند کیا۔ پیکٹ میز پہ رکھا۔ جمی ہوئی دو روٹیاں نکالیں، اور پلیٹ میں رکھیں۔ ان میدے کی بنی ترک روٹیوں کا نام انہیں معلوم نہیں تھا۔ بس "دیا" اسٹور پہ وہ فریزر میں نظر آئی تھیں اور اتنی سمجھ تو انہیں تھی کہ انہیں مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھاتے ہیں، تب سے وہ یہی روٹیاں کھا رہی تھیں۔

ڈی جے اس کے روٹی اوون میں رکھنے تک سکتے سے باہر آ چکی تھی۔

"عبدالرحمٰن پاشا؟ وہ جس کا ذکر ہماری ہوسٹ آنٹی نے کیا تھا؟"

"ہاں وہی گر ـــــ اسمگلر!"

"مگر اس کا کیا ذکر؟ ہالے نے کہا تھا۔"

"ہالے کو چھوڑو' میں سب بتاتی ہوں' پہلے کیچپ لاؤ' پھر انجم باجی کو کال کر کے کل کا پروگرام کینسل کرو۔"

کھانا کھا کر وہ دونوں باہر آ گئیں۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ دونوں نے اونی سویٹرز پہن رکھے تھے۔ وہ ڈورم بلاک سے نکل کر باتیں کرتے سبزہ زار پہ ــــ چلتی گئیں۔ پہلے ڈی جے نے انجم باجی کو فون کر کے معذرت کی اور جب اسے لگا کہ وہ ذرا ناراض ہو گئی ہیں' کیونکہ ان دونوں نے خاصی پاکستانی حرکت کی تھی اور ترکی میں کمٹمنٹ توڑنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ سو اس پاکستانی حرکت کو سنبھالنے کے لیے حیا نے فون لے لیا اور انہیں بتایا کہ اس کی پھپھو نے کل اسے اور اس کی فرینڈز کو اپنے گھر انوائٹ کیا ہے۔ سو انجم باجی اس کی دعوت قبول کر کے ان کے ساتھ چلیں' یوں ادا پھر کسی روز چلے جائیں گے۔ یوں انجم باجی مان گئیں اور اب وہ دونوں چلتے چلتے "دیا" اسٹور کے سامنے والے فوارے کی منڈیر پہ آ بیٹھی تھیں۔ فوارے کا پانی چھینٹے اڑاتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور اس پانی میں بنتے مٹتے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے حیا نے ساری کہانی الف تا یے اس کو سنا ڈالی۔

ڈی جے کتنی دیر تو چپ بیٹھی رہی' پھر آہستہ آہستہ سوچ کر کہنے لگی۔

"تو وہ پنکی میجر احمد تھا' جو ہمیں مارکیٹ میں ملا تھا؟"

"بالکل!"

"اور ڈولی اصلی خواجہ سرا تھا؟"

"ہاں' وہ ان کا پرانا ملازم ہے۔"

"اور تم منہ اٹھا کر اس کے گھر میں چلی گئیں؟"

"منہ اٹھا کر کیا! میرا پاسپورٹ تھا اس پرس میں اور اچھا ہی ہوا' ساری بات تو کلیئر ہو گئی۔" وہ اپنی غلطی مانتی' یہ ناممکن تھا۔

"مگر تم نے اسے فون کر کے بہت غلطی کی ہے۔"

"تو بھگت رہی ہوں نا وہ غلطی۔ اس ظالم شخص نے یہ نہیں سوچا کہ جہان کے پاس اس ریسٹورنٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس نے اسی کو ایسے تباہ برباد کر دیا۔ اب یقیناً" وہ اس کی لینڈ لیڈی کو شہہ دے گا کہ وہ ریسٹورنٹ واپس حاصل کر لے۔" وہ سخت نادم تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' وہ تم سے واقعی محبت کرتا ہے؟"

"کسی کو اذیت پہنچانا محبت نہیں ہوتی۔"

کچھ دیر وہ یوں ہی اسی بات کو ہر پہلو سے ڈسکس کرتی رہیں' پھر ڈی جے نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔

"ایک بات تو طے ہے' اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اب تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"ہوں!" وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔ رات بہت بیت چکی تھی' اب ان کو واپس جانا تھا۔

سبزہ زار پہ چلتے ڈورم بلاک کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے مسئلے کسی کو بتانے سے وہ حل نہیں ہوتے۔ دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرتے کرتے بعض دفعہ ہم اپنی ذات کو ہی دوسرے کے سامنے ہلکا کر دیتے ہیں۔ پریشانیاں بتانے سے کم ہو سکتی ہیں' ختم نہیں' جیسے اس کی پریشانی ابھی تک اس کے ساتھ تھی۔

☼ ☼ ☼

کلاس روم کی کھڑکیوں سے سورج کی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ صبح کی نم ہوا بار بار شیشوں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی' جیو انفارمیشن تیم کے پروفیسر اپنے مخصوص انداز میں لیکچر دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی ڈی جے بظاہر بہت توجہ سے لیکچر سنتی رجسٹر پہ لکھ رہی تھی۔ وہ ہر چند لفظ لکھ کر سر اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی' ذرا غور سے ان کے اگلے الفاظ سنتی اور پھر سمجھ کر سر ہلاتی دوبارہ لکھنے لگ جاتی۔

حیا نے ایک نگاہ اس کے رجسٹر پہ ڈالی۔ وہاں اس کا چلتا قلم لکھ رہا تھا۔

"تم لوگوں کا اسپرنگ بریک کا کیا پروگرام ہے؟ کدھر جاؤ گے اور کون کون تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟" آخری لفظ لکھ کر اس نے گردن سیدھی کر کے پورے اعتماد سے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے رجسٹر دائیں جانب بیٹھے معتصم کو پاس کر دیا۔ یہ ان کی اور فلسطینیوں کی واحد مشترکہ کلاس تھی۔

معتصم نے ایک نگاہ کھلے رجسٹر پہ ڈالی' اور پھر سر جھکا کر کچھ لکھنے لگا۔ جب رجسٹر واپس ملا تو اس پہ انگریزی میں لکھا تھا۔

"ہم ترکی کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔ سات دن میں سات شہر۔ ہم پانچوں اور ٹالی اور تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"اف پھر یہ ٹالی!" ڈی جے کوفت سے جواب لکھنے لگی۔

"ہم بھی سات دنوں میں سات شہر گھومنے کا سوچ رہے ہیں۔"

اس نے رجسٹر آگے پاس کر دیا اور پھر ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

معتصم اب صفحے پہ چند الفاظ گھسیٹ رہا تھا۔

"تو ہمارے ساتھ چلو نا۔"

"تم لوگوں کو کب نکلنا ہے؟"

"پہلی چھٹی والے دن۔"

"ہم نے دوسری چھٹی پہ نکلنا ہے' سو تمہارے ساتھ مشکل ہو گا۔ چلو پھر چھٹیوں کے بعد ملیں گے۔"

"نو پرابلم!" ساتھ میں معتصم نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بنایا۔

حیا دانت پہ دانت جمائے بمشکل جمائیاں روکنے کی سعی کر رہی تھی۔ اسے ان کی کلاس سے زیادہ بورنگ کوئی کلاس نہیں لگتی تھی۔

دفعتاً" معتصم نے رجسٹر ڈی جے کی جانب بڑھایا تو اس پہ لکھے الفاظ کو پڑھ کر ڈی جے نے رجسٹر حیا کے سامنے رکھ دیا۔ حیا نے ذرا سی گردن جھکا کر دیکھا۔ اوپر اس نے انگریزی میں لکھا تھا۔ "ٹرانسلیٹ ان اردو پلیز۔" اس کے نیچے عربی عبارت لکھی تھی۔ "کیف حالک؟"

حیا نے قلم انگلیوں کے درمیان پکڑا اور اردو ہجوں میں لکھا۔

"آپ کا کیا حال ہے؟" اور رجسٹر واپس کر دیا۔ معتصم اور حسین کو آج کل ڈی جے سے اردو الفاظ سیکھنے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔ اس کلاس میں وہ یوں سارا وقت عربی الفاظ لکھ لکھ کر ان کو دیتے تھے۔

چند لمحوں بعد اس نے پھر صفحہ حیا کے سامنے کیا۔ اب کے اس پہ لکھا تھا "حالی بخیر"

حیا نے جھٹ نیچے لکھا۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اور آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔"

"اتنا لمبا کیوں لکھا؟" ڈی جے نے حیرت سے سرگوشی کی۔

"اگر چھوٹا لکھتی تو یہ فوراً" ہی اسے سیکھ کر مجھ سے آج ہی کی تاریخ میں پوری فیروز اللغات لکھواتا۔ اب اچھا ہے نا' پورا دن "ٹھیک" پڑھنے میں گزار دے گا۔"

اور معتصم نے کلاس کے اختتام تک "ٹھیک ہے" ٹھیک ہے نہیں پڑھا گیا۔

کلاس ختم ہوئی تو وہ واپس ڈورم میں آئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہونے میں بھی کافی وقت لگ گیا۔ اس نے ایک مور پنکھ کے سبز رنگ کا پاؤں کو چھوتا فراک پہنا۔ فراک کی آستین تنگ چوڑی دار تھیں' اور نیچے پاجامہ تھا۔ پورا لباس بالکل سادہ تھا۔ بال اس نے کھلے چھوڑ دیے' اور کاجل اور نیچرل پنک لپ اسٹک لگا کر ڈی جے کی طرف پلٹی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

ڈی جے' بالوں میں برش کر رہی تھی' اس نے رک کر اسے دیکھا۔

"بالکل پاکستان کا جھنڈا۔"

"دفع ہو جاؤ۔"

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دونوں' انجم باجی اور ہالے کے ساتھ جہانگیر میں واقع پھپھو کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔

"پھپھو کو بتا تو دیا تھا نا؟ یہ نہ ہو کہ وہ کہیں میں نے تو انوائٹ ہی نہیں کیا تھا۔"

"ہاں ہاں بتا دیا تھا۔" اس نے سرگوشی میں ڈی جے سے کہتے ہوئے ڈور بیل بجائی۔ پھپھو ان سے بہت تپاک سے ملیں۔ لونگ روم میں بیٹھنے تک ہی تعارف کا مرحلہ تمام ہو گیا۔

"حیا! آج تو تم نے گھر میں رونق کر دی ہے۔" وہ واقعتاً بہت خوش تھیں۔ حیا ان کے گھر کو اپنا سمجھ کر دوستوں کو ساتھ لائی ہے، یہ خیال ہی ان کو بے حد مسرت بخش رہا تھا۔

وہ ان دو ماہ میں چند ایک بار ہی پھپھو کے گھر آئی تھی اور پہلی دو دفعہ کے بعد جہان بھی گھر نہیں ملا تھا، نہ ہی وہ اسے بتا کر آئی تھی۔ اس دفعہ تو اس نے بالکل بھی نہیں بتایا۔ وہ اندر ہی اندر خود کو اس کا مجرم سمجھ رہی تھی، اس کے ٹوٹے بکھرے ریسٹورنٹ کو یاد کر کے وہ اندر ہی اندر خود کو ملامت کرتی تھی۔

"آپ کا گھر بہت پیارا ہے آنٹی!" انجم باجی نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ستائشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور یہ رگز تو بہت ہی پیارے ہیں۔" ہالے نے فرش پہ بچھے رگز کی جانب اشارہ کیا۔

"اور میری پھپھو بھی بہت پیاری ہیں۔" وہ پھپھو کے شانوں کے گرد بازو حمائل کیے مزے سے بولی تو پھپھو ہنس دیں۔ ڈی جے نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ "اور پھپھو کا بیٹا بھی بہت پیارا ہے۔"

حیا نے زور سے اس کا پاؤں دبایا۔ وہ بس "سی" کر کے رہ گئی۔

"چلو تم لوگ ادھر بیٹھو، میں بس ابھی آئی۔" اچھے میزبانوں کی طرح پھپھو مسکرا کر کہتے ہوئے راہداری کی طرف مڑ گئیں۔ جس کے دوسرے سرے پہ کچن تھا۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا سو صوفوں پہ بیٹھے ہوئے انہیں کچن کا آدھا حصہ نظر آتا تھا۔

"پھپھو!" وہ ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"ارے! تم کیوں آ گئیں؟ ان کو کمپنی دو نا۔" وہ فریزر سے کچھ جمے ہوئے پیکٹ نکال رہی تھیں۔

"وہ ایک دوسرے کو کافی ہیں۔ آپ سنائیں! انکل اوپر ہیں؟ میں نے سوچا ان سے مل لوں۔ جب بھی آتی ہوں، عموماً ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے۔ ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔" وہ یہ تو نہیں کہہ پائی کہ جب بھی وہ آئی تھی، پھپھو ان کو دوا دے کر سلا دیتی تھیں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔

"ہاں! شاید جاگے ہوئے ہوں۔ تم اوپر دیکھ لو۔"

"اچھا۔ اور... جہان کے ریسٹورنٹ کا کیا بنا؟ کچھ لوگوں نے نقصان کر دیا تھا شاید۔" ذرا سرسری انداز میں پوچھا۔

"ہاں! اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا اس کا۔ کافی چڑچڑا رہنے لگا ہے اس دن سے۔ بس دعا کرنا۔" وہ پرملال لہجے میں کہتے ہوئے کیبنٹ سے کچھ نکال رہی تھیں۔

وہ واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے پھپھو کے گھر کی آرائش پہ تبصرہ کر رہی تھیں، جبکہ انجم باجی بہت غور سے ٹی وی پہ کارٹون نیٹ ورک دیکھ رہی تھیں۔ جس کے کارٹون ترکی میں ڈب کیے گئے تھے۔ سبانجی میں جو واحد شے دیکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ ٹی وی تھا۔

ان کو مصروف پا کر وہ زینہ چڑھنے لگی۔ کندھے سے لٹکتے شیفون کے سبز دوپٹے کا کنارہ زینوں پہ پھسلتا اس کے پیچھے اوپر آ رہا تھا۔

سکندر انکل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہولے سے انگلی کی پشت سے دستک دی، پھر ڈور ناب گھما کر دروازہ دھکیلا۔

کمرے میں نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ باہر دھوپ تھی مگر بھاری پردوں نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ سکندر انکل بستر پہ لیٹے تھے، گردن تک کمبل ڈالا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

"انکل؟" اس نے ہولے سے پکارا۔ وہ ہنوز بے حس و حرکت پڑے رہے۔ وہ چند لمحے تاسف سے ان کا پژمردہ بیمار وجود دیکھتی رہی، پھر ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

وہ سیڑھیوں کے وسط میں تھی، جب بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے رُک کر دیکھنے لگی۔ صوفوں پہ آرام سے بیٹھی لڑکیاں بھی تیر کی طرح سیدھی ہوئی تھیں۔

دروازہ کھول کر جہان اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے بازو پہ کوٹ ڈالے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، ہلکی گرے شرٹ کی آستین کہنیوں تک موڑے وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ پہلے سے کمزور، اور مرجھائی ہوئی رنگت۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا تو ایک دم ٹھٹک کر رکا۔

"السلام علیکم!" وہ جو سیڑھیوں کے وسط میں کھڑی تھی، سلام کر کے زینے اترنے لگی۔ جہان نے چونک کر سر اٹھایا، پھر اسے دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

"پھپھو سے ملوانا تھا اپنی فرینڈز کو۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" بغیر کسی مسکراہٹ کے اس نے کھڑے کھڑے مروتاً کہا، اور جواب کا انتظار کیے بغیر ان ہی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ؟" انجم باجی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پھپھو کا بیٹا، جہان۔" وہ قدرے خفت سے تعارف کرواتے ہوئے آخری زینہ اتر کر صوفے پہ آ بیٹھی۔

وہاں سے کچن کا آدھا منظر دکھائی دیتا تھا۔ جہان کا کوٹ راہداری میں لگے اسٹینڈ پہ لٹکا تھا، اور بریف کیس کاؤنٹر پہ۔ وہ خود بھی کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا پانی کی بوتل منہ سے لگائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ساتھ ہی پھپھو کیبنٹ سے کچھ نکالتی دکھائی دے رہی تھیں۔

گھر چھوٹا تھا اور راہداری مختصر، سو کچن میں گفتگو کرتے افراد کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

"تنے جلدی؟" وہ بوتل رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"حمن سمی۔" جواباً وہ ذرا اکھڑے انداز میں درشتی سے ترک میں کچھ بولا تو ڈی جے سے کچھ کہتی ہالے نے چونک کر کچن کی طرف دیکھا۔

"جہان!" پھپھو نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔ اس نے جواب میں خاصی تلخی سے کچھ کہتے ہوئے بوتل میز پہ رکھی۔

ہالے نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ حیا اس کے چہرے کے الجھے تاثرات بغور دیکھ رہی تھی، وہ کچھ دیر بعد ذرا سوچ کر بولی۔

"حیا! استقلال اسٹریٹ میں آج Levi's پہ سیل لگی ہے، وہ چیک نہ کر لیں؟"

اٹھنے کا ایک بہانہ۔ حیا گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔ ڈی جے اور انجم باجی بھی کچھ کچھ سمجھ پا رہی تھیں۔

"ہاں! چلو میں ذرا پھپھو کو بتا دوں۔" وہ کچن کی طرف آ گئی۔ باقی لڑکیاں صوفوں سے اپنے اپنے بیگ اٹھانے لگیں۔

"اچھا پھپھو! ہم لوگ چلتے ہیں۔ ہمیں آگے شاپنگ پہ جانا ہے۔" کچن کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس نے جہان سکندر کو قطعاً نظرانداز کرتے ہوئے بتایا۔ وہ فریج کا دروازہ کھولے کھڑا کچھ نکال رہا تھا۔

"ارے! ابھی تو آئی تھیں۔ ابھی سے جا رہی ہو؟" پھپھو ایک ملامت زدہ نگاہ جہان پہ ڈال کر تیزی سے اس کی طرف آئیں۔ پھر وہ اصرار کرتی رہیں مگر وہ نہیں رکی۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ بہت خوش دلی سے ان کو خدا حافظ کر کے باہر نکلی۔

ڈور میٹ پہ رکھے اپنے جوتوں میں پاؤں ڈالنے تک اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سپاٹ سی سختی لے لی تھی۔ وہ ان چاروں کے آگے خاموشی سے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ جب وہ کالونی کا موڑ مڑ کر دوسری گلی میں داخل ہوئیں تو وہ تیزی سے ہالے کی جانب گھومی۔

"ہالے! جہان نے پھپھو سے کیا کہا تھا؟"

"جانے دو حیا!" ہالے نے نگاہیں چرائیں۔ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ قدرے پھیکا سا

تھا۔

"ہالے! مجھے بتاؤ اس نے کیا کہا تھا۔"

"حیا! وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہو گا۔ تم چھوڑو اس قصے کو۔"

"ہالے نور چولک لو! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے کندھوں سے پکڑ کر ہالے کو جھنجوڑتے ہوئے اس کا پورا نام لیا۔ (چولو یعنی کہ اس گاؤں کی ہالے نور)

"اچھا! ٹھیک ہے پھر سنو۔ اس نے پہلے پوچھا کہ یہ کب آئی ہیں، پھر کہا کہ ان کے لیے اتنا پھیلاوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر اس نے کہا کہ میں سارا دن کتوں کی طرح اس لیے نہیں کماتا کہ آپ یوں ضائع کردیں۔"

اس کے کندھوں پہ رکھے حیا کے ہاتھ نیچے جاگرے۔ بہت آہستہ سے وہ پلٹ گئی۔

"حیا۔ چھوڑ دو!" انجم باجی نے پیچھے سے کندھا تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

"چھوڑ ہی تو دیا ہے۔ آج کے بعد میں کبھی پھپھو کے گھر قدم نہیں رکھوں گی۔ میں اتنی ارزاں تو نہیں ہوں کہ میرے مغرور رشتہ دار میری یوں توہین کریں۔"

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیدھ میں دیکھتے ہوئے ان کے آگے چلتی جارہی تھی۔ آج اس کا دل بہت بری طرح دکھا تھا۔

✡ ✡ ✡

رات سبانجی کے گرد و نواح پہ اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ سبزہ زاروں پہ جمی برف اب پانی بن کر جھیل میں بہتی تھی۔ بہار کی تازہ ہوا ہر سو پھول کھلا رہی تھی۔ ڈورم بلاکس کی چوکور کھڑکیاں باہر سے روشن دکھائی دیتی تھیں۔ رات بیت چکی تھی، مگر ہاسٹل جاگ رہا تھا۔ اسپرنگ بریک شروع ہونے میں چند دن ہی تھے اور چھٹیوں سے پہلے یہ ان کی ڈورم میں آخری راتیں تھیں۔ پھر باری باری سب کو اپنے اپنے

ٹور پہ نکل جانا تھا۔

خدیجہ، حیا، ٹالی اور چیری کے ڈورم میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ حیا کی کرسی پہ سوئٹزرلینڈز کی سارہ ایکسٹینشن کا ریسیور کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ مسکراہٹ دبائے، انگلی پہ سنہری بالوں کی لٹ لپیٹتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"میرا فیورٹ کلر تو بلیو ہے۔ اوہ! تمہارا بھی یہی ہے مومن؟" وہ کہنے کے ساتھ بمشکل ہنسی روکے ہوئے تھی۔ مومن کافی دنوں سے اس کی توجہ لینے کی کوشش کررہا تھا، مگر وہ اس کو دکھانے کے لیے ہالینڈ کے لطیف کے ساتھ نظر آتی تھی۔ لطیف خالص ڈچ اور کیتھولک تھا، مگر افغانستان میں پیدا ہونے کے سبب اس کے ماں باپ نے اس کا نام اپنے کسی افغان دوست لطیف کے نام پہ رکھا تھا۔ یوں وہ تمام فلسطینیوں کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا، سوائے مومن کے۔

سامنے ڈی جے کی کرسی پہ ہالے بیٹھی تھی اور اس کے مقابل کاؤچ پہ اسپین کی سینڈرا تھی۔ وہ دونوں اپنے درمیان ایک میگزین کھولے تبصرہ کررہی تھیں۔

"اس تھیم کے ساتھ یہ کنٹراسٹ کچھ اوور لگے گا۔۔۔ نہیں؟" ہالے متذبذب سی سینڈرا سے پوچھ رہی تھی۔

چیری اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی اپنی kipoa آئل کی آدھی شیشی ان کو دکھاتے ہوئے بار بار نفی میں سر ہلاتے ہوئے "آئی ڈونٹ بلیو دس!" کہے جارہی تھی۔ کسی لڑکی نے باتھ روم میں رکھا اس کا تیل استعمال کرکے اوپر چٹ لگا کر معذرت کرلی تھی کہ "چونکہ میں جلدی میں ہوں، سو پوچھ نہیں سکی۔" اور چیری کو جب سے ان چند بوندوں کا غم کھائے جارہا تھا۔

"ان چینیوں کے دل بھی اپنے قد کی طرح ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور پست۔"

ٹالی جو اوپر اپنے بینک پہ بیٹھی حیا کو اسرائیلی نامہ سنا رہی تھی لمحہ بھر کو بات روک کر چیری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر سر جھٹک کر بات کا وہیں سے آغاز کیا جہاں

چھوڑی تھی۔

"یو نو۔۔۔ ان اسرائیل، وی ہیو چ سٹرس ٹرسٹ۔۔۔"

ٹالی کے نزدیک دنیا کا سب سے رسیلا پھل اسرائیل کا تھا، سب سے میٹھا پانی، سب سے خالص شہد، سب سے خوشبودار پھل اور سب سے سہانا موسم اسرائیل کا تھا۔ وہ کہتی تھی "اسرائیل جنت ہے۔ مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔" اور اس کے جاتے ہی حیا اور ڈی جے اس کے فقرے میں یوں ترمیم کرلیتیں کہ "فلسطین جنت ہے۔ مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔"

اب بھی حیا بہت انہماک سے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ جو بھی تھا، اسرائیل نامہ سننے میں مزا بہت آتا تھا۔

دھیمی آواز میں بات کرنے کے باوجود ان سب کی آوازوں نے مل کر شور کر رکھا تھا اور اس سارے شور میں ڈی جے اپنے بینک کے اوپر بستر میں لیٹی تکیہ منہ پہ رکھے ہوئے تھی۔

ان کی آوازیں بلند ہوتی گئیں تو اس نے منہ سے تکیہ ہٹایا اور چہرہ اوپر کرکے بے زاری سے ان کو مخاطب کیا۔

"پلیز! شور مت کرو۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے سونے دو۔"

"او کے او کے!" ہالے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ سب نے "شش شش" کرکے ایک دوسرے کو چپ کروایا اور دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹوں میں بولنے لگیں۔

ڈی جے واپس لیٹ گئی اور تکیہ منہ پہ رکھ لیا۔

"ہاں چاند۔۔۔ میں چاند کو ہی دیکھ رہی تھی۔" سارہ جو اپنی لٹ کو انگلی پہ مروڑتے، مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، دوسری طرف کچھ سن کر ذرا گڑبڑائی۔ "اچھا! آج چاند نہیں نکلا؟ اوہ۔۔۔ میں نے شاید پھر اپنے تصور میں دیکھا تھا۔"

"مجھے یہی کلر اسکیم چاہیے اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ پھول کرلیں تو وہ میچ کرجائیں گے، پھر یہ رنگ۔"

سینڈرا میگزین کے صفحے کو پلٹ کر پیچھے سے کوئی دوسرا صفحہ نکال کر ہالے کو دکھانے لگی۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں پھر سے بلند ہونے لگیں۔

چند ثانیے بعد ڈورم میں پھر سے شور مچا تھا۔

"کین یو ون پلیز شٹ اپ؟" ڈی جے ضبط کھو کر اٹھی اور زور سے چلائی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں میں کئی دفعہ ان کو خاموش ہونے کو کہہ چکی تھی، مگر بار بار لڑکیوں کی آوازیں بلند ہوجاتی تھیں۔ لیکن اس کے یوں چلانے پر ایک دم سے ڈورم میں آوازیں فوراً بند ہوگئیں۔

"بس! تم آرام کرو۔ ہم چپ ہیں۔ اب سب آہستہ بولو، اچھا!" حیا نے جلدی سے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے واپس لیٹ گئی اور کمرے میں سب مدھم سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

چند پل مزید سرکے، پھر۔۔۔

"اسرائیل میں ہمارا مقدس درخت۔۔۔" سب سے پہلے ٹالی کی آواز بلند ہوئی تھی، پھر سارہ، پھر ہالے، اور پھر چیری جو ابھی تک سب کو متوجہ کرنے کی سعی کرتے ہوئے انہیں بوتل دکھا رہی تھی۔

"مطلب، یہ کہاں کی اخلاقیات ہیں کہ کسی کا تیل اس سے پوچھے بغیر استعمال کرلیا جائے۔" شور واپس لوٹ رہا تھا۔

ڈی جے ایک دم اٹھی، کمبل اتار کر پھینکا، بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اتری۔ اپنی میز پہ رکھا سوئیٹر گردن میں ڈالا، ساتھ رکھی تین کتابیں اٹھائیں، تہہ کردہ عینک کھول کر آنکھوں پہ لگائی اور خاموشی سے کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ اس نے اپنے پیچھے دھڑام سے دروازہ بند کیا تھا۔

ڈورم میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

سارہ نے بنا کچھ کہے ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا۔ چیری نے خفت سے اپنی بوتل واپس بیگ میں رکھی۔ ہالے اور سینڈرا نے میگزین بند کردیا۔ بہت سی نادم نگاہوں کے تبادلے ہوئے۔

"وہ ناراض ہو گئی ہے' اب کیا کریں؟" ہالے بہت آہستہ سے بولی۔

"ٹھہرو! میں اسے مناتی ہوں۔" حیا نے کمبل پرے ہٹایا اور بنک کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ میز پہ رکھا اپنا دوپٹا اٹھایا اور چپل پہنتے ہوئے باہر نکل گئی۔ پیچھے کمرے میں ابھی تک سناٹا چھایا تھا۔

✱ اسٹڈی ساتھ ہی تھی۔ اسے پتا تھا ڈی جے وہیں ہو گی۔ اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ سامنے رائٹنگ ٹیبل پہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ چوکھٹ سے اس کا نیم رخ ہی نظر آتا تھا' پھر بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کا دل ایک دم بہت زیادہ دکھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

"ڈی جے!"

خدیجہ بائیں کنپٹی کو انگلی سے مسلتے' چہرہ کتاب پہ جھکائے' آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ڈی جے! ڈی آر ریئلی سوری۔" وہ کرسی کھینچ کر اس کے ساتھ بیٹھی اور اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ ڈی جے نے سختی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اسے بے حد ملال ہوا۔

"سوری یار! ہم نے تمہارا خیال نہیں کیا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

وہ جواب دیے بنا یوں ہی کنپٹی کو انگلی سے مسلتے' کتاب پہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"سر میں درد ہے؟" اس نے ہولے سے پوچھا۔

ڈی جے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹیبلٹ لی ہے کوئی؟"

"ہاں!" وہ ہتھیلی کی پشت سے گیلے رخسار رگڑتے ہوئے بولی تو آواز بھاری تھی۔

"صرف یہ ہی بات ہے؟" اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔"

"تو رو کیوں رہی ہو؟ سمسٹر ختم ہونے کے بعد ہم نے گھر تو چلے جانا ہے نا۔"

"سمسٹر ختم ہونے میں بہت دیر ہے۔" اس نے چہرہ اٹھا کر بے چارگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"دیر کہاں؟ فروری میں ہم ادھر آئے تھے' مارچ گزر گیا' اپریل گزر جائے گا' مئی آنے والا ہے' جون میں ایگزامز ہوں گے اور جولائی میں ہم پاکستان ہوں گے۔ لو! پانچ ماہ تو ختم بھی ہو گئے۔" ڈی جے بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

"کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟"

"اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ اختتام۔۔۔ دی اینڈ۔۔۔ خلاص!" اس نے ہاتھ جھاڑ کر جیسے بات ختم کی۔

ڈی جے چند لمحے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"حیا! میں نے کل اپنی امی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بری طرح رو رہی تھیں۔ اتنی بری طرح کہ میرا دل ڈر رہا ہے۔ پتا نہیں گھر میں سب ٹھیک بھی ہیں یا نہیں۔ میں گھر کا آخری بچہ ہوں اور آخری بچوں کے حصے میں ہمیشہ بوڑھے ماں باپ آتے ہیں میرا دل ان کے لیے دکھتا ہے حیا!"

"میں سمجھ سکتی ہوں' مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تین ماہ تو ہم نے یہاں گزارنے ہیں نا۔"

"ہم پاکستان چلے جائیں؟"

"تم جانتی ہو' یہ ناممکن ہے۔ ہم نے کانٹریکٹ سائن کیا ہے۔ ہم پانچ ماہ ختم ہونے تک ترکی نہیں چھوڑ سکتے۔"

"میں مستقل جانے کی بات نہیں کر رہی۔ بس چند دن کے لیے۔ اسپرنگ بریک میں ہم اسلام آباد چلے جائیں؟"

حیا نے گہری سانس لی۔

"میری بھی کزن کی شادی ہے' مگر میں اسے قربان کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر ہم ابھی پاکستان گئے تو واپس آتے ہوئے ہمارا دل بہت خراب ہو گا اور پھر یوں ترکی میں اکیلے گھومنے پھرنے کا موقع ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔"

"اکیلے!" ڈی جے نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

"تمہیں پتا ہے ہم دونوں نے یہ اسکالر شپ پروگرام کے لیے کیوں اپلائی کیا تھا؟ کیونکہ ہم دونوں کو اکیلے آزادی سے وقت گزارنے کا شوق تھا۔ ایسی آزادی جس میں ابو اور بھائیوں کی روک ٹوک نہ ہو۔ مگر انسان آزاد تب ہی ہوتا ہے' جب وہ تنہا ہوتا ہے اور یہ ہی تنہائی قید کر لیتی ہے۔ ہر آزادی میں قید چھپی ہوتی ہے' جیسے اب ہم ترکی میں قید ہیں اور مجھے لگتا ہے ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جا سکیں گے۔"

حیا نے جیسے تاسف سے نفی میں گردن ہلائی' پھر نگاہ میز پہ رکھی ڈی جے کی موٹی سی فلسفے کی کتاب پہ پڑی جس کے سرورق پہ سقراط کی تصویر بنی تھی۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"پرے ہٹاؤ اس بڈھے بابے کو۔ اس کو پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔"

"سقراط کو کچھ مت کہو۔" ڈی جے نے تڑپ کر کتاب پیچھے کی۔ "افلاطون گواہ ہے کہ سقراط نے کس عظمت و بہادری سے زہر کا پیالا پیا تھا۔"

"میری تو سات نسلوں پہ احسان کیا تھا۔" وہ تنک کر کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "اور ہم کوئی پاکستان نہیں جا رہے۔ سات دن اور ترکی کے سات شہر۔ یہ پروگرام ہے ہمارا' ڈن؟"

"ڈن!" ڈی جے مسکرا دی۔

"اور سنو! آج ٹائم چینج ہو گیا ہے۔ گھڑی ایک گھنٹہ آگے کر لو۔"

وہ ڈی جے کو نارمل ہوتا دیکھ کر ٹالی کا اسرائیل نامہ سننے واپس چلی گئی۔

"اوہ! نہیں' یہاں بھی وہی مشرف والا نیا ٹائم' پرانا ٹائم!" ڈی جے نے جھنجلاتے ہوئے کتاب کھول لی۔ اسے نئے ٹائم' پرانے ٹائم سے زیادہ کوفت کسی شے سے نہیں ہوتی تھی۔

✡ ✡ ✡

تاقسم اسکوائر کا مجسمہ آزادی بہار کے پھولوں کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور مجسمے کے گرد دائرے میں اگی گھاس پہ سرخ ٹیولپس کھلے تھے۔ فضا میں تازہ کچے پھلوں کی رسیلی مہک تھی۔

وہ دونوں اس ٹھنڈی میٹھی ہوا میں ساتھ ساتھ چلتی' استقلال اسٹریٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دونوں نے سیاہ کوٹ پہن رکھے تھے اور بازو میں بازو ڈال رکھا تھا۔ وہ اتنی دفعہ استقلال اسٹریٹ آ چکی تھیں کہ بہت سی دکانیں تو انہیں حفظ ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ آج تک اس طویل ترین گلی کے اختتام تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔

ان کے تمام دوست اور ڈورم فیلوز کل ہی اپنے ٹورز پہ نکل چکے تھے۔ انہوں نے آج سارا دن استقلال اسٹریٹ میں شاپنگ کر کے کل صبح کی بس سے Coppadocia جانا تھا۔ آج وہ خوب بھاؤ تاؤ کر کے شاپنگ کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھیں' کیونکہ ویسے بھی پاکستانی سیاحوں کے لیے ترک فوراً" نرخ کم کر دیتے تھے۔

"سات دن۔۔۔ سات شہر! کتنا مزا آئے گا نا!" ڈی جے نے چشم تصور سے خوب صورت ترکی کو دیکھتے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

"مزا تو چھوٹا لفظ ہے ڈی جے! مجھے تو خود پہ رشک آنے لگا ہے۔ کیا زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟"

وہ دونوں استقلال اسٹریٹ میں داخل ہو گئی تھیں۔ وہاں ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ دونوں اطراف میں بنے ریسٹورنٹس اور دکانوں کی رونق عروج پہ تھی۔

"ترکی کا نقشہ ہمارے پاس ہے۔ ہم روز ایک شہر جائیں گے۔ ایک رات ادھر قیام کریں گے اور پھر وہاں سے قریبی شہر کی بس پکڑ کر آگے چلے جائیں گے۔ یوں سات دنوں میں ہمارے سات شہر ہو جائیں گے۔"

"اور کسی شہر میں ہاٹ ایئر بیلون کی فلائٹ بھی لیں گے۔ کتنا مزا آئے گا حیا! جب ہم بیلون کی ٹوکری میں بیٹھے اوپر فضا میں تیر رہے ہوں گے اور پورا ترکی ہمارے قدموں تلے ہو گا۔"

وہ دونوں بہت جوش و جذبے سے منصوبے بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک طرف برگر کنگ کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ ڈی جے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"سنو حیا۔۔۔! جہان کو بھی ساتھ چلنے کو کہیں؟"

"اس کا تو نام بھی مت لو۔" وہ سیدھ میں دیکھتے ہوئے آگے چلتی گئی۔ ابھی وہ اس کے ریسٹورنٹ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

"یار۔۔۔! معاف کر دو نا وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہوگا۔"

"مگر میں اس بات پہ اپ سیٹ ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے ملنے کی۔" وہ اسے بازو سے ذرا کھینچ کر آگے لے گئی۔

"میرا میگرین سارا ٹرپ خراب کرائے گا۔ ٹیبلٹ لی تھی مگر کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔" ڈی جے کو پھر سے سر میں درد ہونے لگا۔

"اور میرا ٹرپ میرا غیر رجسٹرڈ فون خراب کرائے گا۔" اس نے کوٹ کی جیب سے ہالے کا بھدا ترک فون نکال کر مایوسی سے اسے دیکھا۔ "اس کی بیٹری جلد ختم ہو جاتی ہے' وہاں دوسرے شہروں میں پتا نہیں کیا حالات ہوں۔ میں اپنے پاکستانی فون کو رجسٹر کروا ہی لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے! مگر پہلے جوتے دیکھ لیں۔" وہ دونوں ایک شو اسٹور کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ دروازہ ذرا بھاری تھا' مشکل سے کھلا۔ حیا اچنبھے سے دروازے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ عجیب بات تھی کہ جس اگلی دکان پہ وہ گئیں' اس کا دروازہ بھی زور لگا کر دھکیلنے پہ پیچھے ہوا۔

"آج استقلال جدیسی کے دروازوں کو کیا ہوا ہے؟" ڈی جے بھی محسوس کر کے ذرا حیرت سے بولی۔

دی آورٹ کی دکان استقلال اسٹریٹ میں ذرا آگے جا کر ملی۔ وہ دونوں اکٹھی چوکھٹ تک آئیں اور لاشعوری طور پہ تیزی سے اندر آتے ہوئے ایک دم بہت زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ گلاس ڈور بے حد باریک اور نازک شیشے کا بنا تھا۔ وہ گویا اڑتا ہوا جا کر مخالف سمت میں کھڑے اسٹینڈ سے ٹکرایا۔ اور زور دار چھناکے کی آواز آئی۔ لوہے کے اسٹینڈ کا کوئی ہک نکلا ہوا تھا' اس کی ضرب زور سے لگی اور دروازے کے اوپری حصے سے شیشے کے ٹکڑے چھن چھن کرتے فرش پہ آگرے۔

وہ دونوں ایک دم ساکت سی' آدھے ٹوٹے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے نچلے دراز سے کچھ نکالتے سیلز مین نے چونک کر سر اونچا کیا۔ ٹوٹے دروازے کو دیکھ کر اس کا منہ پورا کھل گیا۔ وہ ہکا بکا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کا پے کردی؟" اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ڈی جے کا سکتہ پہلے ٹوٹا۔ وہ حیا کے قریب کھسکی اور ہولے سے سرگوشی کی۔

"حیا! اس نے ہمیں دروازہ توڑتے نہیں دیکھا۔"

"بس! ٹھیک ہے ہم مکر جاتے ہیں۔"

وہ گلا کھنکھارتے' خود کو نارمل کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنا پاکستانی فون اس کی طرف بڑھایا۔

"فون رجسٹر کروانا ہے۔"

"کا پے کردی میڈم؟" وہ فون کو دیکھے بنا ابھی تک دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے فون رجسٹر کروانا ہے۔"

"کا پے کردی؟"

"ڈی جے! یہ کیا بک رہا ہے؟" وہ کوفت سے ڈی جے کی طرف پلٹی۔

"اسے غالباً انگلش نہیں آتی اور یہ دروازے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔"

"دیکھو بھائی!" وہ آگے آئی اور کاؤنٹر پہ کہنی رکھے بڑے اعتماد سے بولی۔ "ہم نے کوئی دروازہ نہیں توڑا اور ہم نے تو تمہارا دروازہ دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"بالکل! ہم نے تو کبھی زندگی میں دروازے نہیں دیکھے۔ ہمارے ہاں گھروں میں دروازے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ لوگ کھڑکیوں سے اندر پھلانگتے ہیں۔"

مگر ان کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اب صدمے اور دکھ سے سینے پہ ہاتھ مارتے' دروازے کو دیکھتے ہوئے "اللہ اللہ" کہنے لگا۔ ترک بعض دفعہ شدید غم میں یہ ہی کرتے تھے۔

"اچھا! میرا فون تو رجسٹر کر دو۔"

لڑکا چند لمحے غمگین و کینہ پرور نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا' پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔

"پسپورت؟" (پاسپورٹ؟)

ان دونوں نے ایک دوسرے کو ذرا تشویش سے دیکھا۔

"یہ پاسپورٹ صرف فون کے لیے مانگ رہا ہے؟"

"نہیں! یہ ہمیں اندر کروائے گا۔ ڈی جے! اسے پاسپورٹ نہیں دینا ورنہ اس نے اتنا لمبا جرمانہ کروانا ہے کہ ہمارا ٹرپ کینسل ہو جائے گا۔"

"پاسپورٹ نہیں ہے ہمارے پاس!" ڈی جے نے ہاتھ ہلا کر زور سے کہا۔ وہ حیا سے چند قدم پیچھے تھی۔

"پسپورت؟" اس نے بازو بڑھائے' پھر پاسپورٹ مانگا۔

"کہا نا' نہیں ہے ہمارے پاس پاسپورٹ!" حیا جھنجلائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "پاسپورٹ کے بغیر رجسٹر نہیں کر سکتے؟ دیکھو! ہم تمہیں کچھ پیسے اوپر۔۔۔"

"امبولینس۔۔۔ امبولینس۔" وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی جب لڑکا ایک دم گھبرا کر چلا اٹھا۔ اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا' پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن موڑی۔

"حیا۔۔۔ حیا!" پیچھے کھڑی خدیجہ سر دونوں ہاتھوں میں تھامے اوندھی گرتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ تکلیف کی شدت سے دبے دبے انداز میں چلا رہی تھی۔

لڑکا بھاگ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا۔

"ڈی جے۔۔۔ ڈی جے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کی طرف لپکی۔

اس کی عینک پھسل کر فرش پہ جا گری۔ تیزی سے

اس کی طرف بڑھتے لڑکے کا جو گر اس سے آیا۔ کرچ کی آواز آئی اور ایک شیشہ دو حصوں میں بٹ گیا۔

"ڈی جے ۔۔۔ ڈی جے ۔۔۔!" وہ اس پہ جھکی دیوانہ وار اسے پکار رہی تھی۔ ڈی جے کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ساری دنیا اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال کا وہ کاریڈور سرد اور ویران تھا۔ سنگ مرمر کا فرش کسی مردے کی طرح تھا۔ سفید، بے جان، ٹھنڈا۔ وہ بنچ پہ بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ ساکت، جامد سیدھ میں کسی غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

جب سے ڈی جے آپریشن تھیٹر میں تھی، وہ یوں ہی ادھر بیٹھی تھی۔ آن ڈیوٹی ڈاکٹر نے کچھ بتایا تھا کہ خدیجہ کے برین میں Berry aneurysm تھی۔ ایک پھولی ہوئی اینورزم جو پھٹ گئی تھی۔ سب ارکنائڈ ہیمرج۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بیری اینورزم پھٹنے والے مریضوں میں سے اسی سے نوے فیصد کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کم سے کم بھی دس فیصد کی امید تھی اور وہ اسی دس فیصد کی امید کو تھام کر وہاں بنچ پہ بیٹھی تھی۔

اس کا ذہن بالکل مفلوج ہو چکا تھا، جیسے بھاری سل سے سر کو کچل دیا گیا ہو۔ پھر بھی اس نے کہیں سے ہمت مجتمع کر کے ڈی جے کے گھر والوں کو پاکستان فون کر دیا تھا۔ اس کے باپ بھائیوں کی پریشانی، ماں کے آنسو، وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے ابو ترکی آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کا بھائی جو فرانس میں مقیم تھا، وہ بھی رات تک پہنچ جائے گا۔ بس اس کی سمجھ میں یہ ہی بات آئی تھی۔ بار بار کوئی نہ کوئی اسے فون کرتا اور وہ ہر بات کے جواب میں بھیگی آواز سے اتنا ہی کہہ پاتی۔

"مجھے نہیں پتا۔ ڈاکٹر باہر نہیں آئے۔"

اب وہ یوں ہی نڈھال سی بنچ پہ بیٹھی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

دس فیصد کی امید ۔۔۔

اس نے گود میں رکھے موبائل کو دیکھا، پھر اٹھا کر کپکپاتے ہاتھوں سے پیغام لکھنے لگی۔

"میں تاقسم فرسٹ ایڈ ہاسپٹل میں ہوں۔ ڈی جے کو برین ہیمرج ہوا ہے، تم فوراً آجاؤ۔" اور جہان کو بھیج دیا۔

ان کے درمیان اگر کوئی تلخی تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔ اگر یاد تھی تو صرف اور صرف خدیجہ۔

اذان کا وقت ہوا تو وہ اٹھی اور وضو کر کے واپس ادھر آئی۔ کوٹ اس نے وہیں بنچ پہ چھوڑ دیا تھا اور اب نیلی قمیص کی آستینیں گیلے بازوؤں پہ نیچے کر رہی تھی۔ چہرہ، ہاتھ اور ماتھے سے بال بھی ویسے ہی گیلے تھے۔

"کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے۔"

"اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے ۔۔۔" چند روز قبل کی دو لڑکیوں کی گفتگو اسے یاد آئی تھی۔

وہ سلام پھیر کر تشہد کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پہ بھیگا ہوا تھا اور یہ وضو کا پانی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہتھیلیاں ملائے انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میرے اللہ ۔۔۔" وہ بے آواز رو رہی تھی۔ "آپ کو پتا ہے ڈی جے میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ میری سب سے اچھی دوست۔ ارم، زارا، ان سب سے اچھی دوست۔ آپ اسے ہم سے مت چھینیں۔ اس کے ماں باپ ۔۔۔ وہ بوڑھے ہیں، وہ مر جائیں گے آپ ہمیں ایسے مت آزمائیں۔ آپ ہمیں ڈی جے واپس کر دیں میری دس فیصد کی امید کو ہارنے مت دیں۔" وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ جھکائے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ شیفون کا نیلا دوپٹا سر سے پھسل کر گردن کی پشت تک جا گرا تھا۔

"میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں ہے سوائے آپ کے۔ میرے پاس بجانے کے لیے کوئی گھنٹی نہیں ہے، کھٹکھٹانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہے، ہلانے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میری پہلی امید بھی آپ ہیں، آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی میری مدد نہیں کر سکے گا۔ اگر آپ نے چھین لیا تو کوئی دے نہیں سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں۔"

اس کے دل پہ گرتا ہر آنسو اندر ہی اندر داغ لگا رہا تھا۔ جلتا، سلگتا ہوا داغ۔ اس کا دل ہر پل زخمی ہوتا جا رہا تھا۔

"اللہ تعالیٰ! میرے پاس کوئی نہیں ہے جس سے میں مانگ سکوں اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھے کچھ دے سکے۔ میری ایک دعا مان لیں، میں زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کروں گی۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو آپ کو راضی کرے اور راضی رکھے۔ میں آپ کو کبھی ناراض نہیں کروں گی۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں پلیز۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی اکیلی نہیں ہوئی تھی، جتنی آج تھی۔ وہ کبھی اتنی بے بس، اتنی لاچار بھی نہیں رہی تھی، جتنی اس وقت تھی۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنی گھڑیاں بیتیں، اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اندھیرا چھا رہا تھا، جب اس نے جہان کو تیز تیز قدموں سے چلتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑی بھی نہیں ہوئی، بس بنچ پہ بیٹھی گردن اٹھائے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب کیسی ہے وہ ہوا کیا تھا؟" وہ پھولی سانسوں کے درمیان کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھا۔ وہ اتنا ہی پریشان تھا، جتنی وہ۔

"بیری اینورزم پھٹ گیا تھا، جس کے نتیجے میں سب ارکنائڈ ہیمرج ۔۔۔" اسے خود جو سمجھ میں آیا تھا، وہ بتانے لگی۔ بتا کر وہ پھر سے دونوں ہاتھوں میں سر دیے رونے لگی۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی، تم ایسے مت روؤ۔ تم نے کچھ کھایا ہے؟ تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ میں کچھ لاتا ہوں۔" پھر وہ رکا نہیں۔ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ہاتھ میں سینڈوچز کا پیکٹ اور جوس کی بوتل تھی۔

"کچھ کھا لو۔" اس نے سینڈوچ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ اسی پل آپریشن تھیٹر کے دروازے کھلے۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" اسے وہیں رکنے کا کہہ کر وہ آگے گیا اور باہر آنے والے سرجن سے ترک میں بات کرنے لگا۔ وہ بے قراری سے کھڑی ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھے گئی۔

"اوکے اوکے!" سر ہلا کر بات ختم کر کے وہ واپس اس کی طرف آیا۔

"کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟ کیسی ہے ڈی جے؟"

"وہ آرام سے ہے۔ ابھی اسے شفٹ کر دیں گے مگر تم ٹھیک نہیں ہو، ادھر بیٹھو۔" اسے واپس بنچ پہ بٹھا کر اس نے سینڈوچ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ کھاؤ۔"

"او جہان! وہ ٹھیک ہے۔ میری دعا قبول ہو گئی۔" اس نے نڈھال سے انداز میں سر دیوار سے ٹکا دیا۔

"کچھ کھا لو حیا ۔۔۔!" اس کے اصرار پہ اس نے بمشکل آدھا سینڈوچ کھایا اور تھوڑا سا جوس پیا، پھر بوتل پرے ہٹا دی۔

"جہان! میری دعا رد نہیں ہوئی ۔۔۔ میں نے اتنی دعا کی تھی ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اتنی دعا کرے اور وہ پوری نہ ہو؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"حیا! تھوڑا سا اور کھا لو، ورنہ تمہاری طبیعت بگڑ جائے گی۔"

"نہیں ۔۔۔ تمہیں پتا ہے میں نے کبھی اتنے دل سے دعا نہیں مانگی جتنی آج مانگی تھی، پھر یہ کیسے ہوتا کہ وہ پوری نہ ہوتی؟" اس کی آنکھوں سے پھر سے آنسو

بہنے لگے۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اب وہ مزید کچھ نہیں کھائے گی' اسے اندازہ ہو چکا تھا۔

وہ اب سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے' بہتے آنسوؤں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے' انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور میں نے آج امید نہیں ہاری تھی جہان۔"

"مگر بعض دفعہ قسمت ہرا دیا کرتی ہے۔"

وہ بہت دھیرے سے بولا تو وہ چونکی۔ جہان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک دم اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

"جہان؟"

"حیا۔۔۔ ڈی جے کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" کاریڈور کا سناٹا یکدم سے ٹوٹا۔ پیچھے کہیں کسی اسٹریچر کے پہیوں کے چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔

وہ بنا پلک جھپکے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی عینک پہ اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ پسینے میں بھیگی ہتھیلی سے عینک کے شیشے پہ دھند چھاتی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی گیلی دھند۔

☆ ☆ ☆

"میری فرینڈز مجھے ڈی جے کہتی ہیں' لیکن چونکہ آپ میری فرینڈ نہیں ہیں' اس لیے مجھے خدیجہ ہی کہیں۔"

شام کی دھندلی سی چادر نے پورے استنبول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دوپہر میں خوب بارش ہوئی تھی اور آسمان اتنا کھل کر برسا تھا کہ لگتا تھا ساری دنیا بہہ جائے گی' سب ڈوب جائے گا۔ وہ تب سے اسی طرح پھپھو کے لاؤنج کے صوفے پہ پاؤں اوپر کر کے بیٹھی گھٹنوں پہ سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

"ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟ ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے ڈی جے کا آخری چہرہ جیسے ثبت ہو گیا تھا۔ وہ منظر یوں ہر جگہ چھایا تھا کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بے جان چہرہ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو' بند آنکھیں' اسٹریچر پہ ڈلا بے حس و حرکت وجود۔۔۔ وہ اس منظر میں مقید ہو گئی تھی۔

"ایویں برف نہ پڑے' خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں' ہمیں تو دیکھنے دیں۔"

اسی رات ڈی جے کا بھائی پہنچ گیا تھا اور دو دن تک کلیئرنس مل گئی تھی۔ آج دوپہر وہ اس کی میت لے کر پاکستان روانہ ہو گئے تھے۔ تب اسے جہان اور پھپھو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وہ اس وقت سے یوں ہی بیٹھی تھی۔ نہ کھاتی تھی' نہ کوئی بات کرتی تھی' بس روئے چلی جا رہی تھی۔ اس کا غم بہت بڑا تھا۔

"سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم سے لڑکے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔"

سارے دن میں اگر اس نے کوئی بات کی بھی تو یہ ہی تھی کہ مجھے پاکستان جانا ہے۔ میری سیٹ بک کروا دیں۔ میں نے ادھر نہیں رہنا۔"

کچن میں جہان اور پھپھو کھڑے یہ ہی بات کر رہے تھے۔ ان کی دبی دبی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں' مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی دلچسپی ہر شے سے ختم ہو گئی تھی۔

"مگر میں کیسے جا سکتا ہوں اس کے ساتھ؟"

"اور وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے؟ اسے کل سے بخار ہے۔ حالت دیکھی ہے تم نے اس کی؟ میں اسے اکیلا بھیجوں تو اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

"مگر ممی! آپ کو ابا کا پتا ہے نا؟ انہیں علم ہوا تو؟"

"انہیں یہ بتائیں گے کہ تم انقرہ تک گئے ہو۔"

"مگر ممی! میرا جانا ضروری تو۔۔۔"

"جہان سکندر! جو میں نے کہا' وہ تم نے سن لیا؟ تم کل صبح کی فلائیٹ سے حیا کے ساتھ جا رہے ہو۔"

وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ ارد گرد کیا ہو رہا تھا' اسے نہیں پتا تھا۔ اس کا دل ایسے بری طرح ٹوٹا تھا کہ ہر شے سے دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

"پاک ٹاورز' ایشیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال۔۔۔ اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے' تھوڑا سا شو مارنے میں حرج ہی کیا ہے؟"

جب پھپھو نے آ کر یہ بتایا کہ جہان اس کے ساتھ جائے گا' چاہے جتنے دن بھی لگیں' تو بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسے فی الحال جہان سکندر سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"ویسے تمہاری پھپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا وِیٹا ہے؟ تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔"

ہر چیز جیسے سلو موشن میں ہو رہی تھی۔ آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ صرف حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اتاترک ایئرپورٹ پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چل رہا تھا' مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

"رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔"

جہاز دھیرے دھیرے محو پرواز تھا۔ کھڑکی کے پار مرمرا کے سمندر پہ بادل تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نرم روئی کے گالوں کی طرح سرمئی بادل۔ ان میں اتنا پانی لدا تھا جتنا اس کی آنکھوں میں تھا' یا شاید اس کے آنسو زیادہ تھے۔

"اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں' یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔"

اس نے خود کو ایئرپورٹ پہ ابا کے سینے سے لگتے' بے تحاشا روتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ ایسا کہ بس اب وہ ان کے پاس رہے گی' اب وہ اس کو واپس نہیں بھیجیں گے۔

"چیزیں وقتی ہوتی ہیں' ٹوٹ جاتی ہیں' بکھر جاتی ہیں' رویے دائمی ہوتے ہیں' صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجربریڈ ہاؤس سے ہار مان لی؟"

وہ اماں کے ساتھ ڈی جے کے گھر میں تھی۔ وہاں ہر طرف کہرام مچا تھا۔ اس کی امی اور بہنوں کا بلک بلک کر رونا' ماتم' بین' سسکیوں کی آوازیں' چیخیں۔۔۔ جوان موت تھی اور گویا پوری دنیا ادھر اکٹھی ہو گئی تھی' وہ کسی کو دلاسا نہ دے سکی' بس ایک کونے میں بیٹھی بے آواز روتی گئی۔

"اچھا پھر سوچ لو۔۔۔ وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟"

نماز جنازہ پچھلے روز ہی ادا کی جا چکی تھی مگر غم ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔ خدیجہ کی بہنیں اس سے اس کے بارے میں پوچھتی تھیں' مگر وہ کسی کو کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔ ساری باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ دنیا برف کا ڈھیر بن گئی تھی۔ مرمرا کے سمندر پہ تیرتی برف کا ڈھیر۔

"کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟"

"اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اختتام۔۔۔ دی اینڈ!"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایک انوکھا کھیل تماشا میں ہی تھا
دُنیا کے بازار میں سستا میں ہی تھا

میرے سب اقرار غلط ٹھہرے گویا
ہر کردار میں سب سے جھوٹا میں ہی تھا

علم و عمل کے اوزاروں سے لیس تھے سب
تنہا، بے بس اور نہتا میں ہی تھا

میں نے کیا تھا سارے گمانوں کو روشن
پھر جو چادر تان کے سویا، میں ہی تھا

راہ طلب میں اپنا رستہ، اپنی چال
صدیوں سے جو ڈھونڈ رہا تھا، میں ہی تھا

آئینے کو ہاتھ لگا کر دیکھ چکا
وہ سالم تھا اس میں شکستہ میں ہی تھا

خود کو روشن سمجھا تھا لیکن سلمان
باہر جو پھیلا تھا اندھیرا، میں ہی تھا

سلمان صدیقی

دل کسی کا ہے، جاں کسی کی ہے
یہ بھی اک شکل زندگی کی ہے

تم روایت سمجھ رہے ہو جسے
صورتِ حال یہ ابھی کی ہے

لوگ کیوں چھپ گئے خدا جانے
میں نے تو صرف روشنی کی ہے

عاقبت کی تجھے ہے فکر بہت
اور جو زندگی ابھی کی ہے!

کتنی معصوم ہے محبت بھی
جس نے اپنالیا اسی کی ہے

دُشمنی جس نے مجھ سے کی محسن
میں نے اس سے بھی دوستی کی ہے

محسن اسرار

اُن جھاڑیوں کے درمیاں، اِن بستیوں کے درمیاں

زندگی کی کرچیاں
بکھری ہوئی تھیں
خون میں لتھڑی ہوئی، سفاک کانٹوں سے بھری
اُن جھاڑیوں کے درمیاں
زندگی کی کرچیاں
کچھ ہڈیوں کی کرچیاں
اور گوشت کی کچھ دھجیاں
ننھے بچوں کی مہکتی، رس بھری کلکاریاں
بکھری ہوئی تھیں
خون میں لتھڑی ہوئی
سفاک کانٹوں سے بھری
اُن جھاڑیوں کے درمیاں

خواب کی سرسبز دنیا پل میں مٹی ہو گئی
قہقہوں کے سارے منظر سرخ خوں میں جل گئے
خوبصورت آرزوؤں کا دمکتا کارواں
راکھ بن کر بلبلاتی خاک کا حصہ بنا
نرم و نازک عورتوں کی جگمگاتی خواہشیں
نیچے گر کر درندوں کی حریص کا لقمہ بنیں
ایک چادر آنسوؤں کی چار جانب تن گئی
ہو گئے سب قتل امیدوں کی آنکھوں کے دیے

رہ گئے غارت گری کے کالے پنجوں کے نشاں
اُن جھاڑیوں کے درمیاں
خون میں لتھڑی ہوئی، سفاک کانٹوں سے بھری
اُن جھاڑیوں کے درمیاں

ہر طرف ہے پیار کی خوشبو تہ خنجر یہاں
چاہتوں کی آرزو کی کوکھ ہے بنجر یہاں
ان بستیوں کے درمیاں
رنگ و نسل و فرقہ و ماں بولیوں کے نام پر
کتنی ماؤں کے جگر گوشے ہوئے صیدِ سپہر
زہر اُگلے
دار کی صورت کھنچے
دیوار و در کے درمیاں
زندگی کی کرچیاں بکھری ہوئی ہیں
ان بستیوں کے درمیاں

مرگ نامہ کس نے لکھا، دستِ قاتل ہے کہاں؟
اُن جھاڑیوں کے درمیاں
اِن بستیوں کے درمیاں

احفاظ الرحمٰن

اسمگلنگ

ایک پولیس مین نے ٹرک والے کو روکا اور تلاشی لی مگر کچھ نہیں ملا۔ پولیس والے نے پوچھا۔
"میں حیران ہوں۔ تم روزانہ گزرتے ہو اور ٹرک میں کچھ نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے آخر تم کیا کرتے ہو۔"
ٹرک والے نے جواب دیا۔ "اسمگلنگ......"
پولیس والے نے زچ ہو کر پوچھا۔
"مگر مجھے تو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی۔"
ٹرک والے نے پولیس والے کو ایک پرچی دی اور کہا۔
"اسے میرے جانے کے بعد کھولنا۔"
پولیس والے نے اس کے جانے کے بعد پرچی کھولی تو اس میں لکھا تھا۔ "میں ٹرک اسمگل کرتا ہوں۔"

مسرت الطاف احمد، کراچی

نسلی برتری

ایک سفید فام سیاح گھومتا گھامتا ایک ایسے گاؤں میں جا نکلا جہاں تمام تر آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل تھی۔ وہ شراب خانے میں داخل ہوا تو سیاہ فام بارمین نے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا نسلی برتری پر یقین رکھتے ہو؟"
"ہرگز نہیں!" سیاح نے جواب دیا۔
"مگر ہم یقین رکھتے ہیں۔" سیاہ فام بارمین چلایا۔ "یہاں سے فوراً دفعان ہو جاؤ۔"

جیا ممتاز۔ گلستان جوہر

سادگی

کھلاڑی ریس میں دوڑ رہے تھے۔ ریس دیکھتے ہوئے سردار صاحب نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔
"انعام کس کو ملے گا؟"
"سب سے آگے والے کو۔" آدمی نے جواب دیا۔
"تو پھر پیچھے والے کیوں بھاگ رہے ہیں؟" سردار نے حیرت سے پوچھا۔

آمنہ اجالا۔ ڈھرکی

محاورات کا استعمال

سٹی گم ہو جانا۔ سانپ سونگھ جانا۔ پیچ و تاب کھانا۔
ماسٹر جی نے یہ تینوں محاورات تختہ سیاہ پر لکھے اور جماعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام طالب علموں کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ایک کی طرف اشارہ کیا۔ "تم!"
وہ طالب علم گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
ماسٹر صاحب دوبارہ بولے! "ہاں ہاں، تم ہی سے مخاطب ہوں۔ کھڑے ہو جاؤ!"
وہ طالب علم کھڑا ہو گیا۔
"ان محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کرو۔" ماسٹر صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔
طالب علم (چند لمحے سوچنے کے بعد)
"میری سٹی گم ہو گئی ہے، جس کسی کو بھی ملے واپس کر دے۔ نہیں تو اسے سانپ سونگھ جائے گا اور اسے پیچ و تاب کھلائے جائیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔"

تنزیل زہرہ، شہداد پور

ایڈیٹر

ایک اخبار کے مالک نے ایڈیٹر کے منصب کے لیے آئے ہوئے امیدوار سے کہا۔

"یوں تو آپ پڑھے لکھے اور قابل آدمی لگتے ہیں لیکن مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک بے حد ذمہ دار ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کامیابی سے اخبار چلا سکیں گے؟"
"بالکل جناب!" امیدوار نے اعتماد سے کہا۔
"یہاں آنے سے پہلے میں اپنے مالک کی پندرہ لاکھ کی کار چلاتا تھا تو کیا آپ کا پندرہ روپے کا اخبار نہیں چلا سکوں گا۔"

صائمہ عمران۔ سرجان ٹاؤن

غلطی

ایک ماڈرن لڑکے نے اپنی محبوبہ سے کہا۔
"ایسا کرتے ہیں۔ ہم ذہنی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہم نے محسوس کیا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے تو ہم ہنسی خوشی الگ ہو جائیں گے۔"
"یہ تو ٹھیک ہے۔" محبوبہ نے تنک کر کہا۔ "مگر اس غلطی کو پالے گا کون۔ اس کے بارے میں تو بتا دو۔"

فوزیہ ثمرین بٹ، گجرات

سودا

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا کہ "یہ سیکنڈ ہینڈ کار میں نے اپنے پرانے ہارمونیم کے بدلے میں لی ہے۔"
"تعجب ہے۔" "پرانے ہارمونیم کے بدلے میں کار؟" دوست نے شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"ایسا سودا ہوتا تو نہیں ہے۔"
"بات یہ ہے کہ سیکنڈ ہینڈ کار کا ڈیلر میرے پڑوس میں رہتا ہے۔ اس نے خود اس سودے کے لیے کہا تھا۔" دوست نے جواب دیا۔

شہلا اظہر، وہاڑی

مشابہت

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
"تمہیں دیکھ کر مجھے طارق معظم یاد آتا ہے۔"
دوست نے کہا۔ "مگر طارق معظم تو مجھ سے ذرا بھی مشابہت نہیں رکھتا۔"
پہلے دوست نے کہا۔ "کیوں نہیں رکھتا۔ اس نے بھی تمہاری طرح مجھ سے پانچ سو روپے ادھار لیے ہوئے ہیں۔"

ام ہانی، گلفشاں

ایک ہفتہ

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کن لفظوں میں آپ کو اپنی بات سمجھاؤں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی بیوی کے پاس بس یہی ایک ہفتہ ہے۔"
ڈاکٹر نے اپنی مریضہ کے شوہر سے بدقت کہا۔
"یعنی وہ اگلے ہفتے مر جائے گی؟" شوہر نے حیرت سے تصدیق چاہی۔ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"پھر تو میں بھی مر جاؤں گا۔" شوہر نے کہا۔
"وہ کیسے؟" ڈاکٹر حیرانی سے بولا۔
"میرا نازک سا دل اتنی بڑی خوشی کیسے برداشت کرے گا۔" شوہر نے روتے ہوئے کہا۔

مدیحہ احمد، اصفہانی روڈ

حیرت انگیز بچہ

اسکول میں یوم والدین کی ایک تقریب کے دوران ٹیچر نے ایک خاتون کو بتایا۔
"ہم تمام ٹیچرز آپ کے بچے کو حیرت انگیز بچہ کہتے ہیں۔"
خاتون پھولے نہ سمائیں مگر انکساری سے کہنے لگیں۔ "آخر ایسی کیا خوبی ہے میرے بچے میں؟"
"دراصل اسے دیکھ کر ہم سب حیرت سے سوچتے ہیں کہ کیا زندگی میں یہ کبھی کچھ سیکھ سکے گا؟" ٹیچر نے جواب دیا۔

لبنیٰ اسلم، ہجرت کالونی

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"دو آدمیوں کا کھانا تین آدمیوں کو اور تین کا کھانا چار آدمیوں کو کافی ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔
اس میں مکارم اخلاق، ہمدردی اور قناعت کی تعلیم ہے کہ اگر کبھی ہنگامی طور پر ایسی ضرورت پیش آجائے کہ کھانا کم ہو اور کھانے والے افراد زیادہ ہوں تو مذکورہ حساب سے مل جل کر کھا لینا چاہیے۔ اس میں اللہ کی طرف سے برکت ہوگی اور ثواب بھی ملے گا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں،

جسے چار چیزیں مل گئیں، وہ چار چیزوں سے محروم نہیں رہتا۔
1۔ دعا کے بعد حاجت روائی سے۔
2۔ توبہ کے بعد قبولیت سے۔
3۔ استغفار کے بعد مغفرت سے۔
4۔ شکر کے بعد زیادتی نعمت سے۔

تکبر،

ایک دن حضرت سلیمان بن داؤدؑ نے انسانوں، جنوں، پرندوں اور چوپایوں سے کہا۔
"باہر نکلو۔"
دو لاکھ انسان، دو لاکھ جن باہر نکلے اور حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اڑنے لگا اور اتنا بلند ہوگیا کہ آپ نے آسمانوں پر فرشتوں کی تسبیح کی گونج سن لی پھر آپ نیچے کو ہوئے تو آپ کے قدم سمندر کو چھونے لگے۔ آپ نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے۔
"اگر تمہارے پیغمبر کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی تکبر آجاتا تو جتنا انہیں اونچا اڑایا ہے، اس سے زیادہ ہی انہیں نیچے پھینک دیا جاتا۔"

یاددہانی،

حضرت محمد بن واسعؒ نے اپنے بیٹے کو اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو بلا کر فرمایا۔
"کیا تو جانتا ہے تو کون ہے؟ اپنی ماں کے بارے میں سن لے کہ میں نے اسے سو درہم میں خریدا تھا اور تیرا باپ؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے زیادہ نہ پیدا کرے۔!"

اقوال زریں،

- جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ کبھی بدلہ نہیں لیتا۔
- حسد کرنے والا موت سے پہلے مر جاتا ہے۔
- کسی پر اعتماد نہ کرو جب تک اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔
- موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی شفا ہے۔
- خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا کہ غم۔
- سچائی ایک ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر تیز بھی ہے۔
- اذان کے وقت خاموش رہا کرو تاکہ موت کے وقت کلمہ نصیب ہو۔

ندبا ریہ خالد۔ لاہور

سوچیے تو،

- اگر مذہب کو تسلیم میں داخل کر دو تو موت سے پہلے مرنے کی بات سمجھ میں آجائے گی۔
- اگر تیری نسبت باقی کے ساتھ ہوگی تو تو باقی ہو جائے گا۔ اب تیری نسبت فانی کے ساتھ ہے۔ اس لیے تو فانی ہے۔ فنا سے نسبت اٹھا کر بقا میں لگا دے تو سب آسان ہو جائے گا۔
- وہ شخص مر گیا جو کسی کے دل میں نہ رہا۔ آدمی کب مرتا ہے۔ جب دل سے اترتا ہے۔ زندہ کب ہوتا ہے جب دل میں اترتا ہے۔
- مسلمان وہ ہے جو ہندو کی لگا۔ میں مسلمان ہوں۔
- ادب ہی قرآن کا حافظ ہوتا ہے۔ جس نے قرآن کا ادب کیا۔ وہی اس کا حافظ ہے۔ اگر ادب نہ ہو تو قرآن سینے سے صاف ہو جائے گا۔
- پسندیدہ چیز سے جدائی موت ہے۔ جن کی پسندیدہ چیزیں موت سے پرے ہیں ان کو مرنا آسان ہے۔ جن کی پسندیدہ چیزیں یہاں رہ جائیں۔ ان کے لیے موت مشکل ہے۔
- غصہ ایسا شیر ہے جو تمہارے مستقبل کو بکرا بنا کر کھا جاتا ہے۔
- دنیا داروں کے لیے جہاں صبر کا حکم ہے وہاں اللہ کے بندوں کو شکر کرنے کا حکم ہے۔
- زمین کے سفر میں واحد آسمانی شے محبت ہے۔
- پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔
- سب سے بڑی قوت، قوت برداشت ہے۔
- توبہ منظور ہو جائے تو گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔
- سکون یا اطمینان محنت کا نتیجہ نہیں، یہ نصیب کی عطا ہے۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل تحسین۔ گجرات

صبر و تحمل،

ایک شخص کو سرکاری افسر مقرر کیا گیا تو ایک قریبی دوست نے اس سے ملنے کے بعد نصیحت کی۔
"افسر بننے کے بعد ایک بات یاد رکھنا کہ صبر و تحمل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"
اس شخص نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھے گا۔ دوست نے اسے یہ نصیحت تین بار کی۔ جب بھی دوست نصیحت کرتا، وہ کہتا۔
"اچھا میں ایسا ہی کروں گا۔"
مگر جب دوست نے چوتھی بار نصیحت دہرائی تو وہ افسر مشتعل ہوگیا اور بولا۔
"تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ بار بار یہی دہرائے جا رہے ہو۔"
دوست نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
"دیکھا! صبر و تحمل سے کام لینا آسان نہیں ہے۔ ابھی میں نے چند بار ہی ایک بات کہی اور تم غصے میں آگئے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

عقل کی بات،

- برائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ سے نیچے اترنا۔ ایک قدم اٹھاؤ تو باقی اٹھتے چلے جاتے ہیں اور اچھائی کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ پر چڑھنا۔ ہر قدم پچھلے قدم سے زیادہ مشکل، مگر ہر قدم پر بلندی ملتی ہے۔
- رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کرو کیونکہ روزی انسان کو ایسے تلاش کرتی ہے جیسے مرنے والے کو موت...!
- دولت مٹی کی طرح ہے اور مٹی کو پاؤں کے نیچے رہنا چاہیے۔ اگر سر پر چڑھاؤ گے تو قبر بن جائے گی اور قبریں زندہ انسانوں کے لیے نہیں ہوتیں۔
- خوبصورت ہونا اہم نہیں، اہم ہونا خوبصورتی ہے۔ خوبصورت انسان سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جس سے محبت ہو جائے وہ خوبصورت لگنے لگتا ہے۔
- رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے اور اگر احساس نہ ہو تو اپنے بھی اجنبی ہوتے ہیں۔

تحریم۔ گوجرہ

حفصہ بنت المہلب عفرہ کے ہاں گئے۔ وہ ایک سردار کی بیٹی اور گودرز کی بیوی تھی۔ مگر اپنے گھر میں چرخا کات رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم چرخا کات رہی ہو حالانکہ تم گودرز کی بیوی ہو؟"

اس نیک بخت خاتون نے کہا۔

"میں نے اپنے باپ کو اپنے دادا کی زبانی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ عورتوں میں سب سے زیادہ اجر پانے والی وہی ہوں گی جو زیادہ محنت کریں گی۔"

عورت کی رضامندی،

ام ابان بنت عتبہ صحابیہؓ کو چار صحابہ کے پیغام موصول ہوئے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے نام تھے۔ ام ابان نے حضرت طلحہؓ کا پیغام قبول کر لیا اور ان سے شادی ہو گئی۔ امیر المومنین کا پیغام ٹھکرا دیا گیا مگر اس سے نہ کوئی امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوا نہ کسی نے تعجب کیا۔ کیونکہ عورت فیصلہ کرنے میں مکمل آزاد تھی۔ اسلام نے اسے جو حق دیا تھا، اسے کوئی نہ چھین سکتا تھا۔

کیڑے،

جھوٹ، غیبت اور ناشکری ایسے کیڑے ہیں جو رزق کی کشادگی اور گھر کی خوش حالی کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔

نکتہ دریزی،

- جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ بے وقوف ہے۔ وہ دنیا کا سب سے عقل مند آدمی ہے لیکن جو بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بے وقوفی سے لاعلم بھی ہے، وہ دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ (سقراط)
- سچی خوشی جسمانی قوت اور دولت سے میسر نہیں آتی بلکہ اس کا راز سمجھ کی پختگی اور اعلا کردار میں پوشیدہ ہے۔ (ڈیمو کریٹس)

صائمہ جبی۔ کراچی

بدترین انسان،

حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا۔

"بدترین انسان کون سا ہے؟"

انہوں نے فرمایا۔ "جو اس کی پروا نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔"

(اس میں مصلحت یہ ہے کہ جو برائی کو کھلم کھلا ڈھٹائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ برائی پھیلانے کا موجب بنتا ہے اسی لیے اس کو بدترین انسان کہا گیا ہے۔)

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

حجاب،

حجاب محض عورت کا پردے میں چھپ جانا اور سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک اپنے آپ کو ڈھانپ لینا ہی نہیں نہ حجاب یہ ہے کہ عورت کو گھر کے کسی کونے میں بند کر دیا جائے جہاں سے نکلنے کی اسے اجازت ہی نہ ہو بلکہ حجاب یہ ہے کہ عورت باعزت طریقے سے اپنا ستر ڈھانپے۔ باوقار اور سنجیدہ لباس پہنے اور اپنی زینت کو غیر محرموں سے چھپائے۔

آسیہ جاوید۔ کراچی

خلع کا حق،

ثابت بن قیس بن شماس نے جمیلہ بنت ابی سلام سے شادی کی۔ جمیلہ حضرت ثابت کو پسند نہ کرتی تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بخدا ثابت کے دین اور اخلاق میں کوئی نقص نہیں مگر ان کی بدصورتی کی وجہ سے میرا دل ان کی طرف راغب نہیں ہوتا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمیلہ سے حضرت ثابت کا دیا ہوا باغ واپس لے کر حضرت ثابت کے حوالے کر دیا اور دونوں کے درمیان علیحدگی کرا دی۔

عذرا ناصر۔ کراچی

زیادہ اجر کی مستحق،

عبداللہ القرشی روایت کرتے ہیں کہ وہ حجاج کی بیوی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

عمرانہ شاہ ——— کراچی

کیا ہوا حسن ہم سفر ہے یا نہیں
عشق منزل ہی منزل ہے رستہ نہیں
دو پرندے اڑے آنکھ نم ہو گئی
آج سمجھا کہ میں تجھ کو بھولا نہیں

زیب نجم ——— لندن

حالِ دل ان سے کہہ چکے سو بار
اب بھی کہنے کی بات باقی ہے
رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے

شہلا اظہر ——— وہاڑی

وہ موجود ہیں اور ان کی کمی ہے
محبت میں تنہائی دائمی ہے
چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

آج پھر ساون ٹوٹ کے برسا ہے
آج پھر کسی کے لہجے میں نمی ہے
پھر سے دشمنوں کے ہالے میں
آج پھر یادوں کی محفل جمی ہے

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

بہتر ہے زیست کو ہنس کر نبھا دو
محسوس کرو گے تو مسلسل عذاب ہے

ثوبیہ سندھو ——— فیصل آباد

وہ جس قدر بھی منافق تھا پر یہ کہتا تھا
بچھڑنا ہم سے مگر پھر بھی سلسلے رکھنا

صبا افضل بٹ ——— دینالہ خورد

کیا خبر تھی کہ چلے گی کبھی ایسی بھی ہوا وصی
خشک پتوں کی طرح سب دوست بکھر جائیں گے

ثمرہ، اقراء ——— کراچی

ہوا میں اڑتا ہوا رزق پا لیا لیکن
پرندے جرأت پرواز چھوڑ آئے ہیں

شمائلہ عنایت چغتائی ——— لیہ ٹاؤن

وہ چند قرب کے لمحے جو ورد بدر گزرے
محبتوں میں بھی تبدیلیاں کریں شاید
تری گلی سے گزرتے ہیں اور سوچتے ہیں
تری گلی سے گزرنا بھی چھوڑ دیں شاید

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑ پکا

شور بھی ہے سناٹا بھی
دل جیسی ہے دنیا بھی
سب کچھ ایک حقیقت ہے
اور سب کچھ ہے دھوکا بھی

مقدس رباب ——— چکوال

جھلملاتی ہیں مجھے دیکھ کے آنکھیں اس کی
روشنی سی کوئی دیوار کے اس پار ہوئی
جو بھی الجھن تھی وہ مل بیٹھ کے سلجھا لیتے
بات آپس کی تھی جو طعنۂ اغیار ہوئی

آمنہ نظامانی ——— ٹنڈو قیصر

سود و زیاں کا روز حساب کیا جائے
اپنوں میں کب کھلتا ہے ایسا کھاتا
جبر میں ساری بات انا پر آتی ہے
چاہت میں تو جو جی چاہے منواتا

مدیحہ احمد ——— کراچی

یہ واجبات عشق کیا ہم ہی پہ قرض تھے
وہ بھی اتارتا کہ محبت اسے بھی تھی

زوباریہ خالد ——— لاہور

اب تک تو ہمیں معلوم نہیں اس دل کی تمنائیں کیا ہیں
سو بار ہنسا کر دیکھ لیا، سو بار رلا کر دیکھ لیا

نوشین اقبال نوشی ——— گاؤں بدر مرجان

سفر میں عشق کے اک ایسا مرحلہ آیا
وہ ڈھونڈتا تھا مجھے اور کھو گیا تھا میں
مجھے گلہ نہ کسی سنگ کا نہ آہن کا
اسی نے توڑ دیا جس کا آئینہ تھا میں

شمع مسکان ——— جام پور

میرے آنگن کے خنک موسم دھنک ہو جاتے
مگر وہ سورج کہ کسی اور گھر کا نور تھا
یادوں کی بارش میں بھیگی کاغذ کی کشتی
ہجر کا ساگر گہرا اور وصل کنارا دور تھا

ملیحہ طاہر ——— جھیراں

جہاں وہ اتنا بھولا تھا وہاں کچھ یاد بھی رکھتا
فقط اتنا تو کہہ دیتا کہ اس نے مجھ کو چاہا تھا
ہمارا عشق کب کھلتا کسی پر سعد ایسے ہی
یقین مانو کہ ہم نے خود زمانے کو بتایا تھا

صائمہ جبیں ——— کراچی

کون بتائے کون سمجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نین ہمارے ہار گئے
ایک لگن کی بات ہے جیون ایک لگن ہی جیون ہے
پوچھ نہ کیا کھویا، کیا پایا، کیا جیتے، کیا ہار گئے

شہر بانو سیال ——— مظفر گڑھ

محبت میں عجب تو نہیں اجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیران نہ ہو ہوا سو ہوا

عظمیٰ غلام نبی ——— کراچی

بستی میں ہے وہ سناٹا جنگل مات لگے
شام ڈھلے جب گھر پہنچوں تو آدھی رات لگے
خط میں دل کی باتیں لکھنا اچھی بات نہیں
گھر میں کتنے لوگ ہیں جانے کس کے ہاتھ لگے

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

تم ناحق ناراض ہوئے ورنہ مے خانے کا پتہ
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

حنا کنول ——— حویلی لکھا

اس نے کہا مفہوم غلط فہمی کیا ہے
میں نے کہا تم سے امید وفا کرنا

پارس بلوچ ——— ڈھرکی

شل ہوئے ہاتھ تو سوچا ہم نے
لوگ کہتے تھے خدا ہے کوئی

نوال افضل گھمن ——— گجرات

کٹھن سفر ہیں محبتوں کے سراب رستے ہیں سوچ لینا
جو دو ایک قدم پہ ساتھ دینا ہے تو سوچ لینا
نباہ تم سے نہ ہو سکے گا تنگ رہنے کی زیادت کرنا
کہ عشق کے راستوں میں چناب آتے ہیں سوچ لینا

حنا سلیم اعوان ——— آخون باندی

ہم عجیب مسافر دشت تھے چلے تو چلتے چلے گئے
کسی آب جو کی صدا پہ بھی کہیں راستے میں رکے نہیں
کئی اور اہل طلب ملے مجھے راہ شوق میں ہم قدم
جنہیں کر رہا تھا تلاش میں وہی لوگ مجھ کو ملے نہیں

شمع مسکان ——— جام پور

کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

آمنہ اجالا ——— ڈھرکی

سرو و صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں
رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سن
یوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

لبنیٰ اسلم ——— ہجرت کالونی

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

نوشین اقبال نوشی ——— گاؤں بدر مرجان

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا، خواب بھی مر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رکتے ہیں، گزر جاتے ہیں

ثانیہ مشعل ——— حویلی لکھا اوکاڑہ

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

بقیہ دستک

پہنچا دے گا۔ اصل میں تو میں اس کردار کو کرنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔"

"کیوں؟"

"مجھے ایسا لگا تھا کہ یہ ایک نیگیٹو رول ہے اور نیگیٹو رول کرنے والوں سے لوگ محبت نہیں کرتے۔ تو جب میں نے اس تشویش کا اظہار اپنی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر سے کیا تو انہوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ نیگیٹو رول نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی جنونی لڑکی کا کردار ہے جو محبت میں کچھ بھی کر سکتی ہے۔ تب بات سمجھ میں آئی اور میں نے اس کردار کو کرنے کی ہامی بھرلی۔"

"اور یہ پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس رول کا کیا فیڈ بیک ملا تھا آپ کو؟"

"جی بالکل! ایسا فیڈ بیک جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کہیں جاتی تھی تو ایک نظر دیکھنے کے لیے لوگ بے چین ہو جاتے تھے۔"

"فیڈ بیک میں محبتیں زیادہ ملیں یا نفرتیں؟"

"مجھے ایک اموشنل لڑکی دکھایا گیا تھا۔ تو کبھی لوگوں کو مجھ سے محبت ہو جاتی تھی اور کبھی بہت نفرت۔ فیڈ بیک میں ملا جلا رجحان تھا۔ ہاں! مرنے کے بعد لوگوں کو مجھ سے بہت زیادہ ہمدردی ہو گئی تھی اور سب کا یہی کہنا تھا کہ اسے خود کشی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"ہمارے یہاں قدر ہی مرنے کے بعد ہوتی ہے۔ خیر! اگر حقیقت میں یہ سچویشن ہوتی تو؟"

"تو کم سے کم خود کشی تو نہ کرتی۔ جذباتی لڑکی ہوں عام لائف میں۔ مگر اتنی نہیں کہ زندگی کی بازی ہار دوں۔ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ اس کو انجوائے کرنا چاہیے اور اگر اللہ تعالیٰ انجوائے کرنے کے مواقع فراہم کرے تو پھر تو ضرور ضرور انجوائے کرنا چاہیے۔"

"ہم سفر کے بعد تو ڈراموں میں کام کرنے کی آفرز بہت آئی ہوں گی اور آج کل "عینی کی آئے گی بارات" کا کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بہت آفرز آئیں مگر سب قابل قبول نہیں تھیں "عینی کی آئے گی بارات" کا اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ ایک مختلف رول میں ناظرین مجھے پسند کر رہے ہیں۔"

"اداکاری میں کیا بات آپ کو بہت مشکل لگتی ہے؟"

"میری نظر میں اداکاری ایک مشکل فیلڈ ہے اور سب سے مشکل کام ڈائیلاگ کے ساتھ ساتھ چہرے کے تاثرات دینا ہوتا ہے۔ اداکاری عام زندگی سے بہت مختلف ہے۔ یہ اتنی آسان نہیں ہے۔ جتنی ہمیں نظر آتی ہے۔"

"اس مشکل کام کو مستقل جاری رکھنے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔ کم کام کروں گی مگر دیکھ بھال کر اچھا رول کروں گی۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اداکاری سے زیادہ ڈراما رائٹنگ کا شوق ہے۔"

"اچھا۔ گڈ تو کیا کچھ لکھ رہی ہیں آج کل؟"

"بالکل جی۔ ایک اسکرپٹ پہ کام کر رہی ہوں۔ جب مکمل ہو جائے گا تو پھر ان شاء اللہ سب کو بتاؤں گی۔"

"اور کیا کیا شوق ہیں آپ کے؟"

"بہت سارے ہیں۔ لکھنے کا شوق تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ آر جے بھی ہوں ایک ایف ایم میں۔ گلوکاری کا بھی شوق ہے اور ایک میوزک البم پہ کام بھی کر رہی ہوں۔ ماڈلنگ بھی ساتھ ساتھ جاری ہے۔"

"ایف ایم میں کب سے ہیں؟"

"تقریباً" آٹھ نو سال سے ایم ایف کے ایک انگریزی چینل سے وابستہ ہوں۔ بہت مزا آتا ہے ایف ایم میں کام کر کے نئے نئے لوگوں سے ملنے' ان کے انٹرویوز کرنے اور کالرز سے بات کرنے کا۔ اصل میں ریڈیو پہ کام کرنے سے خود اعتمادی بہت آتی ہے۔"

"اور عام زندگی میں کیا مشاغل ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔ گھومنے پھرنے' کھانے پینے کی شوقین ہوں۔ مگر کھانے میں نخرے نہیں دکھاتی۔ بس

اچھا پکا ہوا ہونا چاہیے۔"

"اپنی کوئی اچھی عادت بتائیں؟"

"یہ تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں اپنی عادت کو سمجھتی ہوں تو مجھے اپنے اندر یہ خوبی نظر آتی ہے کہ میں جس کام کو کرنے کی ٹھان لوں تو پھر مکمل کر کے ہی دم لیتی ہوں۔"

لوین وقار سے اور بھی باتیں ہوئیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ان کا تفصیلی انٹرویو دیں گے۔

فضا عابد۔ آر جے ایف ایم 103

"کیسی ہیں فضا؟"

"الحمد اللہ۔"

"آج کل آپ ایف ایم 103 سے وابستہ ہیں۔۔۔ اب تک کتنے چینل میں کام کر چکی ہیں؟"

"میں نے 2005ء میں ایف ایم 103۔ جوائن کیا تھا اور الحمد اللہ آج تک اسی ایف ایم سے وابستہ ہوں۔ یہ میری ان سے وفاداری کا ثبوت ہے۔"

"یہ تو ہے کہ آپ ایک ہی چینل سے وابستہ ہیں ورنہ تو ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں جا رہے ہوتے ہیں آر جے۔"

"میں ذرا مستقل مزاج واقع ہوئی ہوں اور ویسے بھی اس ایف ایم نے ہمیں فری ہینڈ دیا ہوا ہے۔ ہم اپنی مرضی سے پروگرام کرتے ہیں۔ ہم پر کبھی بھی کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوتا کہ آپ نے یہ کرنا ہے' یہ نہیں کرنا ہے۔"

"کیا ریڈیو سننے والوں کی تعداد میں واقعی اضافہ ہو رہا ہے؟"

"جی! بالکل ہو رہا ہے۔ بلکہ بہت زیادہ ہو رہا ہے ۔۔۔ آج کل کی افراتفری کی زندگی میں کسی کو ٹی وی دیکھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے اور مل بھی جائے تو لوڈ شیڈنگ کچھ نہیں دیکھنے دیتی۔ تو اب لوڈ شیڈنگ کے وقت ڈرائیونگ کے وقت اور فارغ وقت میں تفریحی مقامات پر بھی لوگ ریڈیو کی نشریات سے ہی انجوائے کرتے ہیں اور نہ صرف شہری بلکہ گاؤں دیہات کے لوگ بھی ریڈیو ہی زیادہ سنتے ہیں۔"

"کیا ریڈیو آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ کچھ سیکھنا ہے تو ریڈیو بہترین انسٹی ٹیوٹ ہے۔ لیکن آمدنی کے حساب سے یہ اتنا اچھا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ بات میں صرف آر جے کی حد تک کر رہی ہوں۔ ہاں! اگر کوئی ریڈیو میں پوری طرح گھس جائے اور پروگرام کرنے کے علاوہ پروڈکشن میں بھی آجائے تو پھر ریڈیو آمدنی کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔"

"آپ ایک شادی شدہ خاتون ہیں اور خیر سے آپ کی ایک بیٹی بھی ہے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی؟"

"جی! نہ صرف شادی شدہ ہوں' بیٹی کی ماں ہوں' بلکہ ساتھ ساتھ ایم بی اے بھی کر رہی ہوں۔ ساری بات گھر والوں کے تعاون کی ہوتی ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں۔ جہاں میری ساس مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں اور پھر میرے شوہر جن کا اپنا پراپرٹی کا بزنس ہے' انہوں نے بھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی' اس لیے میں اتنی آسانی سے ریڈیو پروگرام کرتی ہوں۔"

"طبیعتاً" کیسی ہیں آپ؟"

"اچھی ہوں۔ خوش مزاج ہوں۔ آپ کو اندازہ ہو رہا ہو گا۔ غصہ آتا ہے' مگر کم آتا ہے۔ لیکن قوت برداشت کی کمی ہے۔"

"دل میں بات رکھتی ہیں یا کر دیتی ہیں؟"

"کرتی نہیں ہوں' دل میں رکھ لیتی ہوں۔ کوئی بات دل کو لگ جائے تو پھر دل سے نکلتی نہیں جاتی۔ بس یہ ہی میری بری عادت ہے یا پھر شاید اچھی۔"

"انسان کے اختیار میں کیا کچھ ہوتا ہے؟"

"انسان کے اختیار میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اگر میں چاہوں کہ میری زندگی اچھی اور اچھی ہو جائے تو ہو جائے گی کیونکہ میں اس کو بہتر بنانے کے لیے محنت کروں گی۔۔۔ تو میرا ایمان ہے کہ انسان کے اختیار میں بہت کچھ ہے۔"

☆

تبسم نشاط

خاص طور پر شبنم کو۔ ان کی پاکستان آمد کے ساتھ ہی ایئرپورٹ پر ان کے پہلے قدم سے لے کر ایئرپورٹ پر ہی واپسی کے لیے اٹھتے ان کے آخری قدم تک پل پل کی رپورٹ دی گئی۔ (شاید کسی کو بھی یاد نہ تھا کہ شبنم نے بنگلہ دیش جانے کے بعد پاکستان کے بارے میں کیا "گل افشانی" کی تھی) اپنے دورے میں شبنم نے زیبا سے بھی ملاقات کی اور محمد علی کی تعزیت کی۔ (بڑی جلدی خیال آگیا تعزیت کا۔۔۔ شاید پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان ٹیلیفونک رابطے منقطع ہیں یا بنگلہ دیش میں جدید مواصلاتی نظام نہیں ہے کہ ساری دنیا میں خبروں کی پلک جھپکتے ترسیل کے دور میں بھی بنگلہ دیش یا صرف شبنم تک پاکستان کی خبریں نہیں پہنچتیں۔)

غلطی

علامہ اقبال نے "جگنو" کے لیے کہا تھا کہ "غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں۔"

گلوکار و اداکار علی ظفر وطن میں اتنے گمنام بھی نہیں' لیکن بھارت جاکر ضرور بے تحاشا چمک گئے ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے وہاں "دادا صاحب پھالکے ایوارڈ" حاصل کیا ہے۔ یہ ایوارڈ بھارت کا سب سے معتبر ایوارڈ سمجھا جاتا ہے۔ علی ظفر پہلے پاکستانی فنکار ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے' مگر جناب! بھارتی عوام میں سے کسی کو علی ظفر کی یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی اور خبر آئی کہ کوئی شخص ہوٹل کی لابی میں کھڑے علی ظفر سے یہ ایوارڈ چھین کر بھاگ گیا۔

لائف ٹائم

گزشتہ دنوں پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے لیجنڈ گلوکار عالمگیر اور ماضی کی معروف اداکارہ شبنم اور موسیقار روبن گھوش کو "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" دیا گیا۔ ان تینوں فنکاروں کو دو علیحدہ تقریبات میں یہ ایوارڈ دیا گیا۔ شبنم اور روبن گھوش کو یہ ایوارڈ وزیر اعظم صاحب نے دیا جبکہ عالمگیر کو معروف ستار نواز استاد رئیس خان نے دیا۔ شاید اس لیے کہ استاد رئیس فن موسیقی میں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ (تو پھر وزیر اعظم۔۔۔؟)

تینوں فنکار اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے میڈیا نے انہیں خاصی کوریج دی۔

(خواص کا پتا نہیں کیونکہ وہ اپنے تاثرات چھپانے میں ماہر ہوتے ہیں۔) ابھی اس خبر کے چرچے صحیح طرح پھیلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس کی تردید آگئی۔ تردیدی بیان کے مطابق علی ظفر سے کوئی ایوارڈ چھین کر نہیں بھاگا' بلکہ انہیں ایوارڈ غلط دے دیا گیا تھا۔ (یہ غالباً" ان کے دل کی بات تھی جو زبان پر بھی آہی گئی۔) لہٰذا علی سے وہ ایوارڈ لے کر انہیں ان کا ایوارڈ دے دیا گیا۔

(آج کل بھارت سے پاکستان کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی غلطیاں ہو رہی ہیں۔ کبھی ایوارڈ غلط دے دیا تو کبھی لاہور میں "مقیم" شہریوں کو بمبئی میں دیکھ لیا۔ ممکن ہے کل کو غلطی سے "راشٹرپتی بھون نئی دہلی" پر سبز ہلالی پرچم بھی لہرا دیں۔)

ناچ تو جانے....

ثانیہ مرزا پاکستان اور بھارت کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتی رہتی ہیں۔ تاہم بھارتی پروگراموں میں ان کی چھب کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ بھارت ان کا "جنم بھومی" ہے' سو وہ وہاں پہنچ کر خوشی سے جھوم جھوم جاتی ہوں گی۔ گزشتہ دنوں بھارتی ٹی وی کے ایک ڈانس شو میں ان کی اس جھومتی جھامتی کیفیت کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا گیا۔ موسیقی کی تال پر ثانیہ کچھ اس مہارت سے جھومیں کہ سلمان خان بھی عش عش کر اٹھے اور کہنے لگے کہ "ثانیہ کو تو بولی ووڈ کی فلموں میں کام کرنا چاہیے۔"

ثانیہ نے اس پروگرام میں شرکت سلمان خان اور فرح خان کی فرمائش ہی پر کی تھی۔ ثانیہ نے جب بھارتی گانے "منی بدنام ہوئی۔" پر تھرکنا شروع کیا تو ان کی ایک انگلی کے اشارے پر شعیب ملک بھی ناچنا شروع ہو گئے۔ (گھر کی پریکٹس ہے آخر!) اور دیکھنے والوں نے سوچا کہ اب شعیب کے لیے کرکٹ کا میدان ٹیڑھا سہی' مگر ناچ تو وہ خوب جانتے ہیں۔ (شادی کے بعد یہ ہی تو کیا ہے بھئی!) ممکن ہے کل کو یہ دونوں آپ کو کسی بھارتی فلم میں ایک ساتھ نظر بھی آجائیں۔

(شعیب غالباً" یہ بھول گئے ہوں گے کہ منی بدنام ہو یا نہ ہو "دمنا" ضرور اپنے دیس میں بدنامی کما رہا ہے کیونکہ فلمی اداکاراؤں کو تو پھر بھی معاف کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان کا فن ٹھہرا' مگر کسی دوسری شخصیت کے لیے یہ سب ہضم کرنا ہمارے قومی مزاج کا حصہ نہیں۔)

تعاون

فنکار جب نیا ہوتا ہے تو اس وقت وہ کام کے پیچھے

بھاگ رہا ہوتا ہے اور شہرت ملنے کے بعد۔۔۔؟

شہرت ملنے کے بعد بھی وہ بھاگ ہی رہا ہوتا ہے۔ بس! اس مرتبہ اس کے آگے "کام" نہیں' بلکہ "پیسہ" ہوتا ہے۔ معروف اداکارہ جویریہ عباسی بھی جب نووارد تھیں تو اس وقت انہیں ایک سین کا کام بھی غنیمت لگتا تھا' مگر یہ شہرت ملنے کے بعد کی بات ہے۔ ایک خاتون ڈراما پروڈکشن میں قدم رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی' تاہم ان کا اسکرپٹ بہت جاندار تھا۔ جویریہ عباسی ان کی پسندیدہ اداکارہ تھیں' سو وہ انہیں کاسٹ کرنا چاہتی تھیں۔ خاتون پروڈیوسر کو امید تھی کہ جاندار اسکرپٹ کی وجہ سے وہ یہ رول کرنے پر تیار ہو جائیں گی۔ انہوں نے جویریہ کو فون کیا تو جویریہ نے بات سنتے ہی پوچھا۔

"بجٹ کتنا ہے؟"

خاتون نے محدود بجٹ اور پھر جاندار اسکرپٹ کے بارے میں بتا کر جویریہ سے تعاون کی درخواست کی' مگر جویریہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ

"اس طرح ہر ایک کو فیور دینے لگی تو میرا کام چل چکا۔"

(شاید اسی لیے کہنہ مشق پروڈیوسرز نئے فنکاروں کو گھاس نہیں ڈالتے کہ ان کے ابتدائی دور میں فنکاروں نے بھی ان کے ساتھ "تعاون" نہیں کیا ہو گا۔)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ دنیا میں ہر چوتھا شخص مسلمان ہے' مجموعی تعداد 1 ارب 57 کروڑ ہو گئی۔ جرمنی میں لبنان سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سب سے زیادہ مسلم آبادی والا ملک انڈونیشیا' پاکستان دوسرے اور بھارت تیسرے نمبر پر ہے۔

(امریکی تھنک ٹینک کی رپورٹ)

☆ مشرقی پاکستان کیسے ہم سے الگ ہوا۔ ہم اس المیہ کو لیاری آپریشن کے آئینہ میں پھر سے دیکھ رہے ہیں۔

(توصیف احمد خان۔۔۔ ایکسپریس نیوز)

☆ ہمارے دیہاتی علاقوں میں جاگیردار اور وڈیرے انتخابی نظام پر کنٹرول حاصل کر کے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرتے ہیں' لیکن اب شہروں میں بھی مافیا کی طرز پر گروہ مضبوط ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی کا سارا انتخابی نظام مافیا کے کنٹرول میں ہے۔

(سلمان عابد)

☆ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ لیاری اور کراچی میں قتل و غارت گری بند کی جائے۔ یہ افسوسناک اور لایعنی مطالبہ پی پی پی' اے این پی اور ایم کیو ایم کی طرف سے شدت سے دہرایا جاتا ہے جبکہ یہ سب اتحادی اور حکومت کا حصہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مطالبہ وہ کس سے کر رہے ہیں؟ کیا آپریشن اور مار دھاڑ نواز شریف اور عمران خان آکر بند کریں گے؟

(ایکسپریس نیوز)

☆

مائیں جنت کے جھروکوں سے

امتہ الصبور

عاتکہ بنت یزید

عاتکہ بنت یزید کا شمارہ دور تابعی کی نام ور خواتین میں ہوتا ہے۔ مورخین نے ان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اپنی چادر بارہ خلفاء کے سامنے نیچی رکھتی تھیں یعنی ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں کیونکہ یہ ان کے محرم تھے۔

عاتکہ بہت سخی تھیں جب عبدالملک کے بیٹے جو عاتکہ سے تھے بڑے ہوگئے تو ان کے شوہر عبدالملک نے کہا "تیرے بیٹے بڑے ہوگئے ہیں اگر تو اپنے مال اور اپنے والد سے ملی ہوئی میراث گواہوں کے سامنے ان کے نام لکھ دے تو یہ ان کے لیے اپنے دوسرے سوتیلے بھائیوں پر فضیلت کا باعث ہوگی۔"

عاتکہ رضامند ہوگئیں۔ روح بن زنباع بزرگ کی حیثیت سے گواہان کے ساتھ آئے۔

عاتکہ نے کہا "اے روح! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اپنے بیٹوں پر غربت آنے سے ڈرتی ہوں۔ میرے بیٹے میرے مال سے بے پروا ہیں' میں تم سب کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں نے سارا مال آل ابی سفیان کے فقراء پر صدقہ کردیا ہے۔ وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔"

روح بن زنباع وہاں سے نکلے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ عبدالملک نے دیکھا تو کہا "میں دیکھ رہا ہوں' جس چہرے کے ساتھ گئے تھے۔ اس سے واپس نہیں آئے' کیا ہوا؟"

روح بن زنباع نے پوری بات بتادی تو عبدالملک غصہ ہوا اور عاتکہ کو دھمکیاں دینے لگا۔

روح نے کہا "امیر المومنین! چھوڑیے۔ خدا کی قسم عاتکہ کے اس فعل میں آپ کے بیٹوں اور آپ کے لیے اس کے مال سے زیادہ اچھائی ہے۔"

یہ سن کر عبدالملک کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔

عاتکہ بنت یزید نے اپنے شوہر عبدالملک کے دل میں بڑی جگہ بنالی تھی اور وہ ان سے بہت محبت کرتے اور ان کو بڑا رتبہ دیتے۔ ان کی رائے کا احترام بھی کرتے۔ کبھی عاتکہ ان سے ناراض ہوجاتیں تو ان کو منانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔

ایک مرتبہ عاتکہ عبدالملک سے ناراض ہوگئیں اور ان تک آنے کا ایک دروازہ تھا' وہ بھی بند کردیا' یہ عبدالملک کو بہت شاق گزرا۔ اس نے اپنے مصاحب عمر بن بلال سے مشورہ کیا۔ اور اس سے مدد چاہی۔

"اس نے کہا میں کوئی تدبیر کرتا ہوں۔" عمر بن

بلال بہت ظریف الطبع شخص تھا' وہ عاتکہ کے دروازے پر آیا اور زور زور سے رونے لگا' رونے کی آواز سن کر عاتکہ کی باندیاں نکلیں اور اس سے پوچھا "تجھے کیا ہوا؟"

اس نے کہا "میرے صرف دو ہی بیٹے ہیں اور ایک بیٹے نے دوسرے بیٹے کو قتل کردیا ہے۔ اب امیر المومنین کہتے ہیں۔ وہ قاتل کو اس کے بدلے میں سزائے موت دیں گے۔ میں نے ان سے کہا "میں ولی ہوں اور میں نے معاف کردیا ہے' مگر وہ کہتے ہیں کہ میں غلط باتوں کا رواج نہیں ڈالنا چاہتا۔ اب میں تمہاری مالکن کے پاس آیا ہوں' وہ خلیفہ سے میری سفارش کردے اور میرے بیٹے کی نجات ہوجائے۔"

باندیاں عاتکہ کے پاس آئیں اور اس کا تذکرہ کیا اور اس کے رونے پیٹنے کا حال سنایا۔

عاتکہ نے کہا "میں کیا کروں' میری اور عبدالملک کی ناراضی ہے اور میں کسی پہ یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔"

باندیوں نے کہا "خدا کی قسم اس وقت تک تو اس کا بیٹا مارا جائے گا مالکن!"

وہ برابر عاتکہ سے کہتی رہیں۔ حتیٰ کہ عاتکہ نے اپنا برقعہ منگوایا اور دروازے سے نکل آئیں۔

عبدالملک نے کہا "خدا کی قسم اگر تو نہ آتی تو میں قاتل کو قتل کردیتا۔ میں غلط روایت قائم نہیں کرنا چاہتا ورنہ ایسے واقعات بہت ہوں گے۔"

عاتکہ نے کہا "آپ کو اللہ کا واسطہ ہے امیر المومنین! یہ عمر میرے دروازے پر معافی طلب کرنے آیا تھا۔"

وہ برابر رحم طلب کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ عبدالملک کے پاؤں پکڑ کر چوم لیے تو عبدالملک نے کہا۔

"تمہارا مطالبہ میں نے مان لیا ہے" اور اس طرح آپس میں بھی رضامند ہوگئے۔

عبدالملک نے اپنا وعدہ پورا کیا اور عمر بن بلال کو انعام واکرام سے نوازا۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مینگو آئس کریم

اجزا :

آم	ڈیڑھ کلو
انڈے کی زردیاں	2عدد
کنڈنسڈ ملک	تین چوتھائی کپ
دودھ	3کپ
مینگو ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
کریم	2کپ

ترکیب :

دودھ خوب پکا کر گاڑھا کرلیں، پھر اس میں زردیاں ڈال کر کسٹرڈ کی طرح پکالیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ آم کی گٹھلیاں اور چھلکے نکال کر کسٹرڈ اور کنڈینسڈ ملک کے ساتھ بلینڈر میں ڈال کر یکجان کرلیں۔ اب اس آمیزے کو کسی پیالے میں نکال کر ٹھنڈی کریم کے ساتھ خوب پھینٹیں اور ایک گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد نکال کر ایسنس کے ساتھ دوبارہ پھینٹیں اور ایئر ٹائٹ باکس یا برتن میں ڈال کر جمنے کے لیے رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد مزے دار مینگو آئس کریم تیار ہوگی۔

بادامی مرغی

اجزا :

چکن	1عدد
دہی	2کپ
سفید سرکہ	4کھانے کے چمچے
سیاہ مرچ	1چائے کا چمچہ
بادام	20عدد
بالائی	آدھا کپ
ہری مرچیں	10عدد
پیاز	2عدد
ادرک	1انچ کا ٹکڑا

نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کو دھو کر اس میں سرکہ، نمک، دہی، سیاہ مرچ، بادام اور بالائی ملا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پیاز سنہری کرکے نکال لیں۔ اسی تیل میں چکن کا مسالا ڈال دیں۔ تلی ہوئی پیاز اور ہری مرچیں بھی پیس کر اس میں ڈال دیں اور بغیر ڈھکے پکنے دیں۔ اس کا پانی خشک ہو جائے تو ادرک کش کرکے ڈال دیں اور پانچ منٹ تک بھونیں۔ روغن نکل آئے تو چولہا بند کردیں۔

بگھارے بینگن

اجزا :

بینگن (گول والے)	آدھا کلو
پیاز	1عدد
ادرک	2انچ کا ٹکڑا
لہسن کے جوے	6عدد
ثابت لال مرچیں	8عدد
خشخاش	1چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسا کھوپرا	2کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا	4چائے کے چمچے
سفید زیرہ	2چائے کے چمچے
تل	2چائے کے چمچے
مونگ پھلی	2چائے کے چمچے
املی	4کھانے کے چمچے
ہری مرچیں	6عدد
کڑھی پتے	چند پتے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ثابت دھنیا، زیرہ اور پیاز توے پر سینک کر نمک کے ساتھ ملا کر بینگن میں بھریں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پتیلی میں تیل گرم کرکے لہسن، ادرک کے ساتھ ثابت مرچ پیس کر ڈالیں اور تین منٹ تک بھونیں پھر ہلدی، خشخاش، کھوپرا، تل اور مونگ پھلی پیس کر شامل کردیں۔ تھوڑا سا بھون کر بینگن ڈال کر احتیاط سے تلیں۔ اب املی کا پانی ڈالیں اور ڈھکن بند کرکے ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ بینگن گل جائیں تو ہری مرچ کتر کر اور کڑھی پتے ڈال کر دم پر لگادیں۔ روغن اوپر آجائے تو سمجھ جائیں بگھارے بینگن تیار ہیں گرم گرم سرو کریں۔

عربین سلاد

اجزا :

ابلے سفید چنے	آدھا کپ
نوڈلز	آدھا کپ
ٹماٹر	1عدد
مایونیز	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
چینی	حسب ضرورت
ہری مرچیں	2عدد
انناس	2سلائس
سلاد پتا	حسب ضرورت
سیاہ مرچ	1چائے کا چمچہ
زیتون کا تیل	1چائے کا چمچہ

ترکیب :

دہی اور مایونیز کو پیالے میں ڈال کر مکس کرکے اس میں سفید چنے، نوڈلز، ٹماٹر، چینی، ہری مرچیں اور انناس ڈال کر مکس کریں۔ آخر میں سلاد پتا، سیاہ مرچ اور زیتون کا تیل ڈالیں۔ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

ادارہ

خوبصورتی کے لیے

موسم گرما کی آمد کے ساتھ ہی جلد کی تازگی شادابی رخصت ہوجاتی ہے۔ ایسے میں جلد کی بیرونی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اندرونی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اندرونی حفاظت کے لیے خوراک میں صحت بخش غذائی اجزا شامل کرنے چاہئیں۔

تربوز موسم گرما کا خاص پھل ہے۔ یہ جسم کو گرمی کی شدّت سے بچاتا ہے۔ اس میں موجود پانی کی مناسب مقدار جسم میں پانی کی کمی دور کرتی ہے۔ لہٰذا گرمیوں میں اس کا باقاعدہ استعمال جلد کو شاداب کرتا ہے۔

☆ جب موسم گرما کی شدّت اپنے عروج پر ہو یا لُو چل رہی ہو تو ایسے میں تربوز کا استعمال فوری طور پر پیاس بجھانے کا باعث ہے۔ پسینہ بہنے سے جسم میں موجود نمکیات بھی ضائع ہوجاتے ہیں۔ تربوز انہیں بھی فوری بحال کرتا ہے۔

☆ تربوز کھانے سے آنتوں کی خشکی دور ہوتی ہے۔ نیز یہ گردوں کے لیے بھی مفید ہے۔

☆ یرقان میں تربوز کا استعمال بے حد فائدہ مند ہے۔ یہ جسم میں اس بیماری کے دوران بڑھنے والے صفرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔

☆ بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) کے مریضوں کو دن میں تین سے چار مرتبہ تربوز استعمال کرنا چاہیے۔

☆ تربوز کے بیج دھو کر دھوپ میں سکھالیں۔ چھلکوں سمیت کوٹ کر رات کو ایک پیالی پانی میں بھگودیں۔ صبح پانی چھان کر پی لیں۔ یہ بلند فشار خون کا بہترین علاج ہے۔

☆ شدید گرمی کے باعث گھبراہٹ محسوس ہو تو تربوز کا شربت بنائیں۔ اس میں تھوڑا سا عرق گلاب بھی شامل کر کے پی لیں۔ مفرح قلب ہے۔

☆ گرمیوں میں ہونے والی خشک کھانسی میں تربوز استعمال کیا جائے تو کھانسی سے نجات مل جاتی ہے۔

☆ تربوز کا گودا اور عرق چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ لگا رہنے دیں، پھر سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ چہرے کی جلد چمک اٹھے گی۔

☆ تربوز کا عرق یا گودا، تھوڑا سا عرق گلاب اور آدھا چمچہ شہد ملا کر چہرے پر لگائیں۔ بیس سے پچیس منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ یہ عمل جلد کو نمی فراہم کر کے جھرّیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔

☆